یادوں کے چراغ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

حصہ اول

مرتبین

محمود حسن حسنی ندوی - محمد مستقیم محتشم ندوی (بھٹکلی)

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیہ، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

باراول

۱۴۳۳ھ - ۲۰۱۲ء

نام کتاب	:	یادوں کے چراغ
نام مصنف	:	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
صفحات	:	۴۷۲
تعداد اشاعت	:	۱۰۰۰

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیہ، لکھنؤ

ندوہ روڈ، ٹیگور مارگ، لکھنؤ-۲۰

فہرست مضامین

یادوں کے چراغ حصہ اول

مضامین	سنہ وفات	صفحہ
عرض ناشر		۹
مقدمہ پروفیسر وصی احمد صدیقی مرحوم		۱۱
پیش لفظ از مصنف		۱۹
(۱) مشائخ عظام		۲۱
(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ	۵/ دسمبر ۱۹۵۷ء	۲۲
(۲) حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ	۱۶/ اگست ۱۹۶۲ء	۲۹
(۳) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ	۲۴/ مئی ۱۹۸۲ء	۳۴
(۴) حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ	۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۱ء	۳۹
(۵) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ	۵/ جنوری ۱۹۹۴ء	۴۲
(۶) حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ	۱۰/ جون ۱۹۹۵ء	۴۷
(۷) حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ	۲۸/ اگست ۱۹۹۷ء	۵۲
(۸) حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ	۲۷/ اپریل ۱۹۹۹ء	۵۶
(۹) حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ	۱۸/ مئی ۲۰۰۵ء	۵۹
(۱۰) حضرت شاہ نفیس الحسینیؒ لاہوریؒ	۵/ فروری ۲۰۰۸ء	۶۴
(۱۱) حضرت قاری امیر حسن مظاہریؒ	۲۴ر فروری ۲۰۱۲ء	۷۱

(۲) مفکرین وقائدین ملت		۷۵
(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۲۲ر ستمبر ۱۹۷۹ء	۷۶
(۲) قاضی عدیل عباسیؒ	۲۲/ فروری ۱۹۸۰ء	۸۰
(۳) مولانا منت اللہ رحمانیؒ	۲۰/ مارچ ۱۹۹۱ء	۸۳
(۴) مولانا شاہ ابوالسعودؒ	۲۶/ فروری ۱۹۹۶ء	۸۷
(۵) مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ	۴/ اپریل ۲۰۰۲ء	۹۰
(۶) الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھؒ	۲۷/ اپریل ۲۰۰۵ء	۹۴
(۷) مولانا سید اسعد مدنیؒ	۶/ فروری ۲۰۰۶ء	۹۷
(۳) علمائے کبار		۱۰۲
(۱) مولانا عبدالباری ندویؒ	۳۰/ جنوری ۱۹۷۶ء	۱۰۳
(۲) مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ	۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء	۱۰۹
(۳) علامہ عبدالفتاح ابوغدہ حلبیؒ	۱۶/ فروری ۱۹۹۷ء	۱۱۲
(۴) مولانا محمد منظور نعمانیؒ	۴/ مئی ۱۹۹۷ء	۱۱۷
(۵) مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندویؒ	۲۴ر فروری ۱۹۹۸ء	۱۳۲
(۶) مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ	۱۲/ اگست ۱۹۹۹ء	۱۲۵
(۷) شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ المیدانیؒ	۱۲/ اگست ۲۰۰۴ء	۱۲۹
(۴) چند عظیم داعی، مبلغ دین		۱۳۲
(۱) مولانا عبیداللہ بلیاویؒ	۱۵ر فروری ۱۹۸۹ء	۱۳۳
(۲) حافظ عبدالرشید رائے پوریؒ	۲۵ر جنوری ۱۹۹۶ء	۱۳۹
(۳) مولانا محمد عمر پالنپوریؒ	۲۲ر مئی ۱۹۹۷ء	۱۴۲

سربراہانِ مملکت		۱۴۷
(۱) شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعودؒ	۱۳؍جون ۱۹۸۲ء	۱۴۸
(۲) صدر جنرل ضیاء الحق شہیدؒ	۱۷؍اگست ۱۹۸۶ء	۱۵۱
(۳) شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعودؒ	یکم اگست ۲۰۰۵ء	۱۵۳
(۴) سردار فاروق احمد خان لغاریؒ	۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۰ء	۱۵۶
(۴) ادبا و مصنفین اور صحافی		۱۵۹
(۱) ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشاؒ	۱۸/ جولائی ۱۹۸۶ء	۱۶۰
(۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ	۱۸/نومبر ۱۹۸۷ء	۱۶۲
(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ	۵/ دسمبر ۱۹۹۷ء	۱۶۶
(۴) میر مقصود علی خاں بنگلوریؒ	۳۰؍اگست ۱۹۹۹ء	۱۷۱
(۵) مولانا سید وصی مظہر ندویؒ	۲/جنوری ۲۰۰۶ء	۱۷۳
(۶) مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	۲؍فروری ۲۰۰۸ء	۱۷۸
(۷) ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ	۲۶/ستمبر ۲۰۱۰ء	۱۸۱
(۵) چند اساتذہ		۱۸۳
(۱) مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ	۲۴/اگست ۱۹۷۹ء	۱۸۴
(۲) ماسٹر محمد سمیع صدیقیؒ	۱۹/اکتوبر ۱۹۸۲ء	۱۹۰
(۳) مولانا سید نور الحسنؒ	یکم اگست ۱۹۸۴ء	۱۹۴
(۴) مولانا عمران خانؒ	۱۸/اکتوبر ۱۹۸۶ء	۱۹۸
(۵) مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ	۲۲/اکتوبر ۱۹۹۵ء	۲۰۲
(۶) مولانا محمد ناظم ندویؒ	۹/ جون ۲۰۰۰ء	۲۰۶

(۶) رفقاء ومعاصرین		۲۱۰
(۱) مولانا عبدالماجد ندویؒ	۱۹/اپریل ۱۹۸۵ء	۲۱۱
(۲) مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ	۱۸/نومبر ۱۹۸۸ء	۲۱۷
(۳) مشیرالحق بحری آبادیؒ	۱۰/اپریل ۱۹۹۰ء	۲۲۲
(۴) ڈاکٹر ارشد حسین ندویؒ	۲/جولائی ۱۹۹۰ء	۲۲۵
(۵) ڈاکٹر مولانا سید حبیب الحق ندویؒ	۶/فروری ۱۹۹۸ء	۲۲۸
(۶) مولانا معین اللہ ندویؒ	۲۳/اگست ۱۹۹۹ء	۲۳۱
(۷) مولانا شہباز اصلاحیؒ	۹/نومبر ۲۰۰۲ء	۲۳۵
(۸) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ	۲۶/اگست ۲۰۰۳ء	۲۳۸
(۹) پروفیسر عبدالحلیم ندوی گورکھپوریؒ	۱۰/اکتوبر ۲۰۰۵ء	۲۴۳
(۱۰) مولانا عبداللہ عباس ندویؒ	یکم جنوری ۲۰۰۶ء	۲۴۶
(۱۱) مولانا مجیب اللہ ندویؒ	۱۲مئی ۲۰۰۶ء	۲۵۲
(۱۲) مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوریؒ	۲۸/جولائی ۲۰۰۷ء	۲۵۷
(۱۳) مولانا عبدالکریم پاریکھؒ	۱۱/ستمبر ۲۰۰۷ء	۲۶۰
(۱۴) مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ	۲۰/اپریل ۲۰۱۰ء	۲۶۴
(۷) چند باکمال خوردسال		۲۶۷
(۱) مولانا اسحاق جلیس ندویؒ	۸/جولائی ۱۹۷۹ء	۲۶۸
(۲) مولانا عبدالنور (نور عظیم) ندویؒ	۳۱/جنوری ۱۹۹۳ء	۲۷۳
(۳) مولانا محمد رضوان ندویؒ	۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء	۲۸۰
(۴) مولانا ابوالبرکات فاروقیؒ	۱۷/نومبر ۱۹۹۹ء	۲۸۴

(۵) ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندویؒ	۷/جنوری ۲۰۰۱ء	۲۸۹
(۶) پروفیسر ڈاکٹر محمد یونس نگرامیؒ	۴/مارچ ۲۰۰۱ء	۲۹۲
(۷) مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ	۲۴/جون ۲۰۰۲ء	۲۹۷
(۸) پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ	۲۰/جنوری ۲۰۰۳ء	۳۰۲
(۹) مولانا محمد رضوان قاسمیؒ	۱۱/اکتوبر ۲۰۰۴ء	۳۰۷
(۱۰) مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ	۹/جون ۲۰۰۶ء	۳۱۰
(۱۱) مولانا ناصر علی ندویؒ	یکم جون ۲۰۰۷ء	۳۱۵
(۱۲) مولانا ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندویؒ	۲۰/جون ۲۰۰۸ء	۳۱۹
(۸) چند مخلص اہل تعلق اور خادمین دین وملت		۳۲۳
(۱) مولانا سلمان ندویؒ	۲۳/نومبر ۱۹۸۹ء	۳۲۴
(۲) فضیلۃ الشیخ عبداللہ العزامؒ	۲۴/نومبر ۱۹۸۹ء	۳۲۶
(۳) مولانا محب اللہ لاری ندوی ایم اے علیگؒ	۲۹/نومبر ۱۹۹۳ء	۳۲۸
(۴) مولانا سید مرتضیٰ صاحب مظاہریؒ	۲/نومبر ۱۹۹۵ء	۳۳۲
(۵) مولانا محمد عبدالسمیع ندویؒ	۲۸/دسمبر ۱۹۹۵ء	۳۳۷
(۶) مولانا نعمان خان ندوی بھوپالیؒ	۸/مئی ۱۹۹۸ء	۳۴۲
(۷) حکیم افہام اللہ انہونویؒ	۶/اگست ۱۹۹۸ء	۳۴۶
(۸) ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاںؒ	۹دسمبر ۲۰۰۴ء	۳۵۰
(۹) مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ	۲۴ستمبر ۲۰۱۱ء	۳۵۴
(۹) اہل خاندان اور عزیز واقارب		۳۵۸
(۱) مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ	۶/مئی ۱۹۵۸ء	۳۵۹

(۲) مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ	۷/مئی ۱۹۶۱ء	۳۶۳
(۳) والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ	۱۲/اگست ۱۹۷۵ء	۳۸۰
(۴) محترمہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بیؒ)	۲۸/جنوری ۱۹۷۶ء	۳۸۷
(۵) برادر عزیز محمد میاںؒ	۱۳/جون ۱۹۷۹ء	۳۹۲
(۶) برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۱۶/فروری ۱۹۸۲ء	۴۰۱
(۷) ممانی صاحبہ	۱۵/دسمبر ۱۹۸۹ء	
(اہلیہ محترمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی)		۴۰۶
(۸) سیدہ حمیرا بی	۱۱/جون ۱۹۹۴ء	۴۰۸
(۹) سیدہ رقیہ بیؒ	۸/فروری ۱۹۹۶ء	۴۱۱
(۱۰) والدہ ماجدہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ	۱۳/فروری ۱۹۹۶ء	۴۱۴
(۱۱) سیدہ فاطمہ بیؒ	۱۱/نومبر ۱۹۹۸ء	۴۲۱
(۱۲) حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندویؒ	۳۱/دسمبر ۱۹۹۹ء	۴۲۵
(۱۳) مولانا قاری رشید الحسن حسینیؒ	۲۸/جنوری ۲۰۰۱ء	۴۳۸
(۱۴) مولانا سید محمد طاہر منصور پوریؒ	۲۴/دسمبر ۲۰۰۱ء	۴۴۲
(۱۵) مولانا سید ابوبکر حسنیؒ	۱۴/دسمبر ۲۰۰۲ء	۴۴۸
(۱۶) سیدہ امامہؒ	۱۹/ستمبر ۲۰۰۵ء	۴۵۵
(۱۷) مولانا سید اسحاق حسینیؒ	۹/فروری ۲۰۰۶ء	۴۵۹
(۱۸) سید حسین حسنیؒ	۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۹ھ	۴۶۴
(۱۹) مولانا سید محمد عامر ہنسویؒ	۱۹/جون ۲۰۰۸ء	۴۶۶
(۲۰) مولوی سید محمد سالم ہنسویؒ	۱۲/اگست ۲۰۰۸ء	۴۶۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ اما بعد۔

خاکہ نگاری اردو ادب کی ایک مقبول صنف ہے، ہر شخص دلچسپی کے ہاتھوں اسے لیتا ہے اور بنظر شوق اس کا مطالعہ کرتا ہے، ادب کی یہ صنف اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ریسرچ اسکالرس، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات میں اس صنف ادب کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لینے لگے ہیں۔

اس میں خاکہ نگار ان شخصیات سے متعلق بے تکلف اپنے تأثرات کا اظہار کرتا ہے، جن سے اسے زندگی کے کسی مرحلے میں کسی طرح کا کوئی تعلق رہا ہو، اس لئے کوئی یہ توقع رکھے کہ ان خاکوں سے اس شخصیت کے سارے خدوخال اس کے سامنے آجائیں عموماً ایسا نہیں ہوتا، ہاں البتہ اس شخصیت کی کچھ جھلکیاں اس کو نظر آتی ہیں اور اس کو سمجھنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔

خاکہ نگار اکثر مخلص ہوتا ہے، اس لئے اس شخصیت کے کچھ عیوب بھی اس سے جھلکنے لگیں تو یہ خاکہ نگار کے لئے ہرگز عیب نہیں بلکہ عین فن کی بات سمجھی جاتی ہے نہ اس شخصیت کے اس کمزور پہلو سے قاری کا متفق ہونا ضروری ہے نہ خاکہ نگار کا یہ مقصود ہوتا ہے یہ تو اس کا شخصی تأثر ہوتا ہے، خاکوں کو اسی نظر سے دیکھنا چاہئے اور اسی حیثیت سے پڑھنا چاہئے۔

ہمارے خاکہ نگار متعدد حیثیتوں سے ہندوستان کی سب سے معزز و معظم شخصیت کے مالک ہیں، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ندوۃ العلماء جیسے عالمی ادارے کے ناظم اعلیٰ ہیں اور رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں مسلمانان برصغیر کی طرف سے نمائندگی

کرتے ہیں ان کی صفات اور خصوصیات اگر جانا چاہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے بامروت، باصفا، سراپا اخلاص، سراپا اخلاق بزرگ ہیں اور حکیم مربی، باکمال معلم اور عظیم مصنف ہیں اور ان کی تحریر کی بڑی یہ خوبی یہ ہے کہ وہ اعتدال اور توازن کو پوری طرح برقرار رکھتے ہیں، اور ذرا بھی مطالعے سے کام نہیں لیتے۔

ہم کس قدر خوش قسمت اور لائق سعادت ہیں کہ ان کے لکھے ہوئے خاکوں کے مجموعے ''یادوں کے چراغ'' کی اشاعت ہمارے حصے میں آرہی ہے، ہم اپنے لئے اس کو بڑی سعادت اور بڑے شرف کی بات سمجھتے ہیں، امید ہے کہ قارئین کے لئے یہ دلچسپ ہی نہیں ہونگے بلکہ ان کے لئے مشعل راہ ثابت ہونگے، قارئین کو مولانا محمود حسن حسنی ندوی کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی کوششوں سے یہ حسین مجموعہ مرتب ہوکر قارئین کے ہاتھوں پہنچ سکا اور عزیز گرامی مولوی محمد مستقیم محتشم ندوی رفیق مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کا انہیں تعاون حاصل رہا، وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں، بڑی ناسپاسی ہوگی کہ اگر اس موقع پر مولوی محمد کلام الدین ندوی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کتاب کو طباعت کے لائق بنانے میں انہوں نے پورا ساتھ دیا اور اس کے لئے اپنا بڑا وقت قربان کیا اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

ناشر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

پروفیسر وصی احمد صدیقی

اردو ادب میں خاکہ نگاری پر ابھی بہت کم کام ہوا ہے اور یہ صنف دوسرے اصناف سخن کے معاملہ میں کافی پیچھے ہے۔ خاکہ نگاری بھی ایک تخلیقی کام ہے۔ یہ چھوٹے پیمانہ پر سوانح نگاری نہیں ہے؟ کیونکہ خاکہ نگار اپنے احساسات کو الفاظ کی شکل دیتا ہے اور اپنی پسندیدہ محبوب شخصیتوں کو جو زندگی کی سرحد پار کر چکے ہیں زندہ اور متحرک سامنے لاتا ہے ان کی شخصیت کے خدوخال کو، واضح کرتا ہے، ان کی ادائے دلفریبی سے، محظوظ ہوتا ہے اور اپنے بیان سے دوسروں کو محظوظ کرتا ہے، اور ان کے کارناموں کی جھلک دکھاتا ہے، لفظ کارنامہ سے میری مراد انقلابی کارنامے نہیں بلکہ ان لوگوں کے کام جو خاکہ نگار کے دل میں بسے ہوں۔ یہ ان کے پسندیدہ ادیب بھی ہو سکتے ہیں، علماء اور دانشور بھی، شاعر بھی اور وہ لوگ بھی جن سے خاکہ نگار کا تعلق گھریلو ہو۔ جن کی محبت اور نیکیاں خود اس کے اور اس کے اہل خانہ کے لیے رہیں ہوں اور باہر کی دنیا سے ان کا تعلق سرسری ہو۔ یہ خاکہ نگار کا ہنر ہوگا اگر وہ اپنی تحریر سے دوسروں کے دلوں میں جذباتی زیر و بم پیدا کر دے اور اپنے ارد گرد ایسوں کو ڈھونڈھنے لگے جن کا بیان اس نے پڑھا ہے۔ یہاں خاکہ نگار کے دل کی گدازی اس کے انشاء کے ہنر سے مل جاتی ہے اور جو باتیں اس کے دل سے اٹھتی ہیں پڑھنے والوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ آدمی بھول جاتا ہے کہ یہ لوگ اب آسودۂ خواب ہیں۔

خاکہ نگاری کا وصف یہی ہے کہ دل کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور خاکہ نگار اپنے بیان کردہ لوگوں کے خارجی زندگی کے سوا داخلی زندگی میں بھی داخل ہو جائے۔ خاکے ایسے کھینچے کہ مرے ہوؤں کا شمار زندوں میں ہونے لگے۔ یہ حضرات پھر اس دنیا میں آجائیں مگر ایسی دنیا جو سکون سے لبریز ہو اور جہاں ان پر عقیدت کے پھول برسائے

جارہے ہوں۔اس گل افشانی میں سب شریک ہوں مگر لکھنے والے کے پھول زیادہ حسین اور نازک ہوں۔یہ آنکھوں کی تراوٹ میں زیادہ اضافہ کررہے ہوں اوران کی مہک زیادہ بھینی اورمشامِ جان کوراحت بخشنے والی ہو۔حافظ شیرازی کا بڑا پیارا شعر ہے۔

در محفل ما عطر ماموز کہ مارا
ہر لحظہ زگیسوئے توخوشبوئے مشام است

جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ خاکہ نگاری پر زیادہ کام نہیں ہوا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر لکھنے والے کی بس کی بات نہیں۔یادیارِمہرباں توسب کے دل میں ہوتی ہے مگر کاغذ کے صفحے پر کیسے اتاری جاتی ہے اس کے لیے بڑے ظرف اور بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔آپ نگاہ ڈالیں تواس میدان کے سوار بہت کم ملیں گے۔آپ کومولوی عبدالحق اپنے چند ہم عصر کے ساتھ نظر آئیں گے۔رشید احمد صدیقی اپنے گنج ہائے گراں مایہ کے ساتھ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی اپنے بغل میں دبائے ہوئے ہوں گے۔چراغ حسن حسرت مردم دیدہ کے ساتھ اور عبدالمجید یارانِ کہن کے ساتھ ملیں گے۔ان سب نے اپنا مقام انھی کتابوں سے بنایا ہے۔مولوی عبدالحق بے شک اردو کے بڑے مجاہد تھے مگران کا نام صرف تاریخ اردو کے صفحات پر رہ جاتا اگر یہ کتاب نہ لکھتے۔ رشید صاحب کا سارا طنز ومزاح ایک طرف اور گنج ہائے گراں مایہ ایک طرف اور فرحت اللہ بیگ نے تو اپنے اسی مضمون سے حیات جاوید پائی ہے۔

خاکہ نگاری شوکت تھانوی نے بھی کی ہے۔ایک زمانہ میں ان کے شیش محل نے شہرت پائی تھی لیکن زندہ لوگوں کے کام پر نہیں بلکہ ذات پر مضمون لکھنا بدذوقی کی بات ہے۔ عیش نیز بگو کی گنجائش نہیں اور ہنر کا ذکر مداحی ہے۔شاید اسی لیے یہ کتاب کسی صاحب ذوق کی الماری میں جگہ نہیں پاسکی۔

کچھ اور بھی ہیں جنھوں نے اس صنف ادب میں قدم رکھا اور شہرت پائی،ان میں علامہ سید سلیمان ندوی کی یادرفتگان اوران کے معاصر مولانا عبدالماجد دریابادی کی کی وفیات

ماجدی جس کا دوسرا نام نثری مرثیے ہے اور مولانا ماہرالقادری کی یادرفتگان اسی طرح سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی بزم رفتگان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا دریابادی نے زندوں پر الگ سے معاصرین بھی لکھی، ان سب کتابوں نے اردو ادب میں نمایاں جگہ پائی۔ گوان خاکہ نگاروں نے دینی اور ملی شخصیات کو زیادہ جگہ دی معاصر ادیبوں میں خواجہ احمد فاروقی کی یار مہرباں بھی قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے سب سے آخری خاکہ نگار حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کی سیریز پرانے چراغ اردو ادب میں جو مقام رکھتی ہے اس سے سب اہل نظر واقف ہیں۔ سارے ممدوح ان کے دل میں بسے ہیں اور ان کے ذکر میں صرف آمد ہی آمد ہے۔ صرف سچی باتیں ہیں۔ ہر ایک کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور روشن تصویریں بنائیں۔

یہ وصف، یہ ہنر، یہ سعادت ان کے بھانجے کو بدرجہ اتم ملی۔ مولانا رابع صاحب نے بھی بقول امیر خسرو صورت گر نقاش چین کو مات کیا اور وہ صورتیں بنائیں جنھوں نے آنکھوں کو ایک نرم اور ٹھنڈی روشنی سے بھر دیا۔ وادی خموشاں کے مکینوں کو ایک ایک کر کے سامنے لاتے چلے گئے ان کا تعارف کرایا۔ ان کی خوبیاں بیاں کیں اور پھر کتاب بند کرنے کے ساتھ یہ لوگ اپنی مبارک آرا گاہوں میں لوٹ گئے۔

مولانا کی ذات میں انشاء کی صفت وہی ہے۔ یہ خدائے بخشندہ بخشی ہوئی ہے۔ یہ سعادت بزور بازو نہیں

جناب مولانا رابع صاحب نے جن مرحومین کے خاکے لکھے ہیں ان میں ہر ایک کا پس منظر مذہب اسلام ہے۔ دین داری ان کا طرۂ امتیاز ہے اور اس کے فیض سے وہ لوگ بھی بہرہ مند ہوئے ہیں جو اپنے عقیدہ کے لحاظ سے اچھے مسلمان ہیں لیکن مذہبی علم کم رکھتے ہیں۔ یہ حضرات ان کے سامنے ایک آئیڈیل کی طرح آئے ہیں اور ان کا پیغام یہ رہا ہے کہ دیکھو کار دنیا کار دین سے مختلف نہیں اپنے کار منصبی کو صحیح طور پر انجام دیتے ہوئے تم دینی کام کر رہے ہو۔ ان حضرات کے تقویٰ، پرہیز گاری عبادت گزاری کا مولانا نے زیادہ ذکر نہیں

کیا ہے کیونکہ وہ تو ان کی ذات سے وابستہ ہے۔ مولانا نے ان کی ذات میں جو سوز و ساز پایا ہے بس اس کا بیان ہے۔

میں کتاب کے مندرجات پر آتا ہوں۔ سب سے پہلے میں ان محترم خواتین کا ذکر کروں گا جن کا مولانا نے بے حد عقیدت سے ذکر کیا ہے۔ یہ ان کے بے مثل دیندار کنبہ کی خواتین ہیں جو بہترین بیٹیاں، بہترین بہنیں اور بہترین مائیں تھیں۔ ماؤں کے سلسلے میں تو میں اقبال کا مصرعہ لکھوں گا ''مادراں اُسوۂ کامل بتول'' یہ خواتین آسیہ گرداں تو نہ ہوں گی مگر ان کے لب قرآن سرا تھے۔ اپنے خاندان کے عالی مرتبت مردوں کی طرح یہ بھی علم کی دولت سے آراستہ تھیں یہ خواتین محترم سیدہ امتہ اللہ تسنیم، سیدہ حمیرا، سیدہ امتہ العزیز سیدہ طیب النساء اہلیہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور سیدہ فاطمہ بی اور خود تذکرہ نگار کی رفیقۂ حیات ہیں۔

محترم امتہ اللہ تسنیم کی ستودہ صفات شخصیت کو جو مولانا حکیم عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی تھیں ان خواتین میں اولیت حاصل ہے لیکن دینداری، عبارت گزاری اور مہمان نوازی سب میں قدر مشترک ہے مگر یہ روز محشر اپنے جد عالی یعنی اپنے رسول (ﷺ) کو ریاض الصالحین کا ترجمہ نذرانہ کے طور پر پیش کر سکتی ہیں۔ یہ سب کے لیے بہترین زادِ سفر ہے۔ اس سفر کے لیے جس کی منزل آخر فنا ہے۔ سیدہ امتہ العزیز تو خود خاکہ نگار کی والدۂ محترمہ ہیں، آخر میں ان کو اپنی بھتیجی سیدہ امامہ پر بھی قلم اٹھانا پڑا یہ ان کے لیے یقیناً دشوار گزار منزل تھی کہ جن کو گودوں کھلایا تھا ان کو خود اپنے ہاتھوں سپرد خاک کر رہے ہیں۔

کتاب میں مذکور علمائے کرام کا یکے بعد دیگرے ذکر کرنا اور ان کی صفات کو جو مولانا نے بتائے ہیں اور اجاگر کرنا اس حقیر مقدمہ نگار کی بڑی خواہش ہے مگر اس بحر بیکراں کے لیے تو سفینہ چاہئے میں اپنی چھوٹی کشتی پر سوار کیسے اسے عبور کر سکتا ہوں۔ ان بے مثال عالموں کو اپنے بیان کے لیے میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جن سے مولانا کی قرابت رہی ہے۔ دوسرے وہ جن سے طالب علمی میں ہم عصری کا رشتہ رہا ہے یا

استادی شاگردی کا تعلق رہا ہے اور تیسرے وہ جو ندوہ کے نہیں لیکن ندوہ کی باہر کی دنیا میں سے ہیں پہلے طبقہ میں جناب مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور جناب مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست ہیں۔ زباں پر بار خدایا یہ کن کا نام آیا۔ ان کا ذکر مولانا کے قلم سے اور مبارک ہوجاتا ہے کیونکہ مولانا محرم راز دورن میخانہ ہیں۔ یہ حضرات مولانا کے ماموں تھے۔ ان کی مہربانیاں، ان کی صلہ رحمی، ان کا حسن سلوک، ان کا علم وفضل گوسب پر ہویدا ہے مگر مولانا کے تحریر غالب کے مصرعہ کی یاد دلاتی ہے ع

''ذکر اس پری وش کا اور بیاں اپنا''

ان بزرگان دین کے لیے پری وش لفظ کا استعمال سلیقہ مند لوگوں کے ابرو کے خم کا باعث ہوسکتا ہے مگر میرے محبوب شاعر تو امیر خسرو ہیں جنھوں نے سرکار دوعالم کے لیے پری پیکر، نگار، سروقد اور لالہ رخسار کے الفاظ استعمال کئے ہیں جن کو کسی محفل سماع میں سن کر بڑے صاحب دل صوفیا پر وجد طاری ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بیان میں گھریلو پن بدرجہ اتم موجود ہے جس سے ان کی شخصیت اور زیادہ محبوب لگنے لگتی ہے حضرت مولانا علی میاں کے لیے بہت کچھ لکھا گیا۔ بہت کچھ لکھا جارہا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا نہ معلوم علمی سوسائیٹیاں، اکاڈیمیز، کتب خانے اور تعلیمی ادارے ان کے نام کو سرنامہ بناتے ہیں اور علمی اور مذہبی دنیا میں وقار پارہے ہیں۔ ان کا ذکر اگر کروں گا تو عطار بگو یہ والی بات ہوگی۔ مشک تو مہک رہا ہے۔

اس فہرست میں مولانا ابوبکر صاحب حسنی، مولانا محمد طاہر حسینی صاحب، مولانا محمد ثانی حسنی صاحب اور مولانا محمد میاں مرحوم آتے ہیں۔ آخری دو حضرات تو شعلہ مستعجلہ رہے۔ ایک کا دوسری کتابوں کے ساتھ ندوہ کا ترانہ اور دوسرے کے اداریے اور مقالے یادگار رہیں گے۔ مولانا طاہر صاحب سے تو میرا دفتر نظامت نے بہت تعلق پیدا کردیا تھا اور مجھے عزیز رکھتے تھے۔ مولانا ابوبکر حسنی کی عالم بے بدل ہونے کے ساتھ خوش مزاجی ان کو ہردل عزیز بنائے ہوئی تھی۔ یہ لوگ تحریر لکھتے وقت نظروں کے سامنے آگئے۔ اللہ تعالیٰ سب کو

عالی درجات سے نوازے۔ شعلہ مستعجلہ کے طور پر مولانا محمد میاں مرحوم اور مولانا محمد ثانی حسنی صاحب کا ذکر کیا تھا، مولوی اسحاق حسینی مرحوم نے بھی ساتھ چھوڑ دیا وہ بھی جواں سال ہی کہے جائیں جائیں گے، تھے بڑی خوبیوں کے تعلیمی مشغولیتوں کے ساتھ دعوتی وتحریکی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

اب وہ چراغ سامنے آتے ہیں جو بیرون خانہ تھے "بیاباں کے شبِ تاریک میں قندیل رہبانی" یہ سب لوگ ندوہ کے فرزند تھے جیسے مولانا عمران خاں صاحب، مولانا محمد اسحٰق صاحب، مولانا عبدالسمیع صاحب، مولانا ارشد حسین صاحب، مولانا ابو العرفان صاحب، مولانا معین اللہ صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا شفیق الرحمٰن صاحب، مولانا سید لقمان اعظمی صاحب، مولانا سید ضیاء الحسن صاحب، پروفیسر محمد یونس نگرامی صاحب، مولانا محمد ناظم صاحب، مولانا مشیر الحق صاحب۔ ان میں کچھ ندوہ کے استادرہے اور ندوہ میں مہتمم بھی کچھ باہر کی دنیا میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے لیکن ندوہ کے شجر سے پیوستہ رہے اور ان کی ذات سے ندوہ میں بہار رہی۔ اس حقیر مقدمہ نگار کو ان میں سے ہر ایک سے واقفیت رہی ہے اور سب کی توجہ اور مہربانیوں سے مستفید رہا ہے۔ اس کی وجہ صرف والد محترم تھے جو ان کے استاد تھے اور میں استاد زادہ۔ مصنف کتاب نے جو صفات ان حضرات کی لکھی ہے وہ بلا مبالغہ ہے اور بقول غالب

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

اللہ تعالیٰ ان سب کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور مولانا کو اپنی کتاب میں ان کی یادیں جمع کرنے کا اجر دے۔ ان سب احباب ندوہ کا ذکر کر چکا تھا کہ ان میں جن سے زیادہ قرب وہ انس رہا وہ بھی داغ مفارقت دے گئے یعنی محبّ محترم مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی ان کی خوبیٔ قسمت پر ہم سب کو ناز ہے۔ مکہ مکرمہ کا مقدس قبرستان جنت المعلی ان کی آخری آرام گاہ بنا۔ یہ خاکہ نگار کے بھی محبّ ومحبوب تھے ان کا ذکر بھی خوب کیا ہے۔

ملی رہنماؤں میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید اسعد مدنی، مولانا قاضی مجاہد

الاسلام قاسمی اور امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کا حال پڑھ کر ان سے محبت وعقیدت میں اضافہ ہی ہوگا۔حکماء واطباء میں حکیم افہام اللہ صاحب کا تذکرہ ہے۔امراء وسلاطین میں مملکت سعودی عرب کے فرماں روا شاہ خالد وشاہ فہد کا ذکر یادحرم کا باعث بنتا ہے۔شاہ فہد نے اشاعت قرآن اور توسیع حرم کا جو عظیم اور لازوال کارنامہ انجام دیا وہ زندہ جاوید رہے گا۔اور اس سے ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔اور شہید حق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق ایک مرد مؤمن اور مرد حق کا تذکرہ ہے۔

اب ان حضرات کا ذکر کروں گا جنھوں نے عصری تعلیم حاصل کی۔یہ لوگ اپنی اپنی جگہ بہت اونچی چوٹیوں پر لہرائے لیکن ندوہ کو قیس عاری کی طرح نجد سمجھا اور نجد اور اہل نجد کو ہمیشہ سلام بھیجتے رہے۔یہ حضرات ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر ابرار مصطفےٰ اور پروفیسر خلیق نظامی ہیں۔حضرت مولانا علی میاں کے عاشق اور جاں نثار۔سب اپنے پروردگار کے پاس پہنچ گئے۔

کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے بے بسی کے عالم میں تعلیم حاصل کی بچپن میں ایمان لائے لیکن بڑے ہوکر اونچا علمی وادبی مقام پیدا کیا جیسے ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی اور ڈاکٹر سلمان ندوی۔

عجم کے ساتھ کچھ عرب بھی ہیں وہ عرب علماء ودانشور جنھوں نے عجم کو گلے لگایا،عجم کی قربانیوں کا اعتراف کیا ان کی فصاحت بیانی کے قائل ہوئے یہ ہیں شیخ عبدالرحمٰن رافت الباشا،استاد عبداللہ عزام اس طرح اور بھی بعض حضرات ہیں۔

سب سے آخری اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے مولانا کی کتاب سے میں نے بزرگان دین کا تذکرہ نکالا ہے تاکہ اس مقدمہ کا اختتام بابرکت ہو یہ وہ حضرات تھے جن کی عظمت کے آگے سب نے سر تسلیم خم کیا ہے۔علم اور افادیت کی شعاعیں ان کی ذات والا صفات سے نکل کر ملت کو مستفید کررہی تھیں۔یہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت شیخ زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا محمد احمد پرتاب

گڑھی، حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی ، حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوری، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی اور محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقی ہیں۔ان کی وفات ملت کے لیے بڑا خسارہ رہی یہ لوگ انفاس مطمئنہ تھے جن کو اللہ نے اپنے مخصوص بندوں میں شمار کیا اور اپنی جنت میں داخل ہونے کے لیے فرمایا۔ داعیوں اور مبلغین دین میں مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا عمر پالنپوری کے نام نمایاں ہیں۔ بڑے علماء اور مصنفین میں ایک اہم نام مولانا محمد منظور نعمانی کا ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جنھیں اللہ نے قبول فرمایا اور ان کے فیض کو عام کیا۔

مولانا کی کتاب میں بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جن کا ذکر اس مقدمہ میں نہیں لیکن یہ لوگ بھی اتنے ہی قابل ذکر اور قابل قدر ہیں۔اللہ تعالیٰ سب کو اعلیٰ درجات سے نوازے۔

مولانا رابع صاحب نے میرے والد مرحوم جناب محمد سمیع صدیقی کا ذکر بڑی محبت اور عقیدت سے کیا ہے۔مولانا نے شاگردی کا حق ادا کیا ہے گو میں فرزندی کا حق نہیں ادا کرسکا۔بس یہ شعر پڑھوں گا جو بہت پرانا ہونے کے باوجود مجھ پر اور میرے بھائیوں پر صادق ہے۔

روح پدرم شاد کہ فرمود زاستاد
فرزند مراعاشق بہار موز دگر پیہم

مولانا رابع صاحب کا قلم رواں ہے۔بہترین کتابیں تصنیف کی ہیں اور کرتے رہیں گے۔ایک سے ایک اعلیٰ کتاب سامنے آئے گی لوگ پڑھیں گے، بزرگوں کو یاد کریں گے، اسلامی تاریخ پر نظر ڈالیں گے، ایمان تازہ کریں گے اور مولانا کو دعا دیں گے اب میر کے شعر پر مقدمہ ختم کرتا ہوں۔

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
کہ جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

وصی احمد صدیقی
ندوہ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم النبیین سیدنامحمد بن عبداللّٰہ الصادق الأمین وعلیٰ آلہ الطیبین الطاھرین وأصحابہ الغرالمیامین وعلیٰ من تبعھم ودعابدعوتہ الیٰ یوم الدین اما بعد!۔

پیش نظر کتاب ''یادوں کے چراغ'' میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جوان شخصیتوں ،احباب اوراہل خاندان سے متعلق ہیں جن سے میرا تعلق رہااوروہ ان کے انتقال پر بعد میں کسی مناسبت سے تحریر کئے گئے اور ذاتی تأثرات مشاہدات وواقعات اور معلومات کے تناظر میں لکھے گئے یہ سوشخصیتیں ہیں۔

اس پر مقدمہ ہمارے کرم فرما پروفیسر وصی احمد صدیقی مرحوم نے لکھا تھا پروفیسر صاحب کا مقدمہ کتاب کی حیثیت کو بڑھاتا ہے لیکن افسوس ورنج کی بات یہ ہوئی کہ کتاب کی طباعت میں تاخیر ہوئی اوران کا وقت آخرآپہونچا اورانہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا میں ان کے تذکرہ کا بھی اضافہ کرتا لیکن اور شخصیتیں بھی ہیں جواس کے دوسرے حصے میں لائی جائیں گی ان کے ساتھ پروفیسر صاحب کا بھی تذکرہ ہوگا۔

پروفیسر وصی احمد صدیقی مرحوم اگر چہ سائنس کے شعبے کی ممتاز شخصیت تھے اور اسی موضوع میں شاہجہاں پور کے اسلامیہ کالج میں ان کی خدمات رہیں اوروہ ترقی کر کے وہاں پرنسپل بھی ہوئے لیکن ادب کا انہوں نے بڑا اچھا ذوق پایا تھا،وہ ذوق ان کی تحریروں میں بھی جھلکتا تھا، ان کے والد جناب محمد سمیع صدیقی مرحوم اور ماموں جناب رشید احمد صدیقی مرحوم دونوں ہی علم وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے،ان سے پروفیسر صاحب نے خاصا اکتساب فیض کیا،اسی کے ساتھ ساتھ وہ بڑی اچھی طبیعت کے اور دوست انسان تھے، خاص طور پر جن سے ان کا رابطہ قائم ہوجاتا تھا تو ان سے ان کے تعلقات بڑے لحاظ ومحبت کے ہوتے تھے،ان کے والد میرے استاد

رہے تھے اوران کا قیام ندوے ہی سے ملے ہوئے ایک قطعہ زمین میں واقع ذاتی مکان میں تھا اس کا اثر یہ پڑا کہ ان کو بچپن ہی سے ندوے اور ندوے والوں سے ربط حاصل ہوا وہ تقریباً میرے ہم عمر تھے اور ندوے سے ان کو ذمہ دارانہ نسبت بھی حاصل ہوگئی تھی اس سے مزید ان سے اچھا ربط قائم ہوا ان سے بڑے دل خوش کن ملاقاتیں ہوتی تھیں اور پیش نظر کتاب کے علاوہ اور بھی میری کتابوں پر انہوں نے ازراہ عنایت مقدمہ تحریر فرمایا اور بعض کتابوں پر اپنا دلی تأثر تحریری شکل میں ظاہر کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے قرب میں جگہ عطا فرمائے اور اپنی مغفرت ورحمت سے نوازے۔

کتاب کا نام ''یادوں کے چراغ'' تجویز ہوا جس کو نام وموضوع کے لحاظ سے پرانے چراغ سے مناسبت ہے کہ وہ بھی وفیاتی مضامین کا مجموعہ ہے جو خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی اہم تصنیفات میں سے ہے، میرے یہ مضامین دنیا سے رخصت ہونے والی شخصیات سے متعلق ہیں جو ''تعمیر حیات'' ''رضوان'' وغیرہ میں شائع ہوئے، ان مضامین کو عزیزان محمود حسن حسنی ندوی (دارعرفات رائے بریلی) اور مولوی مستقیم محتشم ندوی بھٹکلی (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ) نے مرتب کیا اور عنوان کے لحاظ سے عزیزی مولوی سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے تقسیم کیا اور اب اس کو مکتبۃ الشباب العلمیۃ لکھنؤ سے عزیزی مولوی سید ہاشم ندوی بھٹکلی شائع کررہے ہیں، عزیزان مولوی فیصل احمد ندوی بھٹکلی استاد دارالعلوم ندوہ العلماء ومولوی محمد کلام الدین ندوی (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ) نے طباعت کے مرحلے میں خصوصی تعاون دیا۔

میں ان سب عزیزوں کا شکر گزار ہوں کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ورنہ مجھے یہ خیال ہوتا کہ اپنے تأثرات وگذارشات کو جو کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے ان کو میں خود پیش کرتا، گویا کہ اپنے کو نمایاں کرنے کی جرأت کرتا، بہرحال ان حضرات کا یہ عمل ان کے حسن ظن کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ ان کو خوب جزائے خیر دے اور اس میں افادیت پیدا فرمادے۔

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی
جمعہ ۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۱) مشائخ عظام

(۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
(۲) حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ
(۳) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
(۴) حضرت مولانا محمد احمد پھولپوریؒ
(۵) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ
(۶) حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ
(۷) حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ
(۸) حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ
(۹) حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ
(۱۰) حضرت شاہ نفیس الحسینی لاہوریؒ
(۱۱) حضرت قاری امیر حسن مظاہریؒ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی برصغیر ہندو پاک کی گذشتہ صدی کی عظیم شخصیات میں ممتاز مقام کی حیثیت رکھنے والی چند عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے، امت اسلامیہ ہندیہ کی انھوں نے جو عظیم ملی خدمت انجام دی وہ اسلامی ہند کی تاریخ میں سنہرا باب سمجھی جائے گی، انھوں نے آزادی ہند کو ملت اسلامیہ کی آزادی اور سربلندی سمجھتے ہوئے اپنی دانشمندانہ مہارت سے سب کو فائدہ پہونچایا اس طرح ملک کو جو صدیوں اسلامی قیادت میں رہا تھا اور مغربی استعمار نے اس کو مسلمانوں سے چھین کر غلام بنایا تھا آزادی دلانے میں نمایاں حصہ لیا، حضرت مولانا کی اس حیثیت سے بڑی شہرت ہوئی اور سب اس کے معترف ہیں لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تنہا یہی اہم خصوصیت نہیں تھی بلکہ باطنی سیرت وسلوک وتربیت میں بھی ان کا بڑا مقام رہا۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اگر جنگ آزادی میں ان کی ہندو اکثریت کے ساتھ تعاون اور جدوجہد کے پس منظر سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو وہ برصغیر کے عظیم عالم دین اور مرشد رہے، وہ کے تزکیہ باطن اور تربیت اہل دین کی صفت کی وجہ سے سب اہل دین کے نزدیک مستند اور تسلیم شدہ تھے بلکہ دیگر علماء ومرشدین ان کو دیگر علماء مرشدین پر بھی بڑی حد تک فوقیت دیتے تھے اور اس میدان میں ان کی فکرمندی اور سرپرستی سے ہزاروں مسترشدین نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خاص طور پر مشرقی ہندوستان کے آسام کے علاقہ میں انہی کے ارشاد وتزکیہ کا اصل چرچا تھا، اور دارالعلوم دیوبند جو علوم دینیہ کی تعلیم کا ایشیا کا بڑا اور معتبر ترین ادارہ ہے وہاں شیخ الحدیث ہونے کے تعلق سے ان کا فن حدیث کی تعلیم میں بڑا پایہ سمجھا جاتا تھا اور ان کی شاگردی فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔

حضرت مولانا ہندوستان میں مقیم سادات خاندان کے ایک اہم ترین فرد تھے، وہ

یوپی کے ضلع فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ کے رہنے والے تھے اور اپنی علمی وعملی عمر کے آغاز میں مدینہ منورہ میں علوم دینیہ کی تعلیم سے اشتغال رکھتے رہے، اور پھر اپنے شیخ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور استاذ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے استفادہ ورفاقت کے لیے ہندوستان آگئے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں حدیث کے استاذ اور صدر مدرس کی حیثیت سے خدمت علم دین بھی کرنے لگے اور غیر ملکی طاقتوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں بھی اپنے مرشد وشیخ کی رہنمائی میں حصہ لیا اور اس سلسلے میں بار بار جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور برطانوی سامراج کی زیادتیاں جھیلنے سے سابقہ پڑا لیکن ان کا پایہ ثبات اس مجاہدہ وخدمت دین وملت وآزادی وطن کی کوشش کی راہ سے نہیں ہٹ سکا، بالآخر برطانوی سامراج نے ملک کو آزادی دی لیکن ہندو مسلم ٹکراؤ اور کشت وخون اور ملک کو دو ٹکڑے کر دینے کے ساتھ ملک کو چھوڑا، ہندوستان کا وسطی حصہ جو بڑے رقبہ پر مشتمل تھا، اور جہاں مسلمانوں کے اہم دینی مراکز اور خاصی آبادی بھی تھی. لیکن اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس کو غیر مسلم علاقہ قرار دیا گیا اور نقل آبادی کی مصیبت نے ملک کے دونوں ٹکڑوں کے درمیان تباہی کا سلسلہ قائم کر دیا، یہ سلسلہ ہندوستانی خطہ کے مسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا، ہندوستان کے بڑے غیر معمولی اور سخت حالات کا دور وہ دور کہا جاسکتا ہے کہ جب جنگ عظیم جو ۱۹۳۸ء سے شروع ہوئی تھی، اس کے نتیجے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو اثر ڈالنے کا موقع ملا اور برطانوی استعمار کی طرف سے ملک کو رعایتیں دینے کا آغاز ہوا، ملک میں مسلمانوں کے حالات زیادہ قابل فکر تھے، کیوں کہ ایک طرف تو انگریزوں کی تعلیم وتہذیب نے مسلمانوں کے شرفاء کو مرعوب کر رکھا تھا، اور اس کے نتیجہ میں متوسط اور اعلیٰ طبقہ کے مسلمان انگریزی تہذیب وتعلیم کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، دوسری طرف آزادی کی تحریک کے سلسلے میں مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے، ایک حصہ جو برطانوی اثر وغلبہ سے متاثر اور مرعوب تھا، اس نے اپنا اصل حریف ہندوؤں کو سمجھا تھا اور برطانوی غلبہ کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا، یہ

رنگ اور رجحان سارے جدید تعلیم والے طبقے میں تھا، اور دوسرا گروہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے کی فکر رکھنے والا تھا، اور اس میں علماء دین عام طور پر سربراہی کر رہے تھے، ادھر برطانوی اقتدار کا رویہ وقتی طور پر مسلمانوں کو زیادہ موقع دینے کا نہیں تھا، اور وہ شاید مسلمانوں کو اپنا اصل حریف تصور کرتے تھے، لیکن مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی برطانوی تہذیب وتعلیم کے معاملہ میں نرم رویہ، ظاہر میں ایسے مسلمانوں کی ہمدردی کا تھا، اس طریقہ سے علماء اور اہل دین کو دوطرف سے ٹکراؤ کی صورت حال سے گزرنا پڑ رہا تھا، ایک تو انگریزی غلبہ وسطوت کے مقابلہ میں اور دوسرے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مقابلے میں۔

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو تناؤ تھا اس میں ایک طرف مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے ہندو اکثریت سے علاحدہ رویہ اختیار کرنے کی تحریک تھی، جو علماء دین کی ہندو اکثریت کے ساتھ مل کر آزادی کی کوشش کرنے کو مطعون کر رہا تھا، پھر اسی کے ساتھ ساتھ عامۃ المسلمین میں جو بے حسی اور دین کے تقاضوں سے غفلت پیدا ہوگئی تھی، اس کے ازالہ کی فکر علماء کو کرنی تھی، ایسی حالت میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی اور ایک ملک کے دو ملک ہندوستان اور پاکستان بن گئے، اور اقتدار کی تقسیم کے موقع پر ہندو مسلم کشمکش کو بہت قوی بنا دیا، اور کشت وخون کا ایک بازار گرم ہوگیا، جس کا رخ پاکستان سے ہندوؤں کے انخلا اور ہندوستان سے مسلمانوں کے انخلا کی طرف پورے طریقے سے ہوگیا، ہمارے علمائے کرام کے اصل مراکز اور ان کی کوششوں کا میدان سب سے زیادہ ہندوستانی حصے میں تھا، اس لحاظ سے ان کے لیے مشکلات بھی بہت پیش آرہی تھیں، اور ان کی ذمہ داری بھی بہت بڑھی ہوئی تھی، اس وقت مغربی یوپی کا یہ علاقہ جو مظفر نگر اور سہارن پور پر مشتمل ہے اور دہلی کے اطراف کی حیثیت رکھتا ہے دینی تعلیم اور دینی کوششوں کا بڑا اور بنیادی مرکز تھا اور وہاں کے شیوخ پر سب کی نظریں تھیں، خصوصیت سے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند اور

حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارن پور اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری جو رائے پور کے مرکز تزکیہ واحسان کے سربراہ تھے، خصوصی اہمیت اور اثر پذیری کے حامل تھے۔ ان میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اپنی بڑی سیاسی اہمیت بھی رکھتے تھے اور ان کی قائدانہ ومجاہدانہ خصوصیت کی بنا پر حکومت بھی انہیں اہمیت دیتی تھی، اور یہ حضرات بھی ان کی رائے اور مشورہ کو اہمیت دیتے تھے، ان حضرات نے اس وقت کے سنگین حالات اور نہایت پیچیدہ اور خطرناک اور اندیشہ ناک صورت حال کے تدارک کے لیے غیر معمولی توجہ کا ثبوت دیا۔ اور مغربی ہندوستان کے علاقے یکے بعد دیگرے مسلمانوں سے خالی ہوتے جارہے تھے، اس سلسلے کو سہارن پور جو کہ یوپی کا مغربی سرحدی ضلع ہے کو ایک طریقہ سے دیوار بنادیا، کہ مسلمانوں کا تخلیہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے، اس کے لیے حکومت وقت پر جو زور ڈال سکتے تھے اور مسلمانوں کو جو پرزور طریقے سے متوجہ کرسکتے تھے، اس کی پوری کوشش کی اور ان حضرات کے اثرات اور لوگوں پر ان کی بات کی اہمیت ایسی تھی کہ ان کی توجہ دہانی کو لوگوں نے مانا اور وہ سلسلۂ قتل وانخلا رک گیا۔ اور اس طریقہ سے مغربی یوپی سے ہندوستان کے تمام مشرقی حصوں میں مسلمانوں کے باقی رہنے کی صورت پیدا ہوگئی، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا، جسے ہندوستانی تاریخ میں بھلایا نہیں جاسکتا، اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بقاء کے لیے ان علماء کی اکثریت کا جنھوں نے جنگ آزادی کے لیے ہندو مسلم مشترک جدوجہد میں نمایاں بلکہ اولین اور بڑا حصہ لیا تھا، ان کا اخلاقی دباؤ بھی اثر انداز ہوا اور انھوں نے ببانگ دہل اکثریت سے مطالبہ کیا کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کی طرف سے نمایاں شرکت کے بعد حصول آزادی کے ثمرات سے مسلمانوں کو کیسے محروم کیا جاسکتا ہے، اور پاکستانی حصہ میں ان کے نہ منتقل ہونے کو کس طرح جرم قرار دیا جاسکتا ہے، وہ سب جنگ آزادی میں ہندوؤں کے ساتھ نمایاں طریقہ سے شریک تھے، اور ان کے ساتھ مشترک ہندوستان کے حامی تھے، تو ہندوستان کو دونوں کے اشتراک سے

کیسے الگ رکھا جاسکتا ہے اور الحمدللہ ان لوگوں کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کے بقاء کو اور وطنی طور پر برابری کو تقسیم کیا گیا، اس کے نتیجہ میں بار بار فرقہ پرستوں کی طرف سے اس اشتراک اور برابری کی پرتشدد مخالفت سے مسلمان اس ملک میں نہ صرف یہ کہ باقی رہے بلکہ باعزت طریقہ سے شریک وطن ہیں۔ اس میں ہمارے ان مجاہد علماء جن کے سرخیل شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ہی تھے۔ اور ان کے ساتھ ان کے رفقاء جنگ آزادی میں خاص طور پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی کا نام ہی نمایاں ہے۔

حضرت مولانا کی شہرت اور ان کی عظمت کا عمومی اعتراف ہونے کے باوجود مولانا میں تواضع اور زہد اور خدمت خلق کی بھی بڑی نمایاں صفت تھی، اور انھوں نے دین اور آزادی امت کی راہ میں بڑے مجاہدے کئے تھے، تحریک آزادی اور تزکیۂ باطن دونوں میں ان کے شیخ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی تھے، مولانا نے ان کی حیات میں ان کی پوری وفاداری کے ساتھ ان کی راہ پر چلنے پر پوری وفاشعاری کا ثبوت دیا تھا اور پھر ان کے طریقہ کو بعد میں جاری رکھا اور جس اخلاص کے ساتھ انھوں نے دین اور فلاح امت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی اس کا اعتراف ان کے سب واقف کار کرتے رہے۔ اور ان سے مل کر اور ان کو دیکھ کر ان کی اعلیٰ دینی صفات کا اظہار ہوتا تھا اور ان میں ایک کشش معلوم ہوتی تھی۔ ملت کے لیے ان کی قربانیوں اور دین کے لیے ان کے مجاہدوں کا سب نتیجہ معلوم دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کی برکت اس ملک میں تادیر قائم رکھے۔

حضرت مولانا کی بڑی خصوصیت اتباع سنت کی تھی وہ زندگی کے سارے پہلوؤں میں سنت کی پوری پیروی کرنے کی پابندی کرتے تھے، لوگوں سے معاملات میں خانگی زندگی میں مہمانوں کی خاطر تواضع میں اور حق بات کے لیے متحرک ہوجانے اور سینہ سپر ہوجانے میں اور اپنے کو مادی فوائد سے بے نیازی اختیار کرنے میں بڑے ممتاز

نظر آتے تھے، انھوں نے آزادی کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور تکلیفیں اٹھائیں، لیکن آزادی کے بعد آزادی کے ثمرات سے کچھ بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی آزادی کی کوششوں کے اعزاز میں حکومت نے ان کو جو صلہ دینا چاہا اس سے بھی انھوں نے معذرت کر دی اور آزادی کے ثمرات سے کچھ بھی لینا گوارہ نہیں کیا اور تعلیم حدیث اور تزکیہ وتربیت کے اپنے کاموں کے لیے اپنے کو منقطع کر لیا۔ طہارت باطنی میں ان کا جو امتیاز تھا، ان سے ملنے والا غیر شعوری طور پر محسوس کرتا تھا اور ان کے علم اور ان کے ارشاد سے فائدہ اٹھانا عزت وشرف اور فخر کی بات سمجھی جاتی تھی جو ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مسترشدین اور ان کے تلامذہ کی زبانوں سے برابر ظاہر ہوتا رہا، حضرت مولانا اپنے سیاسی یا ملی کاموں کے مختلف شہروں میں جو دورے کرتے ان میں اس بات کی احتیاط رکھتے کہ پاکیزہ آمدنی والے اپنے اہل تعلق ہی کے یہاں ٹھہریں، ان میں لکھنؤ آمد کے موقع پر ہمارے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ جو ان کے مسترشد بھی تھے اور حضرت مولانا کی نظر میں معتبر بھی تھے مہمان ہوا کرتے تھے، اس بہانہ راقم الحروف کو بھی اپنی ابتدائی زندگی میں حضرت مولانا کو دیکھنے، سننے اور خدمت کرنے کی سعادت ملتی تھی اور جو باتیں اوپر عرض کی گئیں اسی تجربہ اور مشاہدوں کا ہی نتیجہ ہیں اور لکھنؤ کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں بھی بحیثیت طالب علم کے ایک سال قیام کا موقع ملا تھا جس کی وجہ سے مولانا کو ان کے گھر پر اور ان کی جگہ پر دیکھنے اور جاننے کی سعادت ملی تھی اور ان کی شفقت کے حصول کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہمارے بڑوں کا بھی حضرت سے استفادہ، واسترشاد کا تعلق رہا ہے۔

خال مخدوم ومعظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی مستفیدین میں اور حدیث میں ان کے شاگرد تھے اور ان کے گھر کے متعدد حضرات کا بیعت واسترشاد کا بھی ان سے تعلق تھا جن میں خود ان کی والدہ خیر النساء بہتر صاحبہ جو پہلے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے بیعت

تھیں پھر ان کی وفات کے بعد مولانا سید حسین احمد صاحب سے ہوئیں اور بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی صاحب حمشیرہ اسیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ اور خاندان کے بعض دیگر افراد بھی یہ تعلق رکھتے تھے، اس لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کا حادثہ وفات ہم لوگوں کو ایک بڑے خاندانی حادثہ وفات سے کم محسوس نہ ہوا وہ دین، ملت اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ رکھنے والوں کے لئے ایک رہنما زندگی کے نقوش چھوڑ گئے، اور یہ پیغام دے گئے کہ لوگوں کے سامنے دینی ترجیحات اور ملی مفادات کے علاوہ کوئی اور ترجیح اور مفاد نہ ہو، احاطہ دارالعلوم دیوبند میں واقع اپنے مکان پر ۵؍دسمبر ۱۹۵۷ء، ۱۲؍جمادی الاولی ۱۳۷۷ھ میں اسی سال کی عمر میں وفات پائی، ان کی اولاد واخلاف میں مولانا سید اسعد مدنی، مولانا سید ارشد مدنی اور مولانا سید اسجد مدنی اور صاحبزادیاں ہیں، اور یہ سب دینی وملی اور انسانی خدمت میں اپنی پہچان رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے ساتھ وہ معاملہ فرمائے جو اس کا اپنے مخصوص اور مقرب بندوں کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کی برکات کو قائم دائم رکھے، آمین۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

شیخ طریقت و رہبر دین واخلاق عارف باللہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے لوگوں کی تربیت اور تزکیہ کا وسیع اور غیر معمولی فریضہ انجام دے کر مورخہ ۱۳ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ (۱۶ اگست ۱۹۶۲ء) کو اس جہان فانی سے رحلت کی اور لاکھوں افراد کو سوگوار چھوڑ گئے، ان کا سانحۂ ارتحال لاہور (پاکستان) میں پیش آیا اور تدفین ان کے آبائی وطن ڈھڈھیاں ضلع سرگودھا (پاکستان) میں ہوئی، تربیت وتزکیہ کے میدان میں یہ ایک ایسا خسارہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا گویا ملت یتیم ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ خصوصی رحم وکرم اور انعام کا معاملہ فرمائے، اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

حضرت رائے پوری احسان وسلوک میں ممتاز اور بزرگوں کے سلسلے کی اہم یادگار تسلیم کئے جاتے تھے، ان کے اس امتیاز اور اس خصوصیت کو ان کے عہد کے ممتاز شیوخ طریقت تسلیم کرتے تھے، اور ان سے لاکھوں نے فیض اٹھایا، جن میں ملت کے مختلف طبقات اور مختلف سطح کے لوگ تھے، جن کا تعلق الگ الگ میدان فکر وعمل سے تھا، مگر یہ ایسا مرکز تھا جہاں سب جمع ہوتے تھے، اور اس چشمۂ فیض سے اپنی تشنگی بجھاتے تھے۔

مجھے زندگی کا جب شعور حاصل ہوا، تو اس وقت ہندوستان میں برطانوی سامراج سے گلوخلاصی کی کوششوں کا چرچا تھا، اور مسلمانوں کی عمومی زندگی میں اقتصادی بدحالی اور اخلاقی ودینی بے اعتنائی کا بھی دور دورہ تھا، اسی کے ساتھ ساتھ دینی زبوں حالی کو دور کرنے اور مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کا کام بھی جگہ جگہ انجام دیا جارہا تھا، اور اس سلسلے میں جن بڑے ربانی علماء اور شیوخ طریقت کا تذکرہ میں اپنے بڑوں سے سنتا تھا، ان میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد

زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا احمد علی لاہوری نمایاں حضرات تھے، ان میں سے سبھی کو دیکھنے کا موقع بھی ملا، اوران میں سے متعدد حضرات کی خدمت میں بار بار حاضری اوران کے وعظ ونصیحت سننے کی سعادت حاصل ہوئی، خاص طور پر حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کہ جن کو تزکیۂ باطن کے طالبین کے مرجع کی حیثیت حاصل تھی، وہ شہری علاقے سے الگ قصبہ ''رائے پور'' کے بیرونی حصہ میں جہاں راحت اور شہری زندگی کی سہولتوں کا کوئی انتظام نہیں تھا، جنوبی سمت کے ایک باغ میں جو باغ رحیمی کہلاتا تھا، اپنے شیخ، شیخ زمانہ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کے جانشین کی حیثیت سے مقیم تھے، اوروہ جگہ باوجود آبادی سے الگ ہونے کے ان کی خدمت میں طالبین ارشاد وتربیت کی کثرت آمد سے ایک آباد اور متحرک زندگی کی جگہ معلوم ہوتی تھی، یہ متحرک زندگی شہری ہماہمی کی نہیں تھی، یہ ذکر وعبادت کی ہماہمی کی زندگی تھی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری جن کے نام کے ساتھ رائے پوری کی نسبت ان کے نام کی صفت بن گئی تھی اصلاً رائے پور کے رہنے والے نہ تھے، وہ پنجاب کے ضلع سرگودھا (جواب پاکستان میں ہے) کے ایک قصبہ ڈھڈھیاں کے رہنے والے تھے، لیکن اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کی خدمت میں اتنی دراز مدت تک رہے اوران سے فیض اٹھانے اوران کا اعتماد حاصل کرنے کی اس منزل تک پہنچے کہ ان کے جانشین ہوئے، اورانھیں کی جگہ پر اس طرح ہر طرف سے منھ موڑ کر بیٹھ گئے کہ وہیں کے سمجھے جانے لگے، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کو شہرت اور ناموری اور دنیاوی فکر وراحت سے ایسی بے نیازی حاصل تھی کہ رائے پور کا رہائشی نظام ایسا بن گیا تھا کہ ان کی خدمت میں جانے والوں کو اپنی عادت میں داخل سہولتوں سے وہاں جا کر دست کش ہونا پڑتا تھا، اوران کی خانقاہ میں ذکر اور عبادت کی یکسوئی کو اختیار کرنا پڑتا تھا، اور یہ ان کی تربیت اور دین کی طرف یکسو کرنے کے لیے ایک مؤثر ذریعہ ہوتا تھا، حضرت مولانا نے خود اپنے شیخ کی خدمت میں ایسی بے نفسی اور گم نامی کے انداز سے وقت گزارا تھا، کہ ان کے شیخ کو تو ان کے حال کی خوبی خوب

معلوم تھی، لیکن دوسروں کو ان کی کسی اہمیت کا پتہ نہیں چلتا تھا، اور خدمت شیخ میں ان کو بعض وقت ایسی زحمتوں سے گزرنا ہوتا تھا، جو عام دین دار آدمی کے لیے مشکل ہوتا ہے، اسی لیے جب وہ اپنے شیخ کے بعد ان کے جانشین ہوئے تب لوگوں کو ان کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

حضرت کی بے نفسی انتہائی بڑی ہوئی تھی اپنے معتقدین اور مسترشدین کے سامنے ایسی باتیں کرنے کا تقریباً موقع ہی ہاتھ نہیں آتا تھا، کہ جن سے ان کی شخصیت کی عظمت کا احساس ہوتا، سیدھے سادے انداز میں اور عام تجرباتی زندگی کے حوالہ سے دور رس باتیں فرماتے، اور خاموش انداز میں اپنے مسترشدین کی تربیت فرماتے، خانقاہ رائے پور میں ہمہ وقت لا الہ الا اللہ، اور اللہ، اللہ کے ذکر کی گونج ملتی، بے نفسی اور دنیا کے معاملات سے بے نیازی کو دیکھ کر آدمی یہ سمجھتا، کہ ان کو دنیا کی حقیقتوں اور ضرورتوں کا علم نہیں ہے، لیکن امت کے کسی بھی اہم مسئلہ میں ان سے رائے حاصل کی جاتی تو بصیرت اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا، ان سے ملنے والے اور ان کے دیکھنے والے ان کے رہن سہن کے انداز اور بے نفسی سے متاثر تھے چنانچہ اور ایک خاموش انداز سے دلوں میں ان سے عقیدت پیدا ہوتی گئی، بتدریج ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی اور اس ملک سے اس ملک تک یہ مقبولیت پھیلتی گئی، تقسیم ہند کے بعد ان کا اپنا وطن پاکستان کا حصہ بن گیا تھا اور ان کے معتقدین ومسترشدین بھی بڑی تعداد میں پاکستان کے ہی شہری بن گئے تھے، اس لیے ان کو بار بار پاکستان بھی جانا پڑتا، جہاں خاصا خاصا وقت لاہور میں گزارنا ہوتا، وہاں ان کے ایک مسترشد بڑے عہدہ پر تھے، اور ان کا تعلق ایسا تھا، کہ ان کے مسترشدین کو ان کے یہاں استفادہ کی سہولت زیادہ حاصل ہوتی، حضرت جب پاکستان میں قیام فرما ہوتے تو ان سے استفادے کے لیے ہندوستان سے لوگ وہاں کا سفر کرتے، ان لوگوں میں میرے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو حضرت سے استفادہ کا تعلق ہو گیا تھا اور یہ تعلق بتدریج بڑھتا چلا گیا، جو خصوصی اعتماد اور گہرے ربط کی حد تک پہنچ گیا، اور اس کی بنا پر وہ بار بار رائے پور جانے کا موقع نکالتے تھے، اور اس

تعلق کے اثر سے مجھ خوردوں کو بھی حضرت کی خدمت میں حاضری کی سعادت ملنے لگی، اور اپنی آنکھوں سے ان کی شخصیت کو دلنواز اور مؤثر شخصیت محسوس کرنے کا موقع ملا، اس کے ساتھ ان کی شفقت سے اس عقیدت کو تقویت حاصل ہوتی رہی، میرے اور میرے ماموں کے وطن رائے بریلی اور عملی مستقر لکھنؤ میں حضرت کو کئی بار دعوت دی گئی، اور وہ تشریف لائے جن کی وجہ سے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور ہم جیسے خوردوں کو شفقت کا رویہ بھی حاصل ہوا، حضرت کی دلنواز شخصیت نے سب کو متاثر کیا، اور خاندان کے متعدد افراد نے حضرت سے بیعت وسلوک کا تعلق قائم کیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی حضرت قیام رہا اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ وکارکنان اور بعض طلبہ بھی ان سے روحانی طور پر وابستہ ہوئے اور لکھنؤ ورائے بریلی اور قریب کے اضلاع کے لوگوں نے بھی یہ تعلق قائم کیا اور دینی وباطنی اصلاح کی فکر کی۔

۱۹۵۰ھ میں حضرت نے سفر حج کا ارادہ فرمایا اور اس میں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو بھی اپنے ساتھ رہنے کا موقع عنایت فرمایا، اس موقع سے خال معظم نے اپنے کئی شاگردوں اور عزیزوں کو جن میں یہ کاتب سطور بھی ہے شریک سفر ہونے کا موقع عطا کیا، اس سفر میں جہاں حجاز مقدس کی برکات اور حرمین شریفین کی مبارک فضا سے دلوں کو جو تسکین ملتی ہے اس کے ساتھ ساتھ حضرت کے سربراہ سفر ہونے سے مزید برکت اور دلوں کو تقویت ملی، حضرت کا تواضع اور بے نفسی کا انداز ایسا تھا کہ اگر لوگوں کا ان کے ساتھ قدر واحترام کا رویہ نہ دیکھتے تو ان کی شخصیت کو کوئی ممتاز شخصیت سمجھنے کا احساس نہ ہوتا، وہ اپنی سادگی کے اسی انداز میں متوجہ الی اللہ رہتے اور اندر سے ذکر ومعرفت الٰہی کی جو کیفیت ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی، اس کا کچھ اندازہ دوسرے لوگ ان کی گفتگو کی جو دینی گہرائی ہوتی اس سے کرسکتے تھے، باقی اسلوب کلام یا انداز خطابت کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی، خال معظم کا جو گہرا تعلق قائم ہوگیا تھا، اس کی وجہ سے ان کو حضرت کی دینی رہنمائی کے ساتھ دین وملت کی نصرت اور قوت وترقی کے کاموں میں قیمتی مشورے حاصل

ہوتے ،ان سے حضرت کی صرف دینی بصیرت ہی کا نہیں بلکہ ملکی اور قومی بصیرت کا اظہار ہوتا تھا،اور ہم لوگوں کو خال معظم کے اس تعلق سے حضرت سے قریب ہونے کا موقع ملتا اور شفقت حاصل ہوتی تھی، یہ شفقت ایک خاموش تربیت اور توجہ دہانی کا کام کرتی تھی،حضرت کی مجلسوں میں جو بڑی حد تک خاموشی کی صفت رکھتی تھیں،اور اس خاموشی کو کسی حد تک کسی دینی کتاب کے پڑھنے سے پُر کیا جاتا تھا،اسی خاموشی اور کتاب کے پڑھنے سے اس مجلس کے شرکاء کو ایک خاموش فائدہ حاصل ہوتا تھا،اور وہ مختلف اوقات میں اردگرد ذکر کی آوازوں سے ایک سماں سا بندھ جاتا تھا،اور اس ماحول اور کیفیت میں وہ کشش تھی جو دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی۔

یہ ایک روشن چراغ تھا جو دور وقریب عرصہ تک روشنی پھیلانے کے بعد اپنے مستر شدین کو غمگین کر کے بجھ گیا،لیکن جن کو اس نے روشنی پہنچائی ان سے دوسروں کو فیض پہنچنے کا سلسلہ قائم ہوا اور یہ چراغ بہت سے چراغ روشن کر گیا ،اللہ تعالیٰ حضرت کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے ،اور ان کے نورانی کاموں کا عظیم سے عظیم اجر عطا فرمائے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

یوم دوشنبہ یکم شعبان ۱۴۰۲ھ-۱۹۸۲ء بعد نماز عصر مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اپنے پروردگار سے جا ملے۔ اور اس طرح اپنی دیرینہ تمنا کے مطابق اس دنیا سے رخصت ہونے پر گہوارہ صحابہ و اولیاء قبرستان شہر نبویؐ بقیع شریف کے پیوند خاک ہوئے۔ اس کے لیے حضرت شیخ نے برسوں سے تیاری کر رکھی تھی اور ہندوستان سے ہجرت اختیار کر کے مدنی وطنیت حاصل کی تھی، اور مسجد نبویؐ شریف کے جوار میں علالت وصحت کے ساتھ عبادت وحاضریٔ مسجد نبوی میں وقت گزارتے تھے۔

حضرت شیخ نے اپنی تمنا پوری کی اور اس دن وفات پائی جو دن ان کے اور ہم سب کے آقا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن ہے اور اس طرح اپنی محبت رسول کی قبولیت کا ایک اشارہ بھی حاصل کر لیا، اللہ تعالیٰ اپنے یہاں ان کے درجات مقبولیت زیادہ سے زیادہ بڑھائے اور بلند سے بلند مقام رضا عطا فرمائے۔

حضرت شیخ کی رحلت سے بزرگوں اور علماء اعلام کا وہ عہد ختم ہو گیا جو بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، مجاہد کبیر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور ولی کامل حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے مزین اور آراستہ تھا۔ یہ ایک عظیم داعی، عالم، مربی، مجاہد طبقہ تھا، جو ملت اسلامیہ کا اس دنیا میں سہارا تھا، کتنے طوفانوں اور فتنوں میں ڈھال بنتا تھا اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی زندگی میں رہنمائی کا فریضہ پورا کرتا تھا، یہ ایک چھتری تھی جس میں کم از کم برصغیر ہند و پاک کے مسلمان اپنی مذہبی، علمی اور دعوتی پریشانیوں میں سایہ حاصل کرتے تھے، زعماء دین کی اس اولین صف کے افراد ایک

ایک کر کے اٹھتے گئے، اور بالآخر اس صف کے آخری فرد حضرت شیخ بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

حضرت شیخ الحدیثؒ کی ولادت ماہ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کی ہے اس طرح حضرت شیخ نے عمر کی ۸۰ سے زیادہ منزلیں طے کیں، لیکن وہ ملت کی تربیت ورہنمائی سے ایک گھڑی کے لیے نہ تھکے اور نہ سست پڑے، شدید علالت میں بھی ہزاروں وابستگان تربیت کی رہنمائی اور فکر کا فریضہ انجام دیتے رہے، اسی کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی علمی شخصیت کی حیثیت سے برابر ادائیگی فرض کرتے رہے۔ جامعہ مظاہر العلوم سہارنپور میں حدیث شریف کا درس بڑے معیاری طریقہ سے انجام دیتے رہے اور درس کی جامعیت اور شہرت کی وجہ سے نہ صرف جامعہ مظاہر العلوم بلکہ پورے ہندو پاک میں اسی نسبت سے معروف ہوئے اور شیخ الحدیث کا لقب ان کا اصلی لقب بن گیا۔ تدریس حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام بھی ایسے بڑے پیمانے پر انجام دیتے رہے کہ حدیث میں تصنیفی کام کی تعداد واہمیت میں منفرد مقام حاصل کیا۔ علم حدیث کے دائرہ میں تصنیفی کام کے ساتھ ساتھ تربیتی میدان میں بھی ان کی تصنیفات کو وہ مقبولیت وعمومیت حاصل ہوئی کہ اس موضوع کی دیگر معاصر کتابوں کو کم حاصل ہوئی ہوگی۔ ان کی فضائل کی کتابوں کو آج شہرۂ آفاق مقام حاصل ہے، جواب ایک مجموعہ کی شکل میں ''فضائل اعمال'' کے نام سے معروف ہیں۔ اور دنیا کی مختلف زبانوں میں پڑھی جاتی ہے، ان کی دوسری علمی وتحقیقی کتابوں اور حدیث شریف کی اہم کتاب مؤطا امام مالک کی شرح اوجز المسالک بھی عرب وعجم کے علماء خوب مستفید ہو رہے ہیں۔

حضرت شیخ کاندھلہ کے ایک معزز دینی وعلمی خاندان کے فرد تھے، جس خاندان کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، حضرت مفتی الٰہی بخش صاحبؒ (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) اور ان کے برادر زادہ مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اس خاندان کے اسلاف میں علم وتقویٰ میں بڑی نمایاں شخصیت تھے، حضرت شیخ الحدیثؒ کے دادا مولانا محمد اسمٰعیل والد مولانا محمد یحییٰ اور چچا حضرت مولانا محمد الیاس (بانی جماعت تبلیغ)

اور چچازاد بھائی مولانا محمد یوسف کاندھلوی سب دعوت وعلم دین کے آفتاب ومہتاب تھے۔

حضرت شیخ نے اپنے عظیم والد حضرت مولانا محمد یحی کاندھلوی سے خصوصی تربیت حاصل کی، جنھوں نے اپنے ان عزیز فرزند کی تربیت میں بڑی باریک باریک باتوں پر نظر رکھی تھیں اور جہاں انھیں سختی کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہاں انھوں نے اس سے گریز نہیں کیا وہ عالم ربانی محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے ان چند مخصوص تلامذہ میں سے ایک تھے جن پر حضرت کی بڑی شفقتیں اور عنایتیں تھیں، اس کا فائدہ حضرت شیخ الحدیث کو بھی حاصل ہوا۔ اور والد کی وفات کے بعد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (جو ان کے والد اور چچا مولانا محمد الیاس کے بھی شیخ تھے) سے وابستہ ہوئے اور ان کی تربیت و علمی خصوصیات سے ایسا استفادہ کیا اور ان کے اعتماد کو حاصل کیا کہ ان کے بعد ان کے حقیقی جانشین و نائب ہوئے، خدمت حدیث میں ان کے کام کی تکمیل کی اور ان کے بعد اس کا سلسلہ جاری رکھا، سنن ابی داؤد کی شرح بذل المجہود کی تکمیل میں ان کا پورا ہاتھ بٹایا اور پھر اس کی اشاعت کے کام کو انجام دیا، بخاری شریف کے مختلف پہلوؤں پر اپنی قیمتی علمی کاوشیں پیش کیں نیز عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بڑی تحقیقی کتاب لکھی۔

حضرت شیخؒ نے اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے اجازت وخلافت پاکر تربیت باطنی کا کام بہت بڑے پیمانے پر انجام دیا اور ہزاروں لاکھوں متوسلین کے مرجع بنے، ان کے ساتھ رمضان المبارک کی ساعات کو عبدیت وعبادت میں گزارنے کے لیے ان کی اعتکاف گاہ مسجد میں سیکڑوں اور پھر بعد میں ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا جن میں سے ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ مہینہ مہینہ بھر اعتکاف کرتی اور یہ لوگ اپنی روح وباطن کو عبدیت کی کیفیات سے آراستہ کرتے، یہ سلسلہ گزشتہ رمضان تک جاری رہا۔

غیر رمضان میں بھی ان کی قیام گاہ پر طالبین اصلاح باطن کا مجمع رہتا اور وہ ان سب کی مہمان نوازی کرتے اور ان کی دینی اصلاح ومدد کا باعث بنتے۔

اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم، دین کو دنیا پر اور اپنی خواہش وآرام پر ترجیح دینے میں وہ

مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ سلف صالحین کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں ان کا نمونہ ان کی زندگی میں نمایاں طریقہ سے نظر آتا تھا، اخلاق، اکرام مسلم، ضیافت، دین کی حمیت، مسلمانوں کی اور اسلام کی سربلندی کی فکر، اتحاد بین المسلمین کے لیے کوشش، وسعت قلبی، بلند نظری، ذکاوت وفہم دین اور نہ معلوم کتنی ایسی صفات تھیں جو ان میں نگینوں کی طرح نظر آتی تھیں اور مخلوق خدا ان کی وجہ سے ان کی طرف کھنچتی اور ان سے وابستہ ہوتی تھی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو مدارس کے بقاء وترقی اور علم کی ترویج سے غیر معمولی دلچسپی تھی، مظاہر علوم کی خدمت وترقی کے لیے تو انھوں نے اپنی توانائیاں اور اثر ونفوذ کو خوب خوب استعمال کیا، دارالعلوم دیوبند سے بہت قریبی تعلق تھا لیکن ان کے علاوہ بھی بے شمار مدرسوں کی ترقی سے دلچسپی تھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تعلق سے ربط بڑھا اور تعلق میں اضافہ ہوا۔ یہ تعلق بعض وقت بہت غیر معمولی صورت اختیار کر لیتا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے خیر وترقی کے لیے ایسی دلچسپی اور شفقت سے کام لیتے جو صرف اس کے سرپرستوں سے ہی متوقع ہوسکتی ہے وہ اس کے لیے اپنے قیمتی مشوروں، خبر گیری اور تعاون سے نوازتے، اس تعلق وخبر گیری نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وطلباء کے دلوں میں حضرت شیخ کے لیے بے حد جذبہ قدر وتشکر پیدا کیا وہ ان کو اپنا ایک عظیم سرپرست سمجھتے تھے۔ ان کی وفات کے سانحہ کو اس وجہ سے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بڑا سانحہ سمجھا گیا۔

حضرت شیخ ادھر کئی سال سے صحت کی معذوریوں اور علالتوں سے بالکل گھر گئے تھے، خود سے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھے لیکن اس کے باوجود تربیتی ضرورت کے لیے مدینہ منورہ سے ہندوستان، ہندوستان سے مدینہ منورہ آنے جانے میں تکلف نہ کرتے خواہ اس میں کتنی ہی زحمت ہوتی اس سلسلے میں ان کا آخری سفر ہندوستان، ایک غیر معمولی سفر تھا، جس کو انھوں نے صحت کی اپنی آخری درجہ کی معذوری کے باوجود اختیار کیا اور تکلیف اٹھائی۔

حضرت شیخ کی وفات سے پورا عالم اسلام اور خاص طور پر برصغیر ایک نہایت عظیم اور

جامع مذہبی وعلمی شخصیت سے محروم ہوگیا، اور ملت کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کو ایک آدمی تو کیا شاید کئی آدمی مل کر بھی عرصۂ دراز تک پُر نہ کرسکیں گے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت شیخ نے اپنے پیچھے ایسے علمی کارنامے چھوڑے ہیں جو ان کی عبقریت اور جلالت شان کا پتہ دیتے ہیں جس میں "اوجز المسالک إلی مؤطا الامام مالک" خصوصیت سے قابل ذکر ہے (۱)، جس کا اعتراف عرب علماء اور زمانہ کے محدثین ومحققین نے کیا ہے، آپ کی تصنیفات میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب "فضائل اعمال" جو مختلف رسائل کا مجموعہ ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے، (۲) یہ مساجد میں پڑھی جاتی ہے اور تبلیغی حلقوں میں اسے نصاب کی حیثیت حاصل ہے، ان کی خودنوشت سوانح حیات "آپ بیتی" بھی بڑی مقبول ہوئی۔

حضرت کے پسماندگان میں حضرت کی کئی صاحبزادیاں ہیں اور مولانا محمد طلحہ صاحب ایک صاحبزادہ۔ مولانا طلحہ صاحب کو حضرت شیخ نے نہایت ہی حکیمانہ انداز سے تربیت دی ہے کہ وہ بڑی حد تک حضرت کے مطمح نظر کے مطابق اور دینی لحاظ سے سب سے معیاری صفات کے حامل ہیں۔ وہ حضرت کی سب سے خوردا ولاد ہونے کے باعث ابھی بالکل نوجوان ہیں۔

حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی امیر تبلیغ جماعت حضرت کے داماد ہیں (۳)، حضرت شیخ کے بعد حضرت کے خاندان کے اب وہی سب سے بڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی حفاظت فرمائے اور ان کے برکات کا فائدہ زیادہ سے زیادہ دیرپا اور عام فرمائے۔ آمین۔

---

(۱) یہ کتاب "اوجز المسالك الى مؤطا الامام مالك" حضرت شیخ کے تربیت یافتہ اور عزیز شاگرد مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری کی تحقیق کے ساتھ ۲۱ جلدوں میں اعلیٰ طباعت سے منظر عام پر آچکی ہے اور کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں، ہندوستان سے "مرکز الشیخ ابی الحسن الندوی للبحوث والدراسات الاسلامیة"۔ اعظم گڑھ سے شائع ہوئی ہے۔

(۲) فضائل اعمال کا عربی ایڈیشن "منهج الحياة الايمانية والتربية الدينية" کے نام سے مولوی عبدالرشید ندوی استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تحقیق سے حضرت شیخ کے صاحبزادۂ وجانشین مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی مدظلہ نے اپنے دارالاشاعت مکتبہ یحییٰ سہارنپور سے شائع کیا ہے جو عالم عرب میں بھی مقبول ہوئے۔

(۳) حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلوی کی اس خاندان کو حضرت شیخ کے بعد سرپرستی حاصل رہی اور وہ بھی اب اپنے رب کے جوار رحمت میں ہیں آئندہ صفحات میں قارئین ان کا تذکرہ ملاحظہ کریں گے۔ (م)

حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ

بقیۃ السلف حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھیؒ کی وفات اپنے عہد کے ایک بڑے بزرگ کی وفات ہے۔ جس پر بے شمار لوگوں کے دل مغموم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے سب کا سر تسلیم سے خم ہے۔ اور دلوں میں غم و رنج ہے۔ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی بیک واسطہ اویس زمانہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ تھے۔ ضلع رائے بریلی کے ایک گاؤں سدھونہ میں مولانا سید بدر علی شاہ صاحب ایک بزرگ گزرے ہیں۔ جو علم دین کے میدان میں بلند مقام رکھتے تھے، وہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کے خلیفہ اور حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ کے شیخ و مرشد تھے۔ حضرت مولانا کو ان سے خلافت و اجازت ملی ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ ان کو مولانا شاہ وارث حسن لکھنوی سے بھی اجازت حاصل تھی جن کی خدمت میں وہ ٹیلہ والی مسجد لکھنؤ میں رہے تھے اور ان کی نگرانی میں بڑی ریاضتیں کی تھیں جو شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے مجاز تھے۔

حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ جن کے لیے دامت برکاتہم کے بجائے اب رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے۔ ضلع پرتاب گڑھ کے پھول پور قصبہ میں پیدا ہوئے۔ اور اپنی نوعمری، پھر جوانی اور اس کے بعد کا ایک زمانہ دین اور دعوت کی راہ میں بہت مشقتیں جھیل کر گزارا۔ گاؤں گاؤں جانا اور اصلاح و دعوت کے کام میں وقت صرف کرنا، اور اس کے سلسلے میں راہ کی مشقتیں جھیلنا، کھانے پینے کی دشواریوں کو برداشت کرنا، اور پورے ذوق و شوق سے خدا کی مرضی کے کاموں کو انجام دینا ان کا خصوصی حال تھا۔ اس زندگی نے ان میں ایک طرف دین و دعوت کے لیے مشقتیں برداشت کرنے کی عادت پیدا کر دی اور دوسری طرف دین سے ہر تعلق رکھنے والے سے محبت اور ہر ایک سے ہمدردی و شفقت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہ مجسم محبت بن گئے، اس کی شہادت ہر وہ شخص دیتا اور دے سکتا ہے، جس کا ان سے کسی طرح کا

واسطہ پڑا۔ پھر یہ بات ان میں صرف عمل ہی تک محدود نہ رہی بلکہ شاید ان کے ذہن ومزاج میں داخل ہوگئی، چنانچہ ان کے منظوم کلام میں پوری طرح جھلکتی ہے۔ ان کے منظوم کلام میں ان کے دل کی گہرائی سے اٹھنے والے احساسات اور متغزلانہ اسلوب بیان سے عیاں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری متصوفانہ شاعری بھی ہے اور صالح انسانی جذبات کا غزلیہ کلام بھی ہے۔ جو دیوان کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا یہ دیوان عرفان محبت کے نام سے معروف ہے۔

مولاناؒ اپنے آخری زمانہ میں اپنے محبین وخدام اور معتقدین کی کثرت ہوجانے کی وجہ سے اپنے گاؤں پھول پور کے بجائے عموماً الہ آباد یا شہر پرتاب گڑھ میں قیام فرمانے لگے تھے، اس میں الہ آباد کا حصہ زیادہ تھا، کیونکہ وہاں ان کے صاحبزادہ ارشاد احمد صاحب ملازم تھے اور صابری منزل میں ان کا قیام تھا، اور ایک صاحبزادی بھی رہتی تھیں، نیز بعض محبین ومعتقدین نے باصرار قیام کی جگہ بھی مولاناؒ کے لیے مہیا کر رکھی تھی؛ جناب ڈاکٹر ابرار صاحب جو حضرت مولانا کے مخلص مریدوں میں تھے، انہوں نے ایک موزوں جگہ حضرت مولانا کے لیے مہیا کر رکھی تھی، اور حضرت مولانا کی جسمانی تکلیفوں کا علاج بھی کرتے تھے۔ اور ایک جگہ مدرسہ بیت المعارف تھی جو مسجد سے متصل ہے جس کے بانی ومہتمم حضرت مولانا کے ہی ایک مسترشد اور خلیفہ مولانا شاہ محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی (اطال اللہ بقائہ) ہیں جو حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے داماد بھی ہیں، صابری منزل حضرت کی خاص قیام گاہ تھی۔ لیکن جب اعذار بڑھنے لگے اور مہمانوں کی کثرت ہونے لگی تو وہاں قیام مشکل ہوگیا اور پھر "مدرسہ بیت المعارف" اور ڈاکٹر ابرار صاحب کی جگہ قیام رہنے لگا اور ڈاکٹر ابرار صاحب کے ہی مکان پر جہاں وہ زیر علاج بھی تھے انتقال فرمایا۔

الہ آباد کے قرب واطراف اور پرتاب گڑھ، سلطان پور، رائے بریلی کا علاقہ ۶۰-۷۰ سال قبل نصیر آباد رائے بریلی کے ایک بزرگ مولانا سید محمد امین نصیر آبادیؒ کے فیض سے بہت مستفید ہوا تھا، جس کے آثار جگہ جگہ محسوس کئے جاتے ہیں۔ ان کا دور ختم ہوا ہی تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مشہور خلیفہ مولانا وصی اللہ فتح پوریؒ کا فیض الہ آباد اور اس کے اطراف میں خوب پھیلا۔ اور لوگوں کی بہت اصلاح ہوئی اور ان کے دور اختتام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڈھیؒ کو تربیت واصلاح کے اس کام کے لیے کھڑا کر دیا۔ اور اب ان کی وفات سے

ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مولاناؒ کی غالباً ریاضتوں اور جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی وجہ سے ان کو بعض ایسی شکایتیں پیدا ہوگئی تھیں کہ ان کو ریاحی تکلیف اور کمزوری کا مسلسل احساس رہتا تھا، اور یہ شکایت تا آخر عمر قائم رہی جس کی وجہ سے غذا میں قلت بڑھتے بڑھتے معدوم کی حد تک پہنچ گئی۔ بالآخر جسم نے برداشت سے جواب دے دیا اور بالآخر ۳ ربیع الثانی ۱۴۱۲ھ/۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو وقت موعود آ گیا، وفات کے وقت عمر غالباً ۹۰ سال سے زیادہ تھی پسماندگان میں تین صاحبزادے اور متعدد صاحبزادیاں چھوڑیں۔ ان میں بڑے صاحبزادے مولانا اشتیاق احمد ایک بزرگ شخص ہیں اور ان کے خلیفہ بھی ہیں (۱) اور دوسرے صاحبزادے جناب ارشاد احمد صاحب الہ آباد میں برسرِ کار ہیں اور نیک طینت اور اچھی صفات کے حامل شخص ہیں، انھیں الہ آباد میں ہونے کی وجہ سے والد کی خدمت کا اچھا موقع ملا جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا، قاری مشتاق احمد صاحب لکھنؤ میں ایک دینی مدرسے کے ذمہ دار ہیں جو عالیہ عرفانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے، یہاں انھوں نے حضرت مولانا کو ٹھہرا کر راحت پہنچانے کا اچھا بندوبست کیا تھا اور اپنے والد کی دعائیں لی تھیں، اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے اور حضرت مولاناؒ کے درجات بہت بلند فرمائے، ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کو دور فرمائے۔ رحمه الله رحمة واسعة واسكنه جنانه وتقبل منه۔ انا لله وانا اليه راجعون۔

حضرت مولاناؒ ندوہ سے اور اس کے متعدد ذمہ داروں و کارکنان سے خاص طور پر اس کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم سے زیادہ محبت کا برتاؤ فرماتے اور اتنا تعلق خاص کا معاملہ فرماتے جو عموماً کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کاتب الحروف بھی ان خوش نصیبوں میں ہے جس کو حضرت مولاناؒ کی شفقت و محبت حاصل رہی، ان کی وفات سے اس شفقت و محبت سے محرومی کا بہت زیادہ احساس ہے اور میرے اس احساس میں بہت سے لوگ شریک ہیں۔ ندوۃ العلماء کے لیے یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ جب حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے ندوے میں کچھ وقت قیام کی درخواست کی گئی تو انھوں نے بخوشی منظور فرمایا، اور بڑے انشراح کے ساتھ ہفتہ دو ہفتہ قیام فرما کر اپنی مجالس و مواعظ حسنہ سے لوگوں کو محظوظ و مستفید کیا، جن کے شائع کرنے کا تعمیر حیات میں اہتمام بھی کیا گیا۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی جے پوریؒ

مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی ایک بڑی داعی واصلاحی شخصیت تھے جن سے تربیت دینی واصلاح نفس کے میدان میں بڑا فیض پہنچ رہا تھا، اس کی شہادت راجستھان گجرات اور دیگر علاقوں کے بہت سے افراد سے ملتی ہے، جن کی زندگیوں میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وارشاد سے تبدیلیاں آئیں اور وہ آزاد زندگی سے دست بردار ہوکر پابند زندگی گزارنے لگے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک ملنسار، متواضع اور جامع کمالات بزرگ تھے، ان سے جو ملتا معتقد ومعترف ہوجاتا انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے دین وملت کی بڑی خدمات انجام دیں، بے شمار کاروباری لوگ جن کو اپنے دنیاوی کاروبار سے فرصت نہیں ملتی تھی، اور وہ دین کے زیادہ پابند نہیں تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حسن تربیت سے یکسر بدل گئے، اور پھر انھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی سے اپنی زندگی کو وابستہ کردیا، اور نہ صرف اپنی ذات کے لیے وہ مفید بنے بلکہ ملت کے مختلف تقاضوں کو پورا کرنے والے بنے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دینی تعلیم لکھنؤ میں فرنگی محل کے علماء سے حاصل کی اسی دوران وہ ندوۃ العلماء بھی آتے تھے، انھوں نے وہاں کے علماء سے بھی ربط رکھا، اس طرح انھوں نے ملت کی تعلیم وتربیت کے طریقہ کار کا جو تنوع ہے اس کو سمجھا، تصوف کی خوبیاں اور اس کے کمالات اپنے دادا حضرت مولانا ہدایت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کیں جو اپنے عہد کے بڑے بزرگ تھے انھوں نے تصوف وطریقت میں طریقہ مجددی نقشبندی کو اختیار کیا جو سنت کی ظاہری اتباع میں بھی سختی اور احتیاط رکھتا ہے، تعلیم وتربیت کے

نظام وطریقہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مختلف مکاتب فکر سے واقفیت واستفادہ کا موقع

(۱) افسوس کہ انھوں نے بھی اپنے عظیم المرتبت والد کے سانحہ ارتحال کے بعد قریبی مدت میں رحلت کی، اُمید تھی کہ اُن سے اُن کے والد کا فیض عام ہوگا مگر اللہ کو کچھ اور منظور تھا۔ غفراللہ تعالیٰ لہ ورفع درجاتہ۔ (م)

ملا، انھوں نے ایک طرف فرنگی محل کے مکتب علمی سے فائدہ اٹھایا دوسری طرف ندوۃ العلماء کے تعلیمی نہج کو سمجھا، تعلیمی فکر ونظام میں ذہن کی ایک خاص تشکیل، پھر مجددیہ نقشبندیہ سلسلے سے تعلق دونوں حیثیتوں سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا راستہ زیادہ متوازن اور جامع بنا، اس کے ساتھ پھر اصلاح وتربیت کے کام میں کاروبار سے وابستہ افراد سے زیادہ واسطہ ہوا، اس سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کی دنیاوی ضرورتوں کو بھی سمجھا اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسی درس گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو کئی اعتبار سے جامعیت کی حامل ہو، اس کے ذریعہ سے ایک طرف علوم دینیہ حاصل ہوتے ہوں تو دوسری طرف علم دین کا وہ مزاج وصلاحیت بنتی ہو جو موجودہ عہد میں اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کرسکتی ہو مولانا نے اپنے قائم کردہ جامعۃ الہدایہ میں ظاہری حسن وکمال کے لحاظ سے بھی پورا اہتمام رکھا، اور اندرونی طور پر علوم دینیہ کے ساتھ وہ مضامین بھی شامل نصاب کئے جن کے بغیر ایک عالم دین میں عصری ودنیاوی معاملات میں قوت کمتر پیدا ہوتی ہے، اور ان کے حصول کے بعد طلبہ عصری درسگاہوں میں نصاب تعلیم حاصل کئے ہوئے افراد سے کم تر صلاحیت کے نہیں ہو سکتے، چنانچہ انھوں نے دینی علوم کے ساتھ مزید اضافہ کرنے کی ایک ٹھوس اور منظم کوشش کی جو اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی، کہ عالم دین دینی واجتماعی علوم وآداب کے ساتھ کسی اعلیٰ ٹیکنکل تعلیم سے بھی آراستہ ہو جائے اس کے لیے انھوں نے نصاب تعلیم میں جگہ نکالی، اور اس سلسلے میں دونوں مکاتب فکر کے ماہرین سے مشورہ وتعاون لیا، مولانا مرحوم کی طبیعت اتنی مرنجان مرنج تھی کہ ان کو دینی طبقہ کا تعاون حاصل ہونے کے ساتھ دیگر صلاحیتوں کے لوگوں سے بھی تعاون ملا، چنانچہ ندوۃ العلماء کے ان اساتذہ کا جو تعلیم ونصاب سے عملی واقفیت رکھتے تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ان اساتذہ کا جو پولی ٹیکنیک کے موضوع پر مہارت رکھتے تھے۔ دونوں کی طرف سے بنیادی تعاون ملا، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کے مشوروں کی قدر کی، اور اپنی جامعہ کو ان سے مدد پہنچائی، مولانا عامل سنت صوفی اور حکیمانہ طریقہ پر عامل مربی تھے، ان کے مریدوں میں بڑی اچھی صلاحیتوں کے لوگ تھے، مولانا کو اپنی جامعہ

کی تاسیس میں ان سے مدد ملی، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مطمحِ نظر کے مطابق جامعہ قائم کر دیا، جو کئی برس سے کام کر رہا ہے۔ تعمیراتی مسئلہ میں ان کو فرقۂ وارانہ حالات سے سابقہ پڑا، اور کام میں رکاوٹ پڑی، جس کے ازالے کے لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے معاونین لگے رہے، اور ابھی سلسلہ جاری ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ مشورہ دیتے، سرپرست یا ناظم، مہتمم ہونے کی صورت میں صرف مشورہ پر اکتفانہ فرماتے، بلکہ حکم فرماتے، اور امر و نہی کے کسی ایسے معاملہ میں جہاں انھیں اس کی پوری قدرت ہوتی، تساہل نہ برتتے، اور نہ ہی چشم پوشی کرتے، اور معاملہ کی پوری صفائی چاہتے اگر کسی کو ملی معاملہ میں ذرا بھی خیانت کا عمل کرتے دیکھتے اور اس کی بددیانتی ثابت ہو جاتی تو پھر اسے مستحق سزا سمجھتے جس کی ان کے یہاں ادنیٰ سزا یہ ہوتی کہ وہ اس ادارہ یا مدرسہ سے اپنا تعلق ختم کر لیتے، اگر دو فریقوں کے ایک دوسرے پر الزامات واعتراضات دیکھتے تو دونوں کا منصفانہ حل نکالتے، اسی طرح انھوں نے اپنے مدرسہ کے نظام میں اساتذہ کے لیے یہ ضروری قرار دے دیا تھا کہ وہ اپنے اس معاہدہ کے پورے پابند رہیں جس کے تحت مدرسہ نے ان کی خدمات لی ہیں اسی طرح وہ اس استاد کو بھی تعلیم وتربیت کے کام کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے جو منکرات کو گرچہ روک نہ پا رہا ہو مگر خود رک سکتا ہو اور رک نہ رہا ہو، اس ضمن میں ان کے یہاں یہ اصول تھا کہ اس کے گھر میں وہ پردہ ہونا چاہئے جسے شرعی پردہ کہتے ہیں، سبھی غیر محارم سے پردہ ہو، منکرات کو دور کرنے میں مولانا کے یہاں دو طریقے تھے جن پر ان کا زور تھا ان سے بزور کہتے، جن پر زور نہیں ہوتا ان سے اس کی شناعت بیان کر کے اور آخرت کا خوف دلا کر مطالبہ کرتے۔

مولانا کے یہاں اصول وضوابط پر عمل میں جہاں کچھ سختیاں تھیں اس کو وہ دوسری طرف سہولت ونرمی سے پر کر دیتے تھے، رہائش کا مسئلہ اور دیگر ذاتی ضروریات کے مسائل اس کے لیے مسئلہ نہ رہ جاتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہاں کے اساتذہ اور کارکناں اپنے کو مدرسہ کا اور تنظیم وخانقاہ سے وابستہ لوگ اس کا ہمہ وقتی خادم سمجھتے تھے، اس کی فکر نہ کرتے کی کس کو کتنی تنخواہ مل رہی ہے، اور ہم کو کتنی ملنی چاہئے، وہ اپنے کو حضرت والا کا ایک غلام سمجھ کر پوری

توانائی اور تندہی سے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے، مولانا بھی ان حضرات کا پورا خیال کرتے ان کی ضروریات پر نگاہ رکھتے، رہائش کا مسئلہ ہوتا یا علاج ومعالجہ کی بات ہوتی اس کے لیے ضروری تعاون فرماتے، اپنے صاحبزادگان کو ندوۃ العلماء میں تعلیم دلائی تھی، اور ان کو وہاں کے نظریۂ تعلیمی کی بڑی قدر تھی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ان صاحبزادگان نے اپنے عظیم والد کے مشن کو ان کی زندگی ہی میں سنبھال لیا تھا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، زمانہ کی نبض کو سمجھتے تھے، اور اپنی اسی فہم وفراست کے مطابق وہ ملت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے اور اصلاح وتربیت کا کام کرتے تھے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے خصوصی ربط تھا۔ اور ان کے طریقہ کار اور ملت کے کاموں میں ان کے تخیل سے ان کو اتفاق تھا اس کی وجہ سے دونوں حضرات کے درمیان اتفاق اور تعاون کا اچھا ربط تھا، اس کا ایک مظہر اسی سال منعقد ہونے والا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا وہ عظیم الشان اجلاس تھا جس کی میزبانی کی ذمہ داری حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامعہ کے توسط سے لی تھی، مولانا ایک گونا گوں صفات کے آدمی تھے انھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی نسبۃً کم عمر میں انتقال فرمایا لیکن اس کم عمر میں بھی وہ بڑے کام انجام دے گئے جو عموماً طویل عمر میں انجام دیئے جاتے ہیں، انہوں نے چار صاحبزادگان قائم مقام چھوڑے ان میں مولانا فضل الرحیم مجددیؒ نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کام کے خاصے حصے کو سنبھالا ہے اور وہی جامعۃ الہدایہ کے ذمہ دار اعلیٰ (امیر الجامعہ) ہیں، دوسرے صاحبزادے مولانا ضیاء الرحیم مجددی بھی مولانا کے شروع کئے ہوئے کام کی انجام دہی کر رہے ہیں، اس سے امید کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ اس عظیم خلا کو جو حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم مجددیؒ کی وفات سے ہوا ہے، بڑی حد تک پر کیا جا سکے گا ان کے صاحبزادگان اسی کی ہمت کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، اور اس فیض کو قائم اور باقی رکھے، جو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے چھوڑا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں علالتوں سے گزرے اور ا

۲۲ر رجب المرجب ۱۴۱۴ھ، مطابق ۵ر جنوری ۱۹۹۴ء کو بمبئی میں انتقال فرما گئے یوم جمعہ ۲۴ر رجب ۷ر جنوری ۱۹۹۴ء کو جے پور میں تدفین عمل میں آئی، اگر ان کی صحت ان کے لیے قوی رہتی اور وہ زیادہ عمر پاتے، تو ان کے کام کی مقدار اور بھی زیادہ ہوتی اور ان کا اثر اور زیادہ وسیع ہوتا، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا وقتاً فوقتاً کانپور آنا ہوتا تھا وہاں کے متعدد حضرات ان سے دینی عقیدت اور تربیت کا تعلق رکھتے تھے، اس ضمن میں لکھنؤ بھی آنا ہوتا تھا اور مجھ کو بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا، اس کے علاوہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامعۃ الہدایہ کے سلسلے میں جے پور بھی بلایا اور تاسیسی مشوروں میں بھی شریک کیا، ایسے موقعوں پر عموماً میں اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بڑے استاد وسابق مہتمم مولانا ابوالعرفان خاں ندوی مرحوم بھی ہوتے تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہت محبت واکرام سے پیش آتے، اور ہم لوگوں کو بھی اپنی معلومات وتجربات کی روشنی میں مشورہ پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوتی، ندوۃ العلماء کے بعض دیگر اساتذہ کو بھی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر ان کے یہاں جانے کا موقع ملا۔

آج جب کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی کے یہاں پہنچ چکے ہیں اس کام اور میدان عمل میں انھوں نے اپنی جو توجہ اور وقت صرف کیا اس کے ختم ہونے سے ایک خلا محسوس ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس خلا کو بہتر سے بہتر طریقہ سے پر فرمائے، اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے اخلاف کو ان کا صحیح جانشین بنائے۔

حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ

حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ جو تبلیغ ودعوت کے عالمگیر کام کے تیسرے رہنما امیر تھے، اور حضرت جی کے لقب سے مشہور تھے، ان کا انتقال نئے ہجری سال کے آغاز میں دس محرم الحرام ۱۴۱۶ھ، مطابق دس جون ۱۹۹۵ء کو دہلی میں ہوا، جہاں وہ مرکز نظام الدین بنگلہ والی مسجد میں دعوت وتبلیغ کا عالمگیر کام کے امیر کی حیثیت سے مقیم تھے اور مرجع خلائق سے تھے، وہ ایک بڑی اور غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف علوم دینیہ میں واقفیت وقابلیت کا بڑا مقام رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کی وفات ایک بڑے عالم دین کی وفات سمجھی گئی، دوسری طرف وہ تبلیغی جماعت کی خصوصیات اور اس کے کام کے جذبہ و نظریہ کے بڑے محافظ اور اس کے روح رواں تھے۔ جس کی وجہ سے اس کام کے لیے آپ کی وفات ایک بڑا خسارہ بنی، تیسری طرف وہ جماعت کے امیر اور اس کے اعلیٰ منتظم تھے۔ اس کی بنا پر آپ کی وفات جماعت کی قیادت کے لیے بڑا سانحہ ہوئی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر کرنے کے لیے جماعت کی امارت کا جو نظم بحسن وخوبی کیا گیا ہے۔ اس سے جماعت کو نئی روح اور نیا جذبہ حاصل ہوا، جو جماعت کے لیے فال نیک ہے۔ اس بنا پر اس بات کے پورے پورے آثار ہیں کہ یہ عظیم کام اپنے معیار کے مطابق جاری رہے گا۔ اور ترقی کرتا رہے گا۔ یہ کام ایک بڑا عظیم دعوتی کام ہے۔ اور یہ اپنی الگ خصوصیت رکھتا ہے۔

اس وقت دنیا میں اسلامی زندگی کو استوار کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے اعمال اختیار کرنے اور ایمان وعقیدہ پر خصوصی دھیان دینے کے لیے جو بھی کام کئے جارہے ہیں ان میں تبلیغ ودعوت کا کام جو نظام الدین دہلی کے تبلیغی مرکز کے زیر سرکردگی کیا جارہا ہے، نہ صرف یہ کہ بہت نمایاں اور ممتاز ہے بلکہ اس کے اثرات بہت وسیع دائرے میں پڑے ہیں

اور پڑ رہے ہیں۔ ہزاروں کی زندگیوں میں غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اور برابر آ رہی ہیں۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ جو پہلے دین اور ایمان وعبادت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، وہ جب اس کام سے وابستہ ہوئے تو یکسر بدل گئے۔ ان میں ایسے ایسے لوگ جو اپنی سابقہ زندگی میں یہ بھی محسوس نہیں کئے جاتے تھے کہ وہ مسلمان ہوں گے، لیکن بدل کر ایسے ہو گئے، جیسے اب دنیا اور دنیاوی معاملات سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ اور نہ وہ جدید تعلیم وثقافت سے واقف ہیں۔ بلکہ ان میں بہت سے لوگ دیکھنے میں مولوی اور عالم معلوم ہونے لگے۔

تبلیغی جماعت کے کام میں منہمک ہو جانے والوں میں یہ بات عام طور پر ظاہر ہو جاتی ہے اور یہ ظاہر داری نہیں ہوتی بلکہ ان پر پڑنے والے اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے، ان کا کثرت سے اللہ اور اس کے رسول کی باتیں سننا، ان میں ایسا ایمان ویقین پیدا کر دیتا ہے کہ ان کی نظر میں اصلی اہمیت اللہ کی رضا اور اس کے رسول کی سنت کی ہو جاتی ہے وہ کہنے لگتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے اور ہر کام میں صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے، صرف اسی سے لو لگانا چاہئے۔ اسی تحریک ودعوت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع سے ہی ایمان بڑھانے اور اپنی اور دوسروں کی اصلاح کرنے کے کام پر زور دیا۔ انھوں نے اس کے لیے اپنے دعوت کے یہ اصول مقرر کئے جن میں خاص طور پر کلمہ، نماز، علم، ذکر، اکرام مسلم پر زور دیا۔ چنانچہ اس کام کے کرنے والوں کی تمام محنت ان اصولوں کے محوروں پر چلتی ہے۔ سب سے پہلے وہ کلمۂ توحید پر زور دیتے ہیں، کلمۂ شہادت کی تصحیح کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس بات کو سمجھاتے ہیں کہ ساری عظمت، ساری قدرت، سارا اختیار خدائے واحد کا ہے۔ اور تنہا وہی لائق عبادت ہے۔ اور اس کی عبادت کے سب سے بنیادی رکن نماز پر زور دیتے ہیں پھر ذکر الٰہی، اکرام مسلم اور حصول علم کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے اس کا آغاز شمالی ہند کے علاقہ ''میوات'' سے کیا تھا کیوں کہ وہاں کے مسلمانوں کی زندگیاں اتنی بگڑ گئی تھیں کہ ان کو مسلمان سمجھنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ حتی کہ بت پرستانہ رسوم تک ان کی زندگیوں میں سرایت کر گئیں تھیں۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اس کو دیکھ کر بہت بے چین ہوئے اور انھوں نے والہانہ جذبہ سے ان میں کام شروع کیا۔ اور ایسے اخلاص و بے نفسی کے ساتھ کام کیا کہ وہاں کے لوگ ان سے متاثر ہوئے اور ان کی زندگیاں بدلنا شروع ہوئیں، اور پھر دعوتی کام میں لگنے سے وہ اپنے داعی کے انداز و اخلاق کا حامل بنتے چلے گئے۔ پھر حضرت مولانا ان کو لے کر میوات سے باہر نکلے۔ دوسرے علاقوں میں کام پھیلانا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ بڑے اچھے آثار پیدا ہونے لگے۔ اور کام کا تعارف بڑھ گیا۔ اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ لوگوں کی ایک کامیاب داعیانہ جماعت تیار ہوگئی۔ جن میں سرفہرست ان کے صاحبزادہ اور متعدد عزیز اور شاگرد و مریدین تھے۔

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۹۴۴ء میں وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے اسی رنگ ڈھنگ اور جذبے سے کام کو آگے بڑھایا۔ اور کام ہندوستان سے باہر ملکوں تک پہنچا۔ اور اس کی بڑی وسعت ہوئی۔ مولانا محمد یوسف صاحب بھی اپنے والد کی طرح کام میں بالکل مستغرق اور ہمہ وقت اس میں مشغول تھے۔ ان کی تقریروں میں بڑے ایمانی نکتے ہوتے تھے۔ ان کی تقریروں کا دلوں پر بے حد اثر پڑتا تھا، وہ ایمان و یقین کی باتوں سے پھر پور ہوتی تھیں۔ ان کے متعدد رفقاء بھی کام میں ان کے شریک تھے۔ اور یہ سب رفقاء اس دعوتی کام کے رئیس اول مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کے خصوصی تربیت یافتہ تھے۔ ان میں مولانا محمد انعام الحسن کاندھلویؒ کی شخصیت سب سے ممتاز تھی۔ وہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے عزیز قریب اور ہم وطن بھی تھے۔ اور انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مولاناؒ کی تربیت میں گزارا تھا، اور جو ان کے مجاز بیعت و ارشاد بھی تھے، چنانچہ مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات پر جو ان کی نسبتاً کم عمری میں ۱۹۶۵ء ہی میں پیش آئی۔ ان کا انتخاب امیر کی حیثیت سے ہوا۔ اس وقت سے ۱۹۹۵ء تک انھوں نے تیس سال جماعت کی قیادت کی۔ اس تیس سال کی مدت میں تبلیغی کام دنیا کے بیشتر ملکوں میں پھیل گیا اور ہر جگہ سے وفود آنے لگے، اور نظام الدین کے مرکز میں رہ کر کام کا طریقہ سیکھنے اور پھر اپنے ملکوں میں پھیلانے لگے۔ اسی طرح لاکھوں افراد جو دنیا کے ہر گوشہ میں پھیلے ہوئے ہیں اس کام سے وابستہ ہو گئے۔

اس کام کے بانیوں نے اس کام کا مزاج ایسا رکھا کہ وہ اہل حکومت وسیاست کی نظر میں بے ضرر تھا کیونکہ انھوں نے دعوت کے صرف مثبت اور تعمیری پہلو کو اختیار کیا، اور وہ بھی انسانوں کی اصلاح اور ان کو اسلام کی اور ایمان وعمل صالح کی تعلیمات سے وابستہ کرنے کا کام ،اس طرح اس جماعت کا کسی پارٹی سے یا کسی سیاست سے کوئی تعلق یا ٹکراؤ نہیں ہوا۔اسی طرح اس سے دلچسپی لینے والوں میں ہر سطح کے اور ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوئے ،ان میں یونیورسٹیوں کے پروفیسران، تجارت پیشہ وصنعت پیشہ حضرات، دولت منداور غریب، علماء دین اور کم پڑھے لکھے لوگ، اصحاب وجاہت اور عام لوگ شریک ہوتے ہیں۔ جماعت کی غیر جانبداری کے سبب اس کے کام سے کسی کو بدگمانی یا مخالفت نہیں پیدا ہوئی۔ البتہ فکری ونظریاتی سطح پر جائزہ لینے والے اہل علم نظری سطح پر اس میں بعض وقت کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن جماعت کے اہل نظر یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ کام عوامی پیمانہ کا ہے۔ اور اس میں نظری سے زیادہ عملی کی ضرورت ہے۔ اور کسی مخصوص نظریہ کو اپنا کر اس کام کو کسی جماعت یا نظریہ کے ساتھ جانبدارانہ بنانا اس کا طریقہ نہیں ہے۔

مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کی ۳۰ سالہ امارت کا زمانہ کام کی وسعت، یکسوئی اور وقار کا حامل ہے۔ اس میں مولاناؒ کی بصیرت وتحمل، انہماک اور اصول کی پابندی پھر مولانا کا علمی وزن اور دینی مقام اور زمانہ کے حالات سے واقفیت کو بڑا دخل رہا ہے۔ مولاناؒ سے جو لوگ بھی ملتے ان کے اعلیٰ صفات اور گہرے داعیانہ انداز سے متاثر ہوتے۔ مولاناؒ امیر منتخب ہونے سے قبل ایک طرف تو سابق امیر کے ہمہ وقتی رفیق اور تمام امور میں مشیر تھے اور دوسری طرف مرکز نظام الدین میں قائم دینی درسگاہ کے ممتاز استاذ ومدرس تھے، وہ اپنے علم میں ہمہ وقت اضافہ کے شائق رہتے، نئی طبع ہونے والی کتابوں اور علمی مضامین کے مطالعہ کا بھی اشتغال رکھتے تھے۔ اسی طرح وہ مختلف النوع امور سے واقف ہوتے رہتے تھے۔ اور ان کا علمی پایہ بھی بلند ہوتا گیا تھا، جماعت کے کام سے انتہائی قرب، بانی جماعت کی تربیت اور امیر ثانی سے ہر وقت کی رفاقت کی وجہ سے کام کے نشیب وفراز سے بھرپور واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ یہ دونوں خصوصیات ان کے امیر منتخب ہونے کے بعد ان کی شخصیت کی وقعت اور صلاحیت عمل کی اہم بنیادیں بنیں۔ اور ان

کے امیر منتخب کئے جانے کی وجہ بنیں پھران کے جیسی عظیم شخصیت کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ مسئلہ سب کے ذہن کے سامنے ابھر کر آیا کہ ان کی جانشینی کس کے حصہ میں آتی ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی قائدانہ شخصیت سامنے نہ تھی، جس میں ایسی ہمہ جہتی خصوصیات ہوں جو حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ میں تھیں۔ تبلیغی کام کے مؤسس سے تربیت واستفادہ اور پھران سے عزیزانہ ورفیقانہ تعلق، پھر علمی وزن اور وقار، یہ صفات کسی ایک فرد میں نظر نہیں آتے تھے۔ چنانچہ جماعت کی شوریٰ نے امارت کا بوجھ کسی ایک فرد کے بجائے متعدد افراد پر اجتماعی طور پر ڈالا۔ ان میں خود حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کے صاحبزادے مولانا زبیر الحسن صاحب جو خاص ان کے تربیت یافتہ ہیں اور مولاناؒ کے بعض کاموں میں معاون اور معتمد رہے، پھر حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ کے پوتے مولانا محمد سعد صاحب جنھوں نے اپنے والد مولانا محمد ہارون کاندھلویؒ اور دادا مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ اور پردادا سے بعض صفات ورثہ میں پائی ہیں۔ اور دونوں نوجوانوں کے خاندانی بزرگ اور بڑے مولانا محمد اظہار الحسن صاحب کاندھلوی جو مرکز جماعت کے کاموں میں مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کے معاون خصوصی تھے، مشترکہ امارت کے ذمہ دار طے ہوئے۔ ان کے ساتھ دیگر اہم حضرات کو ایک مشاورتی کمیٹی کے طور پر شریک کیا گیا، جن میں سرفہرست تبلیغ کے عظیم خطیب مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری ہیں۔

یہ جماعت تبلیغ، ایمان وتقویٰ کی مخلص جماعت ہے۔ اس نے اپنے بہت محدود وسائل وذرائع کے باوجود اتنے وسیع پیمانہ پر امت کے بے شمار افراد کی سیرت وکردار میں تبدیلی پیدا کی۔ اور بکثرت افراد کی زندگیوں پر اثر ڈالا کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس کے اہم قائدین کے اٹھ جانے پر اس کے کام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص رحمت ومدد ہے کہ مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کی وفات کے بعد بھی یہ کام اپنی خصوصیات اور صحیح جذبہ کے ساتھ جاری وساری ہے۔ مولاناؒ کے بعد جماعت کی موجودہ قیادت اگرچہ اصلا نوجوان عنصر کے ہاتھ میں آئی ہے۔ لیکن اخلاص عمل کے ساتھ جماعت کے اہم معاونین کے مشورہ وتعاون کے ذریعہ امید ہے کہ یہ نوجوان اپنے مرحوم بڑوں کی جگہ بخوبی پر کریں گے۔

حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ

معروف عالم دین اور ربانی بزرگ مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ نے ۲۳ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ۔ مطابق ۲۸ راگست ۱۹۹۷ء کو لکھنؤ میں تعلق رکھنے والے سحر نرسنگ ہوم میں ایک مختصر سی علالت کے بعد اس دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کی، "انا للہ وانا الیہ راجعون" "للّٰہ ما اعطیٰ ولہ ما اخذ وکل شئی عندہ لاجل مسمی" ترجمہ اللہ ہی کا ہے جو اس نے دیا اور اسی کا ہے جو اس نے لیا اور ہر ایک چیز ایک مقرر مدت کے ساتھ ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو گذشتہ دنوں کی صحت میں مختلف عوارض تھے لیکن یہ عوارض ایسے نہ تھے کہ ان کو موت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا، مولانا کی رحلت بھی ان عوارض میں سے کسی عارضہ کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ اچانک پیش آجانے والے مرض فالج جو کہ دماغی رگ کے بیکار ہوجانے سے ہوئی، چند گھنٹے کا یہ عارضہ تھا اگر چہ ڈاکٹروں نے قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن چونکہ وقت موعود آچکا تھا اس لیے سب تدبیریں بیکار ہوگئیں، دنیا میں جو شخص بھی آیا ہے ایک مقرر عمر لے کر آیا ہے جو صرف خدا کو معلوم ہے اور اسی کی مقرر کردہ ہے، اس کی مصلحت بھی اسی کو معلوم ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۳ سال کی عمر پائی جو انھوں نے دین وعلم دین کی خدمت میں نہایت تندہی اور زہد واخلاص کے ساتھ گذاری، اسی کے ساتھ ساتھ مخلوق خدا کے دکھ درد کا خیال کرنے اور اپنے علم وتقویٰ کے ذریعہ ان کی مدد کرنے کو اپنا وطیرہ بنایا، وہ ایک طرف حدیث شریف ودیگر علوم کا درس دیتے تھے، دوسری طرف وعظ ونصیحت واصلاح دینی کے جلسوں اور پروگراموں میں شرکت کر کے اپنے خطاب سے فائدہ پہونچاتے تھے تیسری طرف قرآن مجید اور دعاواذکار لکھ کر مخلوق خدا کی مدد کرتے تھے، انھوں نے ایک طرف علوم دینیہ کی تعلیم کے میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا اس سلسلے میں انھوں نے ایک

بڑی درس گاہ کی بنیاد ڈالی جوان کی فکر ومحنت کا نتیجہ تھی ان کی توجہ وفکر مندی سے اس درس گاہ نے ہی ان کی زندگی میں ہی بڑی ترقی حاصل کی، اور علوم دینیہ کے استفادہ کا ایک بڑا مرکز بنی، بالکل ایک دیہات میں جہاں تمدن کی کوئی سہولت اور ذریعہ نہ ہو ایک بڑی درس گاہ قائم کردینا ایک بڑا کارنامہ ہے جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا۔

اس درس گاہ میں جو مولانا کے دیہاتی وطن، ہتھورا ضلع باندہ میں واقع ہے حفظ قرآن وتجوید وتلاوت کی خصوصی تعلیم کا بندوبست ہے، چنانچہ اس کے قیام کے وقت تک سیکڑوں اس سے فیض یاب ہو چکے ہیں، اس شعبہ میں بیک وقت دوسو طلبہ کی تعداد رہتی ہے، اس کے علاوہ علوم دینیہ کی تعلیم کا دورہ حدیث تک کا نظم ہے، جس میں کئی سو طلبہ بیک وقت استفادہ کرتے ہیں، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ خود بھی بڑی توجہ سے حدیث شریف اور دیگر اسباق پڑھاتے تھے، اور باوجود اپنے کثیر اسفار کے اپنے اسباق کو پورا کرتے اور ان کا حق ادا کرتے تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دینی ترقی کے لیے جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم کے دوران ہی وہاں کے مقتدر استاد وعالم ربانی مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ سہارنپور خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تعلق قائم کیا تھا پھر اس میں ترقی کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے، ان کی دینداری، تقویٰ اور زندگی کی کم سے کم مادی سہولتوں پر قناعت کو دیکھتے ہوئے ہر شخص ہی ان کو اللہ والی اور ربانی بزرگ سمجھتا تھا، خواص علماء ومشائخ بھی ان کو محبت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور عامۃ المسلمین میں جس کو ان سے واسطہ پڑتا ان کا معتقد ہو جاتا، ان کی طرف عوام کا بڑا رجوع تھا جس کا ایک اظہار ان کے جنازے میں ہزاروں ہزار آدمیوں کا سفر کی مشقت برداشت کر کے پہونچنے سے ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے عامۃ المسلمین کے دکھ درد میں مدد وتعاون کی یہ شکل کہ ان کے بیماروں، پریشاں حال لوگوں کو قرآن وحدیث پر مبنی تعویذ دیئے جائیں خاص طور پر اپنائی تھی اس کی وجہ سے ان پر اس ضرورت کے لوگوں کا بڑا ہجوم ہوتا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس تعاون کی بنیاد پر ان کو نیکی کی تلقین بھی کرتے اور ان کی صلاح واصلاح کا ذریعہ

بنتے، اس طریقہ سے ایک تعداد کی دینی اصلاح کا ذریعہ بنے، اور متعدد لوگوں کی زندگیاں برائی سے نیکی کی طرف پوری طرح پلٹ گئیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نرم خو، متواضع منکسر المزاج اور ہمہ وقت دینداری وعلم دین میں مشغول رہنے والے شخص تھے اپنے زمانہ کے تمام بزرگوں سے ربط رکھتے تھے، اور ان کی قدر ومحبت کے مستحق بنتے تھے۔

اس صدی کی پانچویں دہائی میں جب وہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان کے رفقاء میں دو بہت قریبی رفقاء درس مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی بستوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا سید محمد ثانی حسنی خواہرزادہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ تھے، ان تینوں کو اپنے بزرگ اساتذہ کی شفقت خصوصی طور پر حاصل تھی۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا اس زمانہ میں سہارنپور کا سفر ہوتا تھا اور یہ تینوں ان سے ملتے تھے، یہ تعلق بعد میں مزید مستحکم اور قوی ہوا، جو مولانا سید صدیق احمدؒ باندوی کے رویہ سے برابر عیاں ہوتا تھا اور مولانا مدظلہ بھی ان کی دینی خصوصیات اور صلاح وتقویٰ کو دیکھ کر اپنے دل میں مولانا مرحوم کی بڑی قدر محسوس کرتے تھے، چنانچہ ان کے سانحہ ارتحال سے بہت رنجور ہوئے، اور اس کو ایک بڑا سانحہ قرار دیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا مرحوم کے سلسلے میں جو جلسہ تعزیت منعقد ہوا اس میں مولانا مدظلہ نے اپنے اس احساس کا خصوصی اظہار فرمایا، مولانا مرحوم ندوۃ العلماء کی مجلس کی انتظامی رکن بھی تھے، ندوۃ العلماء نے اس حیثیت سے بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو ایک بڑا رنجدہ واقعہ سمجھا، اور اس کے مہتمم ومتعدد اساتذہ مع طلباء کی ایک تعداد کے جنازہ کی مشایعت کے لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وطن ہتھورا گئے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جو اہم خصوصیات تھی جو اس زمانہ میں کم لوگوں میں ہوتی ہے وہ باوجود علم وفضل ودینداری کے منکسر المزاجی اور سادہ وزاہدانہ زندگی پر قناعت تھی۔ نام ونمود سے دور اور ہمدردی وخیر خواہی ہر ایک کی اور ہر وقت اس کے لئے تیار تھے

اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ساری زندگی سفروں کی مشقت اور نجی زندگی میں مجاہدہ میں گذاری جس سے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ان کی وفات سے امت اسلامیہ کے مخلص اور خدا ترس خادموں کے دائرے میں ایک بڑی کمی واقع ہوگئی ہے جو عرصہ تک محسوس کی جائے گی، سال بھر کے اندر علماء دین صلحاء کی جماعت میں کئی شخصیتیں اپنے مالک حقیقی سے جاملیں اور امت کو ان کا خسارہ برداشت کرنا پڑا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس خسارہ کو دور فرمائے اور ملت کے ان عظیم فرزندوں اور بزرگ رہنماؤں کی حیات کو تادیر سلامت رکھے جن کا فیض امت کو حاصل ہے اور جن کی خیر و برکت جاری ہے۔

حضرت قاری صاحب نے اپنے پیچھے تین صاحبزادے مولانا قاری سید حبیب احمد صاحب، مولانا سید نجیب احمد صاحب، اور مولانا حسیب احمد صاحب یادگار چھوڑے اور چار صاحبزادیاں، بڑی صاحبزادی کے شوہر قاضی عتیق احمد صاحب رائے بریلی میں ایک انجینیرنگ کالج کے لکچرر ہیں، اس لئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے تعلق کی وجہ سے ان کی رائے بریلی آمد و رفت رہتی اور عید کے دوسرے دن بھی آنے کا معمول رکھتے ہمارے لئے وہ بڑے بھائی کے درجہ میں تھے، وہ برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مظاہر علوم سہارنپور میں رہتے تھے یہ تعلق ایسا قائم ہوا جو آخیر تک قائم رہا اور بھائی صاحب کے انتقال کے بعد ان کی شفقتیں ہم بھائیوں پر اور بڑھ گئیں اس لئے ان کا سانحہ وفات ہم لوگوں کے لئے خاندانی حادثہ سے کم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب کا حشر انبیاء وصدیقین کے ساتھ فرمائے، اور ان کی برکات کو قائم ودائم رکھے آمین۔

حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم جونپوریؒ

۲۷/اپریل ۱۹۹۹ء کو گورینی جون پور میں مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور کے بانی اور ناظم اور معروف عالم دین اور مربی و بزرگ حضرت مولانا عبدالحلیم جونپوریؒ نے اس جہان فانی سے رحلت کی۔ حضرت مولانا کا فیض صرف ان کے مدرسہ کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ ان کے ارشاد و تربیت کے عمل سے دور قریب پھیل رہا تھا، سیکڑوں بندگان خدا نے ان کی تربیت سے فائدہ اٹھایا اور اصلاح ہوئی۔

حضرت مولانا سلف کے طریقہ پر صلاح وتقویٰ وعزیمت کے حامل تھے اور اصلاح باطنی کا کام انجام دے رہے تھے۔ خاص طور پر مشرقی یوپی اور بمبئی میں ان کی صحبت ونصیحت سے بڑا اثر پڑا، اور بہت سے لوگوں نے ان سے ارادت وخصوصی استفادے کا تعلق قائم کیا۔

مولانا کی ولادت ۱۹۰۹ء میں ہوئی، شروع میں ان کو مقامی اسکول میں داخل کیا گیا تھا، لیکن ان کا اس میں دل نہیں لگا، اور وہ دینی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اور مدرسہ میں اپنی متوسط تعلیم پوری کی پھر جامعہ مظاہر علوم میں تعلیم کی تکمیل کی۔

مشرقی یوپی میں اس وقت حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کے خلیفہ مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری کا فیض تربیت عام تھا چنانچہ مولانا عبدالحلیم جونپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی ان سے وابستہ ہوئے، اور جلد ہی ان کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

مظاہر علوم کے زمانہ طالب علمی میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے تعلق رہا، اور ان سے بھی کسب فیض فرمایا اور مولانا شاہ وصی اللہؒ کی وفات کے بعد تو پورا تعلق انھیں سے ہو گیا حتیٰ کہ حضرت شیخ نے بھی خلافت سے نوازا اور جلد ہی

ان کا شمار حضرت شیخ کے بڑے خلفاء میں ہونے لگا، اور بتدریج طالبان اصلاح وتربیت کا رجوع بڑھا، اور فائدہ عام ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ بمبئی کے مسترشدین کی دعوت پر سال میں دو ایک بار بمبئی بھی تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کے حضرات کی تربیت واصلاح کے مقصد سے وہاں قیام کرتے۔

آخر عمر میں صحت بہت خراب رہنے لگی، جس کی وجہ سے بمبئی کا سفر بہت کم ہوگیا ،اور زیادہ تر قیام وطن ہی میں رہنے لگا، لوگ استفادہ وزیارت کے لیے وہیں آتے، ندوۃ العلماء کے ناظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے ساتھ بھی مولانا مرحوم کے محبانہ روابط تھے، مولانا مرحوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، اس طرح اس کے سالانہ جلسہ میں شرکت فرماتے اور اظہار تعلق فرماتے اپنے صاحبزادے مولوی عبدالعظیم صاحب کو تعلیم کے لیے بھی بھیجا، اور وہ اور ان کو ازراہِ محبت ندوی ہی کہا کرتے تھے، ندوۃ العلماء کے تعلق والوں سے محبانہ طریقہ سے ملتے اور دریافت احوال کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء کے حضرات بھی مولانا مرحوم سے خوب مانوس بلکہ پورے قدرداں تھے، ندوۃ العلماء کے لوگ آپ کی تشریف آوری کو باعث برکت وافادیت سمجھتے، حضرت مولانا علی میاں صاحب کی حالیہ علالت کی اطلاع مولانا مرحوم کو جب ملی اور ان کو پتہ چلا کہ مرض شدید اور فکر کا ہے تو دعا کا اہتمام کرایا۔ اور خود باوجود معذوری کے کسی طرح دعا کی نشست میں مسجد میں تشریف لائے اور دعا کرائی۔

مولانا مرحوم اپنے شیخ حضرت شیخ الحدیث سے ملاقات وزیارت کے لیے اعتکاف کے لیے سہارنپور جایا کرتے تھے، حضرت شیخ کے دوسرے معتقدین ومریدین بھی وہاں حاضر ہوتے، ان میں ندوۃ العلماء کے لوگ بھی ہوتے اس طرح ندوۃ العلماء کو قریب سے جاننے کا موقع مولانا مرحوم کو ملتا تھا اس سے مولانا مرحوم کو ندوۃ العلماء سے ربط بڑھا اور مولانا مرحوم مانوس ہوئے، مزید اس کی مجلس انتظامی کی رکنیت کے تقاضے سے آمد بھی بڑھی جس کی قدر اہل ندوہ کو برابر محسوس ہوئی اور اب ان کی رحلت کی خبر کو بہت ملال

سے سنا گیا، نماز جنازہ میں شرکت کے لیے حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اپنے نمائندے بھیجے جنھوں نے مولانا مدظلہٗ کی اور ندوہ کی نمائندگی کی۔ مولانا مرحوم کی تعزیت میں مسجد ندوۃ العلماء میں ایک جلسہ بھی ہوا۔

اللہ تعالیٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو آخرت میں بلند درجات سے نوازے اور قبولیت ورحمت تامہ کا معاملہ فرمائے۔ آمین۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے پسماندگان میں تین صاحبزادے چھوڑے، جن میں مولانا عبدالرحیم صاحب ان کے قائم کردہ مدرسہ کے ذمہ دار ہیں، مولوی عبدالعظیم صاحب کے ذمہ ماہنامہ ''ریاض الجنہ'' کی ادارت تھی اور بعض دوسرے کام ہیں، ان کے علاوہ مولانا کے حلقۂ ارادت واسترشاد میں ان کے تربیت یافتہ خلفاء بھی ہیں، جن میں مولانا منیر صاحب اور قاری ولی اللہ صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو حضرت مولاناؒ کا قائم مقام بنائے اور رشد وہدایت کا کام لے۔

حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ (ہردوئی)

عہد حاضر کے عظیم المرتبت بزرگ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء میں آخری بزرگ شخصیت محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ کی رحلت سے لاکھوں انسانوں کو بڑے صدمے اور عظیم سانحہ کا سابقہ پڑا ہے۔ حضرت مولانا ابرارالحق حقیؒ اپنے عظیم رفقاء میں آخری شخصیت رہ گئے تھے اور بے شمار انسانوں کو ان کی تربیت اور دینی توجہات سے فیض پہنچ رہا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور افریقہ میں ان کے لاکھوں معتقدین کو ان کی برکات حاصل ہو رہی تھیں اور اس طریقے سے ہردوئی دینی رہنمائی اور تربیت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ احیاء سنت سے ان کو بڑا شغف تھا۔ وہ سنت کے خلاف کوئی معمولی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ دینی تعلیم کی اشاعت کے لیے مدارس قائم کرنا بھی ان کا بڑا ذوق تھا۔ لوگ کثرت سے ان سے دعا لینے کے لیے پہنچتے تھے۔ اللہ کی مشیت اور اس کے فیصلے میں کوئی چارہ نہیں۔ گزشتہ مدت میں بڑی عظیم شخصیتیں رخصت ہوئیں، ان میں مولانا کی ذات والا صفات ہی اب رہ گئی تھی۔ حضرت والا سے جو شفقت وفیض پہنچ رہا تھا اور ندوۃ العلماء کے متعلقین کو بھی حضرت والا کی بڑی شفقتیں حاصل ہو رہی تھیں اس لیے میں ذاتی طور پر اور ندوۃ العلماء کی طرف سے بھی اس دینی نقصان اور خسارہ پر افسوس ظاہر کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس خلا کو پُر فرمائے۔

حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ کی تعلیم پہلے ہردوئی میں پھر مظاہر علوم سہارنپور میں ہوئی، ۱۳۵۶ھ میں دورۂ حدیث کیا، اور اپنے ساتھیوں میں سب سے اعلیٰ نمبرات حاصل کر کے کامیابی حاصل کی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے زمانۂ طالب علمی میں ہی تعلق پیدا کر لیا تھا اور تعطیل کے ایام حضرت ہی کی خدمت میں

تھانہ بھون جا کر گزارتے مظاہر علوم سے فراغت پر بطور معین مدرس کے مظاہر علوم میں ہی تدریس کے فرائض انجام دینے لگے،اس کے بعد اپنے شیخ ومرشد کے ایماء پر کانپور کے مدرسہ جامع العلوم پٹکا پور اور پھر فتح پور کے مدرسہ اسلامیہ میں تعلیم وتدریس کا کام انجام دیا،۱۳۶۲ھ سے ہردوئی میں اشرف المدارس کا نظام قائم کر کے وہیں مصروفیت اختیار کر لی اور ۱۳۷۰ھ سے مجلس دعوۃ الحق کا کام بھی شروع کر دیا،اور اجرائے مکاتب اور حفظ قرآن پاک مع تجوید کے سلسلے میں ملک وبیرون ملک میں آپ نے دورے اور سفر کر کے وہ کارنامہ انجام دیا جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا،اپنے اساتذہ کے شروع سے منظور نظر رہے،آپ کے والد ماجد مولوی محمود الحق حقیؒ کا شمار نامور اور بڑے وکلاء میں ہوتا تھا،انھوں نے ہردوئی میں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کی تھی اس کے مقاصد میں مسلمانوں کی دینی ودنیاوی تعلیم کی فکر اور یتیموں،بیواؤں کی امداد شامل تھی۔معاملات کی صفائی،حقوق العباد کا خیال کرتے اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ضرورتمندوں پر لگاتے،حضرت تھانویؒ کے مجاز صحبت بھی ہو گئے تھے،حقی نسبت حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرف ہے جن کی آپ اولاد میں تھے۔حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ ان کے پانچ فرزندوں میں سے ایک تھے۔

علمائے دین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تقویت وحفاظت کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور اُن سے اس اہم کام کے انجام دینے کے لیے جن کو اختیار فرماتا ہے تو ان کے ذریعے ایک طرف تو دینِ حق کی حفاظت اور تقویت ہوتی ہے دوسری طرف ان کے پروردگار کی طرف سے ایسے پاکیزہ اور اس کے پسندیدہ کام کے لیے انتخاب کیے جانے سے اُن کی برکت اور ان سے انسانی قلوب پر سکینت ورحمت نازل ہونے کی سبیل پیدا ہو جاتی ہے،اور غیر محسوس طریقے سے ان کی مقبولیت عام ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ سب کا مرکز توجہ بن جاتے ہیں،اُن سے استفادے کے لیے اور دلوں کے لیے سکینت حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق لوگ ان کی طرف مائل ہوتے چلے جاتے ہیں،ایسی مبارک شخصیتوں میں

سے جو کوئی شخصیت اللہ کی طرف سے مقرر کردہ اپنی مدت پوری کر کے دنیا سے رخصت ہوتی ہے تو رنج وغم کا ایک ماحول بن جاتا ہے، یہ ماحول دنیاوی طور پر آہ وبکا کا ماحول نہیں ہوتا، بلکہ دلوں کے افسردہ ہوجانے اور بے چین وغمزدہ ہوجانے کا ماحول ہوتا ہے، جس میں آخرت کی کامیابی کی فکر کرنے والے اور آخرت میں اپنی کامیابی اور سرخ روئی کے طلب گار لوگوں کے لیے تسکین خاطر اور شفائے قلب کو سخت صدمہ پیش آجانے کا واقعہ محسوس کیا جاتا ہے، گزشتہ مدت میں متعدد ایسی شخصیتیں اس برصغیر ہندو پاک میں اس عالم رنگ وبو سے رخصت ہوئیں، ان میں ہر جانے والے کے جانے پر بڑا حزن وملال محسوس کیا گیا، لیکن یہ خیال بھی ہوتا رہا کہ ایسے بندگانِ خدا ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں، کسی نہ کسی حد تک بدل مل جانے کی امیدیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ کسی عظیم شخصیت کو وہ اُٹھالیتا ہے تو اس کی تلافی کے لیے سامان مہیا فرمادیتا ہے، لیکن ادھر کچھ عرصے سے ایسا ڈر محسوس ہونے لگا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کرم میں کمی تو نہیں واقع ہورہی ہے، اور بندگانِ خدا کی اپنے رحیم وکریم مالک کی نافرمانیوں کی کثرت سے اس کی طرف سے ناراضی کی شکل میں تو ظاہر نہیں ہورہی ہے کہ اپنے ان نیک بندوں کی تعداد کو جو بے چین دلوں کی راحت کا ذریعہ بنتے ہیں، اور انسان نوازی کا خیر خواہانہ کام کرتے ہیں، بندگانِ خدا کی نافرمانیوں کے سبب کم کردینے کا ارادہ کیا گیا ہو؟ یہ بڑے فکر کی بات ہے، اللہ تعالیٰ سے ہم سب کو اس کی التجا کرنی چاہیے کہ وہ اپنی رحمت کو اور کرم کو ایسے بندوں کے ذریعے جو وہ فرماتا رہتا ہے کم نہ کرے۔

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقیؒ جن کو محی السنہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے گزشتہ صدی میں تجدید واحیائے سنت وشریعت کا بڑا کام انجام دیا تھا اور اس کام میں اپنے خلفاء کی ایک خاصی تعداد چھوڑ کر رُخصت ہوئے تھے، ان کے سب سے کم عمری میں ہونے والے اور آخری

خلیفہ تھے، اُن کو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعد خاصی مدت (۶۲-۶۳ سال) تک خدمتِ دین وشریعت کے کام کے لیے باقی رکھا، خدمتِ دین وشریعت کے کام میں وہ اپنے رفقاء کے یکے بعد دیگرے رخصت ہونے پر مرجع خلائق بن کر چلے گئے۔ اوران سے اس برصغیر کے طالبان کو اصلاح کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا موقع ملتا رہا، وہ بھی گزشتہ دنوں (۹/ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ کی شب کو ۸۷ سال کی عمر میں) اپنے بے شمار معتقدین، محبین اور مریدین کو غمزدہ چھوڑ کر اپنے خالق ومالک سے جا ملے۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ رحمۃ اللہ علیہ باوجود یہ کہ ادھر متعدد سالوں سے کچھ علالت کی حالت میں تھے، لیکن دین کی تقویت اور اصلاح وتزکیہ کا کام اسی شغف اور توجہ سے انجام دے رہے تھے، اور اس کا انھوں نے شروع سے اہتمام رکھا، اور باوجود معذوریوں کے وہ سفر بھی کرتے تھے، لوگوں کو اتباعِ سنت اور دین کے صحیح احکام پر عمل کرنے کی شدت سے تلقین کرتے تھے، اور اپنا سارا وقت اسی میں لگاتے تھے، لوگوں سے ملاقاتوں میں، اپنی مجلس میں برابران دینی کمزوریوں کی طرف توجہ دلاتے جو مسلمانوں میں بلکہ دین داروں میں بھی بے خیالی کے سبب سے پھیل گئی ہیں، اصلاحی کام میں اپنی خاص توجہ میں دوسروں سے کہیں زیادہ فکر واہتمام کرنے والے تھے، اس طرح ان کمزوریوں کا ازالہ بہت سے لوگوں سے ان کے ذریعے انجام پایا، ان کے فیض صحبت سے بہت لوگوں کو دینی اصلاح اور احکام شریعت پر پوری طرح عمل کرنے کے کام کا جو حوصلہ ملا، ان کے کاز کو اُن کے خلفاء اور ان کے مریدین نے اختیار کیا، جس کے ذریعے ان کا فیض بالواسطہ الحمدللہ جاری ہے۔ انھوں نے اپنے اصلاحی مقصد کے لیے جگہ جگہ مکاتب قائم کیے اور ان مکاتب کو چلانے کے لیے ادارے قائم کیے جو مجلس دعوۃ الحق کے نام سے کام کررہے ہیں، اور اپنے وطن ہردوئی میں ایک بڑا مدرسہ ''اشرف المدارس'' کے نام سے قائم کیا جو تعلیم دین کے مختلف شعبوں پر مشتمل ہے اور قرآن مجید کی تلاوت کی تصحیح کے کام واہتمام میں وہ اپنی خاص شہرت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کو امتِ اسلامیہ کی طرف سے بہت

بہت جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی محنتوں کا عظیم صلہ عطا کرے، اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور کے اخلاف کو ان کی برکات سے پوری طرح مستفید فرمائے اور لوگوں کو ان کے اخلاف سے خاص طور پر ان کے جانشین محترمی جناب حکیم کلیم اللہ صاحب (اطال اللہ بقاء) کو جو ان کے داماد بھی ہیں، ان کے بزرگ پیش رو کے طریقے پر فیض عطا فرمائے۔

ادھر چند برسوں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء اور حضرت مولاناؒ کے درمیان قریبی ربط قائم ہو گیا تھا اور یہ تعلق حضرت مولانا علی میاںؒ کے انتقال کے بعد اور بڑھ گیا تھا اور وہ ہم لوگوں کی اور اہل ندوہ کی سرپرستی فرمانے لگے تھے، ایک موقع پر وہ کسی وجہ سے ندوہ تشریف نہ لا سکے ہم لوگوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت کی ندوہ تشریف آوری ہو جاتی فرمایا ہاں ندوہ میں تو جسمانی راحت بھی ملتی ہے روحانی راحت بھی ملتی ہے۔

حضرت مولانا ندوۃ العلماء تشریف لاتے اور بڑے انشراح کے ساتھ طلبہ و اساتذہ سے خطاب فرماتے، طلبہ و اساتذہ کو بھی حضرت مولانا سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملتا، اس طرح حضرت مولانا کی وفات پر اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد نے ہردوئی کا سفر کر کے جنازے میں شرکت کی سعادت حاصل کی اور ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں اور اساتذہ نے خطاب کیا اور حضرت والا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی کہ کس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو قیمتی بنایا، اور بندوں کے اپنے خالق و مالک سے رشتہ مضبوط کرنے اور بندوں کے بندوں کے ساتھ صحیح تعلق قائم کیے جانے کے لیے وعظ و نصیحت اور اصلاح و تربیت کے ذریعے اپنی ذمہ داری انجام دی۔ اور ایک بامقصد اور مفید زندگی گزار کر رخصت ہوئے، اور اس طرح رخصت کیے گئے کہ چہرہ ان کا ہشاش بشاش تھا، جیسے وہ اپنی دینی و دعوتی مساعی پر اپنے رب کے انعامات دیکھ کر مسرور ہو رہے ہوں۔ غفر اللّٰہ لہ وأدخلہ فی جنت النعیم مع الصدیقین و الشہداء و الصالحین الأبرار الأخیار۔

حضرت شاہ نفیس الحسینی نفیس رقم لاہوریؒ

رشد وہدایت وتزکیہ وارشاد کی حامل ایک عظیم شخصیت مزید ہم سے جدا ہوگئی علم وعرفان کا یہ چراغ ۵/فروری ۲۰۰۸ء کو لاہور (پاکستان) میں گل ہوگیا، "کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام"۔

یہ شخصیت سید شاہ نفیس الحسینی کے نام سے معروف ومشہور تھی۔ سید شاہ نفیس الحسینی سہ گونہ پہلوؤں میں باکمال خصوصیت کے حامل تھے، ان کی خصوصیت کا آغاز خطاطی کے اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوا تھا، اور اس میں جو ان کو امتیاز حاصل تھا وہ حسن تحریر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت پسندیدہ تھا۔

ان کی دوسری خصوصیت ان کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی صلاحیت شعر گوئی تھی جس میں خوش ذوقی اور برجستگی اور دلی جذبات کی ترجمانی پائی جاتی تھی، غزل جو ہماری اردو شاعری کی جان سمجھی جاتی ہے اصحاب ذوق اپنے قلبی احساسات سے ترجمانی کے لیے اس کو اختیار کرتے ہیں وہ ہم کو حضرت نفیس الحسینی کے کلام میں بھی نمایاں ملتی ہے، ان کے کلام کو دیکھ کر حسن ادا اور ندرت خیال کا پتا چلتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کے دینی جذبے نے ان کی شخصیت میں تیسرے پہلو کو نمایاں کر دیا اور وہ پہلو حبّ رسول وحبّ آل رسول اور حبّ اصحاب رسولؐ اور پھر اولیائے امت سے محبت وشیفتگی کا پہلو ہے، اسی پہلو کے تحت ان کا تعلق مرشدِ وقت حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے ہوگیا اور اس تعلق نے تیزی کے ساتھ ترقی کر کے گہری وابستگی کی شکل اختیار کر لی اور جلدی ان کو اپنے شیخ کا اعتماد حاصل ہوگیا۔

حضرت شاہ نفیس الحسینی خاندان حضرت گیسو دراز کے فرد ہیں، اور نسبی سلسلے میں سیدنا حضرت حسینؓ تک پہنچتے ہیں۔ یہ دونوں تعلق جو نسبی حیثیت رکھتے ہیں یہ نسبی سے بڑھ کر دینی جذبے سے بھی معمور بنے، اس طریقے سے جو خاندانی انتساب انھیں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے اس انتساب کی ان کے دل میں بڑی قدر رہی اور اسی وجہ سے انھیں ان سے اور اپنے اسلاف سے بڑی عقیدت رہی اور اس عقیدت کو بھی ان کے دینی رجحان کے بڑھانے میں بڑا دخل رہا جس کا انھوں نے اظہار بھی کیا ہے اور اس عقیدت کی ترجمانی ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کو تین رخوں سے دیکھا اور پہچانا جانے لگا۔ ان کو اگر تصوف وارشاد کے زاویے سے دیکھا جائے تو وہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے فیض کے حامل نظر آتے تھے، محبتِ رسول اور محبتِ آل رسول کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس میں بھی محبت ووارفتگی پوری طرح جھلکتی نظر آتی ہے، جو نسبی تعلق کی وجہ سے اور بھی اثر انگیز بن گئی ہے۔ ان اگر شاعرانہ پہلو سے دیکھا جائے تو وہ استادانہ مقام پر فائز نظر آتے ہیں، غزل ہو یا منقبت ہو، یا شاعری کی دینی صنف یعنی حمد ونعت ہو، حب رسول ﷺ ہو، دلکش اندازِ کلام ملتا ہے، اور ایک بڑی خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ فکر کی بلندی اور وارداتِ قلب کی اثر پذیری بھی گویا تیز ہے۔ اور اسی خصوصیت کی راہ سے ان کو امت کے سلسلے میں پیش آنے والے دل دکھانے والے حالات کا احساس بھی ان کی اپنی شاعری میں جھلکنے لگا، اور ان کی شاعری کا موضوع بنا، ان کی شاعری میں ان کے قلب کی دردمندی اور اپنی محبوب شخصیتوں سے ان کی محبت نے ایک عاشقانہ انداز پیدا کر دیا ہے، اس عاشقانہ انداز میں ان کا دینی جذبہ شاعری کی بے باکانہ رویہ سے ان کو بچاتا بھی رہا ہے، اسی لیے برجستگی کلام اور اس کے ساتھ احتیاط جو ایک طرح مشکل عمل ہے ان کے یہاں ملتی ہے، ان کے دیوان کے تعارف میں علامہ محمد تقی عثمانی صاحب نے خوب لکھا ہے:

''عشق وشاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جب دل میں عشق کی آگ سلگتی ہے تو اس کا دھواں شعر کے سانچہ میں ڈھل جاتا ہے، حضرت نفیس شاہ صاحب مدظلہم کی شاعری اور حقیقت اسی عشق کے دھویں سے عبارت ہے، لیکن عشق اگر مجازی ہو تو اس کے دھویں میں نہ جانے کتنی کثافتیں شامل ہوجاتی ہیں۔''

وہ عشق جس کی آگ بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپش انتظار کا

حضرت نفیس شاہ صاحب کا عشق چونکہ حقیقی ہے اس لیے اس کا دھواں ان کثافتوں سے پاک اور لطافتوں کا وہ دلآویز مجموعہ ہے جس کی پاکبازی کی قسم کھائی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بلندیِ خیال اور سوز وگداز کے ساتھ حسن اظہار کا وہ سلیقہ بھی عنایت فرمایا ہے جسے کہنے والوں نے ''سحر حلال'' سے تعبیر کیا ہے: "وإن من البیان لسحراً" (ماخوذ از مقدمہ برگ گل)

علامہ عثمانی نے اس سلسلے میں مثال کے طور پر ان کے یہ چند شعر بھی دیے ہیں، ملاحظہ ہو:

کیوں شکوہ غم اے دلِ ناشاد کرے ہے — اک غم ہی تو ہے جو تجھے آباد کرے ہے
دل محوِ محبت ہے اسے کچھ نہیں پروا — آباد کرے کوئی برباد کرے ہے
پاوے ہے وہی عشق سرفرازیِ عالم — جس عشق پہ وہ حسن ازل صاد کرے

حضرت نفیس الحسینی کے یہاں عشق رسول ومحبت بزرگانِ دین پر مشتمل اچھا خاصا کلام ملتا ہے۔

مدحِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہو:

ملائک ساتھ ہیں دامن سنبھالے — حرا سے آرہے ہیں کملی والے
اُمڈ آئے ہیں بادل کالے کالے — مرا ایمان ساقی کے حوالے

تجھے اے وحشت دل دینے والے — دعائیں دے رہے ہیں دل کے چھالے
زکوٰۃ حسن جاناں بٹ رہی ہے — گدائے عشق! قسمت آزمالے

اور مدینہ طیبہ کی نسبت سے:

اللہ رے یہ وسعت آثار مدینہ — عالم میں ہیں پھیلے ہوئے انوارِ مدینہ
روشن رہیں دائم در ودیوار مدینہ — تاحشر رہے صرفی بازار مدینہ
ہے شہر نبی آج بھی فردوس بداماں — جاری رہے وُہی موسم گلبار مدینہ
پھرتے ہیں تصور میں وہ پُر کیف مناظر — تاحدّ نظر ہیں گل وگلزار مدینہ

ملاحظہ ہو:

الٰہی! محبوب کل جہاں کو، — دل وجگر کا سلام پہنچے
نفَس نفَس کا درود پہنچے، — نظر نظر کا سلام پہنچے
بساطِ عالم کی وسعتوں سے، — جہان بلا کی رفعتوں سے
مَلَک مَلَک کا درود اترے، — بشر بشر کا سلام پہنچے
ملائکہ کے حسیں جلو میں، — سحر سحر کا سلام پہنچے
زبان فطرت ہے اس پہ ناطق، — ببارگاہِ نبیؐ صادق
شجر شجر کا درود جائے، — حجر حجر کا سلام پہنچے

اور اصحاب سیدنا محمد رسول اللہ (ﷺ) کو نذرانۂ عقیدت یوں پیش کرتے ہیں:

اصحاب محمد ﷺ حق کے ولی — ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ
یارانِ نبیؐ میں سب سے جلی — ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ
وہ شمع حرم کے پروانے — وہ ختم رُسُل کے دیوانے
ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ — ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ
اسلام نے جن کو عزت دی — اسلام کو قوت جن سے ملی

ایماں کی روایت جن سے چلی ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ
ترتیب خلافت بھی ہے یہی ترتیب فضیلت بھی ہے یہی
لگتی ہے یہی ترتیب بھلی ابوبکرؓ وعمرؓ، عثمانؓ وعلیؓ

صحابہ کرام اور اہل بیت رسول کی نسبت سے ان کے جذبات ملاحظہ ہوں:

جس قلب میں یارانِ نبیؐ کی ہو عقیدت کھلتے ہیں اسی قلب پہ اسرار مدینہ
معمور صحابہؓ کی محبت سے رہے گا وہ سینہ کہ مہبطِ انوار مدینہ
وہ آل محمدؐ ہوں کہ اصحاب محمد ﷺ ہیں زینتِ دربار دُرَربار مدینہ
نسبت نہیں شاہوں سے نفیس اہل نظر کو
کافی ہے انھیں نسبت سرکارِ مدینہ

اسی طرح حضرت حسین نواسۂ رسول اللہ ﷺ کے تذکرے میں کہتے ہیں:

لایا جو خون رنگ دگر کربلا کے بعد اونچا ہوا حسینؓ کا سر کربلا کے بعد
پاسِ حرم، لحاظ نبوت، بقائے دیں کیا کچھ تھا اس کے پیش نظر کربلا کے بعد
اے رہ نوردِ شوق شہادت ترے نثار طے ہوگیا ہے تیرا سفر کربلا کے بعد
آباد ہوگیا حرم رب رسولؐ کا ویراں ہوا بتولؓ کا گھر کربلا کے بعد
ٹوٹا یزیدیت کی شب تار کا فُسوں آئی حسینیت کی سحر کربلا کے بعد
"قتل حسینؓ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

اور ایک بڑا بلیغ شعر ہے:

کلیوں پر کیا گزر گئی پھولوں کو کیا ہوا گلزار فاطمہؓ کی بہاروں کی بات کر

قومی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

برطانیہ اچھا نہ فرنگی بہتر لندن سے کراچی کا کورنگی بہتر

واللہ میرا اس پہ یقیں ہے کہ نفیس گورے سے میرے ملک کا بھنگی بہتر

اور کہتے ہیں:

مشرق سے ابھرتے سورج کو ذرا دیکھ پھر سرگزرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہر روز سبق دیتا ہے عبرت کا یہ منظر مغرب میں اترتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

دنیا کی صورتحال کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں:

کہاں دنیا کے فرزانے گئے ہیں جہاں تک دیں کے دیوانے گئے ہیں
یہ دور ابتلا استغفر اللہ! بہت سے دوست پہچانے گئے ہیں

حضرت شاہ نفیس الحسینیؒ اپنی اس سہ جہت خصوصیت وکمال کی بنا پر مختلف طبقات میں محبوب بن گئے تھے۔ ایک طرف وہ اہل ذوق حضرات تھے جو ان کی شاعری سے لطف لیتے تھے، دوسری طرف وہ حضرات تھے جو ان کے اخلاق عالیہ اور جذبہ ومحبت اور تواضع کے گرویدہ تھے، تیسری طرف ان کا تصوف وارشاد بڑھتے بڑھتے ان کی خانقاہ کے قیام تک پہنچ گیا تھا، جس سے مسترشدین اور معتقدین اپنی اپنی دینی پیاس بجھاتے تھے، اور اس طرح ان کی شخصیت ہمہ جہت سطح پر مقبول ہوگئی تھی اور ان کے پیش رو مرشدین عظام کے بتدریج کم ہوتے جانے سے مرکز ارشاد بن گئی تھی، لاہور میں ان کی خانقاہ آباد ہوئی، اور مرکز رشد وہدایت بنی، جہاں ان کے معتقدین جمع ہوتے اور استفادہ کرتے، جس میں اصحاب فضل وکمال اور اچھی حیثیتوں کے لوگ بھی ہوتے اور عوام الناس بھی۔

ان کو اپنے سے پہلے کے بزرگوں سے والہانہ تعلق تھا، اور ان کی نسبت سے برابر لوگوں میں ان کی عقیدت کی روح بیدار کرتے تھے، حضرت سید احمد شہیدؒ سے بے پایاں محبت وعقیدت رکھتے تھے، حتی کہ ان کے نام سے ایک اکیڈمی بھی قائم کی اور ان سے متعلق ملفوظات ومکتوبات پر مشتمل کتابیں شائع کیں، جس میں خصوصیت سے ''وقائع سید احمد شہیدؒ'' قابل ذکر ہے، اس طریقے سے انھوں نے حضرت سید صاحب سے اپنی بے پایاں عقیدت کا اظہار کیا۔

اسی تعلق سے اور اپنے شیخ ومرشد حضرت عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کی نسبت سے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بھی بڑی محبت رکھتے تھے، اور ایسی محبت جس سے عقیدت کا اظہار ہوتا تھا، حضرت مولاناؒ کی بعض کتابیں جن میں خصوصیت سے ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' اور ''المرتضیٰ'' قابل ذکر ہیں اور اپنی خانقاہ کا انتساب بھی انہی کی ذات والا برکات کی طرف کیا، بڑے اہتمام سے شائع بھی کرائیں اور عام کیں۔

ان کی حضرت شہید اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے تعلق کے ضمن میں اس کاتب الحروف سے بھی شفقت ومحبت کا تعلق تھا، جس کا مجھے علم غائبانہ بھی ہوتا رہا، اور ایک حج کے موقع پر (غالباً ۲۰۰۲ء میں) مکہ مکرمہ میں ایک ہی جگہ مدرسہ صولتیہ میں قیام کی سعادت بھی ملی اور ان کی محبت کا اور تعلق کا فائدہ حاصل ہوا۔

اور انھی نسبتوں اور تعلق کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے انھیں تعلق تھا اور اس ادارے کے فرزندان پر بھی شفقتیں فرماتے اور دعاؤں کا اہتمام کرتے، اللہ تعالیٰ انھیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

سید شاہ نفیس الحسینیؒ مارچ ۱۹۳۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان کا قیام اور تعلیم وتربیت کا میدان لاہور رہا اور وہیں وفات پائی اور اپنی خانقاہ جسے انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے نام سے موسوم کیا ہے کے احاطے میں مدفون ہوئے، ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ حضرت سید نفیس الحسینی کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے، اور ان کے سلسلہ ارشاد وتربیت سے منسلک لوگوں کی تربیت وتکمیل فرمائے، آمین۔

حضرت قاری امیر حسن مظاہریؒ

ہندو پاک کی ملت اسلامیہ میں گذشتہ صدی کے عہد میں قائدانہ و مرشدانہ مقام کی حامل متعدد عظیم شخصیتوں کو ملت کی سرپرستی اور اصلاح وارشاد میں خصوصی مقام حاصل رہا، اور انہوں نے ملت اسلامیہ کی اصلاح وارشاد کے ساتھ عمومی رہنمائی اور قیادت کا فرض بھی انجام دیا، یہ شخصیتیں ایک ایک کر کے اٹھتی گئیں، اور ملت اسلامیہ ان کی سرپرستی سے محروم ہوتی گئی، قریبی عہد کی بزرگ شخصیتوں میں ایک شخصیت حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رہی، جو ابھی حال میں اس دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف منتقل ہو گئے، ان کی ارشاد واصلاح کی کوششوں سے دور وقریب کے علاقوں میں فیض پہونچا، وہ ایک مشفق مربی اور محترم المقام عالم دین کی حیثیت سے خدمت دین کا فریضہ پورے اخلاص کے ساتھ انجام دے رہے تھے، ان کو اپنے وقت کے بزرگوں سے جو فیض ملا تھا، وہ خاموشی و ہمدردی کے ساتھ عام کر رہے تھے، قاری صاحب حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے تھے، قاری صاحبؒ نے حضرت رائے پوریؒ سے اپنی بیعت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

جب مدرسہ مظاہر العلوم میں ۱۳۵۵ھ میں داخل ہوا، حضرت قدس سرہ کو جانا، پھر بھی کیا جانا، عمر غفلت کی تھی، بیداری نہ ہونے میں عام طلباء کی طرح غافل رہا، مالک کا فضل وکرم ہوا، بغیر استحقاق کے فراغت کے درمیان رائے پور کی حاضری مولوی عبد المنان صاحب کے ہمراہ جو حضرت رائے پوری کے خادم تھے، ہوئی اور میں خالی الذہن تھا، یوں ہی ساتھی ہونے کے لحاظ سے چلا گیا، تو حضرت نے فرمایا ان کو کیوں لائے؟ میرے پاس تو دیہاتی آتے ہیں، یہ مولوی صاحب کو کیوں لائے؟ تو میں نے عرض کیا حضرت! میں بھی

دیہاتی ہوں، پھر حضرت سے بیعت کی درخواست کی، تو حضرت نے بیعت فرما لیا، اور صرف ایک تسبیح درود شریف کی بتلا دی۔

اسی درمیان میں مرشدنا حضرت شیخ قدس سرہ کی خدمت میں گاہے گاہے حاضری دیتا، اور حضرت کی شفقت میرے اوپر بغیر استحقاق کے ہوتی گئی، میری یکسوئی اور رائے پور کی حاضری میں الگ تھلگ رہنے اور کام کرنے سے حضرت نے بہت خوشی کا اظہار مجھ سے ایک مرتبہ کیا، اس طرح دونوں بزرگوں سے ربط بڑھتا گیا، پھر حضرت رائے پوریؒ کے وصال کے بعد مرشدنا حضرت شیخ قدس سرہ سے رجوع ہوا، تو تجدید بیعت کی درخواست کی، تو سنتے رہے، جب زیادہ اصرار کیا، تو شدت سے منع فرمایا کہ:

''میں حضرت مدنیؒ اور حضرت رائے پوریؒ سے جو لوگ بیعت ہیں، دوبارہ بیعت نہیں کرتا ہوں، البتہ خدمت کے لیے حاضر ہوں، اور جو معمولات حضرت رائے پوریؒ نے بتلائے تھے کرتے رہو'' اور معمولات ہی کیا تھے، یوں کہا تھا: کلمہ طیبہ جتنا آسانی سے پڑھ سکو مقرر کر لو، اسی طرح درود شریف''۔

یہ ناکارہ گاہے گاہے اپنا حال حضرت رائے پوریؒ کے وصال کے بعد مرشدنا حضرت شیخ کو لکھتا رہا، حق تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ یہ دونوں بزرگ اس ناکارہ بندہ سے محبت فرماتے رہے، ایک مرتبہ حضرت رائے پوریؒ نے پوچھا، تم کتنے بھائی ہو؟ میں نے عرض کیا حضرت میرا کوئی بھائی نہیں ہے اکیلا ہوں، فرمایا۔ میں تمہارا بھائی ہوں۔

قاری صاحب کو حضرت شیخ الحدیث کی صحبت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا، اور حضرت شیخ کی نیک توجہات حاصل رہیں، اور حضرت شیخ نے ان کو خصوصی انداز سے اپنی خلافت دی تھی۔

فرماتے ہیں۔ مؤرخہ ۲۸ رمضان بروز جمعہ قبل اذان عصر ۱۳۵۸ھ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا، احقر سراپا تقصیر کو مرشدی و مولائی حضرت اقدس نے بھائی ابوالحسن صاحب

کے ذریعہ اپنے معتکف میں طلب فرمایا، احقر حاضر خدمت ہوا، تو ارشاد ہوا کہ یہ جبہ پہن لو، جو حضرت کا مستعملہ تھا، خوشبو بے انتہا تھی، کئی مہینہ تک رہی، چنانچہ حسب ارشاد پہن لیا، پھر ارشاد فرمایا کہ آج سے تمہیں بیعت کی اجازت دیتا ہوں، یہ امانت ہے حفاظت کرنا۔

نوٹ۔ اس معاملہ سے ناکارہ کو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، حتی کہ سکتے میں آگیا، اور شام تک مبہوت سا رہا، حتی کہ بخار کی کیفیت طاری ہوگئی، یہ سب کچھ حق تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں ڈالا، اس لیے یہ صورت ظاہر ہوئی۔

قاری صاحبؒ کچھ مدت بعد اپنی علمی وعملی زندگی کے فرائض کی ادائیگی کے لیے حضرت مولانا ابرارالحق حقیؒ کی درسگاہ دعوۃ الحق ہردوئی آگئے تھے، وہاں انہوں نے مولانا ابرارالحق حقیؒ کی رفاقت میں ان کی درسگاہ علم وارشاد میں پہونچ کر پوری عمر لگادی، مولانا ابرارالحق صاحب کی وفات پر بھی انہوں نے درسگاہ کو نہیں چھوڑا، بلکہ اپنی فیض رسانی اس درسگاہ میں جاری رکھی، اور مولانا ابرارالحق صاحب کے جانشین حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب مدظلہ کے ساتھ ان کی رفاقت تھی، اس طرح دونوں بزرگوں نے ارشاد وتربیت دینی کا فیض جاری رکھا، قاری امیرالحسن صاحب ضعف پیری کے باوجود دینی تعلیم وارشاد کے کاموں میں لگے رہے، بالآخر نوے ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، ان کی وفات سے اس علم وتربیت کے کاموں میں خسارہ ہوا۔

حضرت قاری صاحب کی بزرگی، ان کی سادہ مزاج طبیعت سے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے، وہ سب سے تواضع اور محبت سے ملتے تھے، رمضان کا مہینہ پابندی سے میل وشارم (تامل ناڈو) میں اپنے سیکڑوں مسترشدین کے ساتھ گذارتے تھے، اس طرح جنوبی ہند کے خطہ میں بھی ان کا فیض جاری ہوا، ان کو دیکھ کر اور مل کر ملنے والے کو عقیدت کا خاص احساس ہوتا تھا۔

حضرت قاری صاحبؒ شمالی بہار کے ضلع سیوان کے رہنے والے تھے، انہوں

نے تعلیم مظاہر العلوم میں حاصل کی تھی، اور طالب علمانہ زندگی سے ہی اپنے قرب و جوار میں وقت کے بزرگوں کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے، اور ان سے متاثر ہوتے تھے، بزرگان وقت بھی ان کے ساتھ شفقت اختیار کرتے ہوئے ان کے لیے نیک توقعات رکھتے تھے، جو کہ عمل میں آئیں، حضرت قاری صاحب ایک عالم دین اور شیخ وقت کے طور پر ملت کے افراد کی اصلاح کے کام میں لگے، اور ان کے ذریعہ بہت سوں کی اصلاح ہوئی، ان کے دو صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوئیں، صاحبزادوں کا انتقال خود ان کی زندگی میں ہوا، اس کے غم کو انہوں نے پورے ضبط نفس کے ساتھ برداشت کیا، ان صاحبزادوں کی اولاد بڑی ہوکر اپنے والد کی قائم مقام ہوئی، اور حضرت قاری صاحب کو ان سے تقویت حاصل ہوئی، قاری صاحب اپنے سے استفادہ کرنے والوں کو اچھے اور ہمدردی کے انداز میں نصیحت کرتے تھے، اور نہایت صالح اور نیک طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے صلاح وتقویٰ کے ساتھ زندگی گذارتے تھے، اب اپنے مالک حقیقی کے پاس پہونچ کر ان کو ان سب باتوں کا صلہ مل رہا ہوگا۔

حضرت قاری صاحب کا سانحہ ارتحال ۲۴ر فروری ۲۰۱۲ء کو ممبئی میں پیش آیا جہاں وہ علاج کے لئے چند روز سے مقیم تھے جمعہ کا مبارک دن تھا اور اس کی مبارک شب کا آخری حصہ ان کی عمر ۹۰ کے قریب تھی یا اس سے کچھ زیادہ رہی ہوگی ممبئی میں ہی تدفین عمل میں آئی اور ان کی وصیت کے مطابق ان کے پوتے مولوی قطب الدین صاحب (جنہیں چند روز قبل قاری صاحب نے خلافت بھی دی تھی اور وہ مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہیں) نے نماز جنازہ پڑھائی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت ورحمت کا بلند مقام عطا فرمائے، اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر عظیم عطا فرمائے۔

(۲) مفکرین وقائدین ملت

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
(۲) قاضی عدیل عباسیؒ
(۳) مولانا شاہ سید منت اللہ رحمانیؒ
(۴) مولانا شاہ ابوالسعود احمد باقویؒ
(۵) مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ
(۶) جناب ابراہیم سلیمان سیٹھؒ
(۷) مولانا سید اسعد مدنیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

عالم اسلام کے عظیم مفکر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کے ایک اسپتال میں وفات پائی، وہ عالم اسلام کی عظیم شخصیت تھے، فکر اسلامی کی تشریح اور اسلام کے جامع نظام حیات کی توضیح کے سلسلے میں انھوں نے جو تحریری کاوشیں کیں، ان کا مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے فکری و اجتماعی تصورات پر غیر معمولی اثر پڑا، ان کی کتابوں کے ترجمے آج عالم اسلام کی تقریباً تمام رائج زبانوں میں ہو چکے ہیں اور دنیائے اسلام میں ان کے افکار و تشریحات کو اسلامی نظریات میں اہم مقام حاصل ہو چکا ہے۔

مولانا نے اسلامی ذہن کی رہنمائی اور فکر اسلامی کی موثر تشریح کا جو کارنامہ انجام دیا وہ اس عہد کا ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے، مولانا نے وقت کے ایسے اہم اور سنجیدہ مسائل میں جن میں مغربی فکر و تہذیب نے اپنی ملمع سازی سے نئے تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں کو بہت متاثر کر رکھا تھا اور جن کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ نسل کی ذہنی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مغربی زعماء و مفکرین کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی جا رہی تھی، اسلام کی ایسی علمی تشریح اور وکالت کی جس سے عالم اسلام کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو بہت سے افراد کی ذہنی عقیدت، مغرب کے سحر انگیز افکار کی آفت سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئی اور بہت سے افراد جو اسلام سے برگشتہ ہو چکے تھے اسلام کی اس طاقتور ترجمانی کے باعث اسلام کی آغوش میں دوبارہ آ گئے۔

مولانا کی تصنیفات میں سے ''الجہاد فی الاسلام'' نے بہت سے بھٹکتے ہوئے مسلمان ذہنوں میں تلاطم پیدا کیا پھر مولانا کی کتاب ''پردہ'' نے مغربی فکر و تہذیب کے اثر کو کمزور کیا، یہ وہ

زمانہ تھا جب برصغیر ہند میں ملک وقوم کے خیر خواہ مغربی استعمار سے سیاسی میدان میں نتیجہ آزمائی کر رہے تھے، ان کو اس میدان میں بڑی حد تک کامیابی حاصل ہونے کی امید بھی تھی، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدن کے سامنے جدید تعلیم یافتہ ذہن ایسا مرعوب تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے سیاسی میدان میں مسلمانوں کی سیاسی فتح اچھے دوررس نتائج کی حامل نہ ہوسکی کیونکہ تہذیبی وفکری میدانوں میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑتا، اور یہ شکست نتائج کے لحاظ سے سیاسی میدان کی شکست سے زیادہ اثر انگیز اور تباہ کن ثابت ہوئی، ایسے وقت میں مسلمان اہل علم وفکر نے اپنے اپنے طریقہ سے کچھ کوششیں شروع کیں، ان میں علامہ شبلیؒ نے اسلام کی تاریخی عظمت کو اپنی تحقیق وتصنیف کا مرکز بنایا، پھر ان کے شروع کئے ہوئے کام کو ان کے شاگردوں اور ان کے قائم کئے ہوئے ادارہ دارالمصنفین نے کامیابی اور خوبی کے ساتھ آگے بڑھایا ان میں ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اکبرالہ آبادیؒ نے اپنی ظریفانہ شاعری کو مغرب سے مرعوب ذہن کی اصلاح کی کوشش کا ذریعہ بنایا، ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے اسلامی تخیل وذہن کی عظمتوں کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی طاقتور شاعری سے کام لیا، اور تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں میں اسلامی خود اعتمادی کا صور پھونکا مولانا ابوالکلام آزاد نے بلند حوصلگی پیدا کرنے کے لیے اپنی سحر انگیز ادیبانہ نثر کا سہارا لیا، لیکن عصر جدید کے ذہن کے مطابق علمی انداز کے ساتھ شستہ وفکر انگیز اسلوب میں اسلامی فکر کی ترجمانی کا کام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شروع کیا اس کے لیے انھوں نے ایک ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' نکالا اور پھر اپنے نوتشکیل فکری منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی، جس میں وہ اہل فکر، اہل دانش شریک ہوئے جنھوں نے مولانا کی ترجمانی کی طاقت واہمیت کو محسوس کیا، ان میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے افراد کی قابل ذکر تعداد تھی اور علم دین کے حاملین کی شرکت بھی تھی، مگر یہ شرکت اس طرح نہ قائم رہ سکی جیسی شروع میں کی گئی تھی، چنانچہ بعض مقتدر علمی ودینی شخصیات نے ان کے طریقۂ کار اور فکر وعمل سے اختلاف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کرلی۔

دراصل مولانا نے اپنے فکری کام کو جس محاذ سے شروع کیا تھا وہ مغربی فکر وتمدن کے

لائے ہوئے نشوں کے مقابلہ کا محاذ تھا اور اس میں مولانا کے فکری جہاد کا غیر معمولی اثر ہونا شروع ہوا تھا اور اسی کے ذریعہ مولانا کی صلاحیتوں اور ان کے کام کی اثر پذیری کا دنیا کو اندازہ ہوا، جب کام نے زیادہ منظم شکل اختیار کی تو مولانا نے اپنی فکری کاوشوں کو کئی محاذوں تک پھیلایا، ان میں سے ایک محاذ فقہی وکلامی تھا اور ایک سیاست واقتدار کا محاذ تھا، مولانا نے اپنے اس طریقۂ کار سے عہد حاضر کے لائے ہوئے مسائل کے جواب میں اسلام کو ایک جامع اور مکمل دین اور نظام حیات کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بعض امور میں وہ علماء اور متعدد اہل علم رفقاء کی تائید برقرار نہ رکھ سکے۔

لیکن مولانا کی ایک عظیم صفت یہ رہی کہ وہ مشکلات کے باوجود اپنے ذہن کے مطابق طے کئے ہوئے نظریہ ونظام کو بروئے کار لانے کے لیے نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ لگے رہے، اس کے نتیجہ میں ان کے فکر نے تھوڑے ہی عرصہ میں عالم اسلام کے بڑے حصہ میں اپنے قدرداں اور ماننے والے بنا لیے، مولانا کی کتابوں کے ترجمے مختلف ممالک میں پھیل گئے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں برصغیر سے باہر بھی خاص طور پر عالم عربی میں مولانا کی فکری رہنمائی کو سراہا گیا، اور ان کی کتابوں سے استفادہ کا شوق بڑھا، اس وقت عالم اسلام کے مختلف خطوں میں نئی تعلیم یافتہ مسلمان نسل مولانا کی عظمت کی بہت معترف ہے۔

مولانا نے عہد حاضر کی جاہلیت پر مدلل تنقید کی اور اسلام ونظام اسلام کو انسانیت کی مشکلات کا صحیح حل بتایا، مولانا نے اس سلسلے میں جو اسلوب بیان اور استدلالی انداز اختیار کیا وہ طاقت واثر سے بھرپور تھا، اس کی زبان ووطرز استدلال زمانے کے ذوق فہم سے ہم آہنگ تھے۔ اسی لیے ان کی تحریں اور مضامین بہت دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے، اور ان کا اثر بہت موقعوں پر پڑھنے والوں کے ذہنوں کی یکسر تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوا، مغربی افکار وتمدن کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی باریک بینی اور خوش اسلوبی کو بہت تسلیم کیا گیا، اور اس نے ان کے نتائج فکر میں بڑا وزن پیدا کیا، ان کی مایہ ناز تصنیف ''پردہ'' نے تو اس کے پڑھنے والوں پر صرف ذہنی اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ متعدد لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی بھی پیدا کردی۔

سیاست وحکومت کے سلسلے میں اپنے خیالات کو بروئے کار لانے کے جو جدوجہد انھوں

نے کی اس نے کچھ ذہنوں میں غلط فہمی پیدا کی اور وہ ان کے متعدد رفقاء کار کے ان سے اختلاف کا سبب بنی، اس طرح دین کے اساسی مسائل کے سلسلے میں بعض نصوص سے انھوں نے جو مفہوم اخذ کئے ان سے متعدد راسخ العلم علماء کو اتفاق نہیں ہوسکا، اور اس کی وجہ سے طبقۂ علماء سے مولانا کی کشیدگی کی صورت پیدا ہوگئی، مزید یہ کہ مولانا کے ان خیالات کا اثر ان کی تحریک کے چلانے والوں کے یہاں بھی ظاہر ہوا، ان باتوں کی وجہ سے مولانا کی عظیم فکری شخصیت مسلمانوں میں غیر متنازعہ شخصیت نہ بن سکی، مولانا نے نئے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں پر جو اثر ڈالا تھا اور جو اپنی ہمہ گیری اور طاقت کے لحاظ سے بڑی حد تک غیر معمولی تھا اس کو دیکھتے ہوئے مولانا کی شخصیت کا متنازعہ ہونا ایک نقصان کی بات ہوئی، یہ وہ حقیقت ہے جس سے مولانا کے کام کی ہمہ گیری متاثر ہوئی۔

مولانا کے ساتھ اگر یہ تلخ حقیقت نہ ہوتی تو آج مولانا کی عظمت کو خراج ملنے میں اتنی کمی بھی نہ ہوتی جو عالم اسلام کے برگزیدہ طبقے میں نظر آتی ہے۔

مولانا نے اپنی عملی زندگی مقالہ نگاری اور صحافت سے شروع کی تھی اور اسی سے وہ تحقیق و تصنیف کی دنیا میں داخل ہوئے انھوں نے ۲۴ سال کی عمر میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' تصنیف کی، جو مولانا کی فکری قائدانہ صلاحیت سے روشناسی کا باعث بنی، مولانا نے شروع میں جمعیۃ العلماء کے آرگن ''مسلم'' اور ''الجمعیۃ'' کی اور بعض دیگر رسالوں کی ادارت کی پھر خود اپنا رسالہ ''ترجمان القرآن'' نکالا جو ان کے افکار و خیالات کا اور ان کی تحریک کی اعلیٰ ترجمان تھا اور برابر جاری ہے۔ یہ رسالہ مولانا نے حیدرآباد کے قیام کے دوران نکالا تھا پھر مولانا نے نقل سکونت اختیار کی اور پنجاب کو اپنا مرکز بنایا تو وہ رسالہ بھی وہاں منتقل ہوا۔

پاکستان بننے کے بعد مولانا کو قادیانیت مخالف تحریک کے زمانہ میں حکومت کی طرف سے پھانسی کی سزا سنائی گئی، مولانا نے اس کو بہت صبر و رضا کے ساتھ سنا اور جان جان آفریں کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہوگئے یہ سزا نافذ نہیں ہوئی لیکن مولانا کی استقامت و رضا بالقضا کے عمل نے ان کی شہرت اور ناموری میں بہت اضافہ کیا اور یہ راہ خدا میں ان کے جہاد و قربانی کا ایک عمل سمجھا گیا۔

مولانا کی زندگی اسلام کے خادموں کے لیے بہت سے سبق اور بہت سے پہلوؤں میں

نمونہ رکھتی ہے، مولانا کی ابتدائی زندگی کے حالات نے ان کو سہولت کے ساتھ تعلیم جاری رکھنے اور بڑا علمی مقام پیدا کرنے میں مساعدت نہیں کی تھی لیکن مولانا نے محنت وتندہی سے وہ مقام حاصل کیا جو مساعد حالات میں بھی کم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

مولانا نے اسلامی افکار وخیالات کی تفہیم وتشریح کے لیے جو اسلوب تحریر اختیار کیا وہ مدلل سلیس اور مؤثر و دل نشیں تھا اس میں عصر حاضر کے ذہنوں کو متوجہ ومتاثر کرنے کی پوری صلاحیت اور لحاظ تھا، مولانا کا یہ اسلوب صرف انہی کے ساتھ مخصوص نہیں رہا بلکہ ان کے ماننے والوں اور عقیدت رکھنے والوں نے اس کو اپنایا اور وہ ان میں رائج ہوا، ان کے ماننے والوں میں سے نہ معلوم کتنے ہیں جن کا تحریری انداز مولانا کے تحریری انداز سے خاصا مشابہ ہو چکا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تعلیم وتربیت جس انداز میں ہوئی وہ عصر جدید کے ذہن و ذوق اور جدید زندگی کے تقاضوں کے سمجھنے کی صلاحیت میں ممتاز اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی صلاحیت سے مماثل تھی چنانچہ مولانا مرحوم سے دس سال چھوٹے ہونے کی باوجود مولاناؒ نے نوجوانی کے زمانہ میں مولانا مرحوم کے اسلوب وبیان سے قرب محسوس کیا تھا اور اس کے نتیجہ میں مولانا مرحوم کے کام میں کچھ تعاون بھی کیا تھا بعد میں اگرچہ دونوں نے کام کے لیے علاحدہ علاحدہ خطوط اختیار کئے لیکن نئی نسل کے ذہنوں کو مطمئن کرنے والے اسلوب کو اختیار کرنے اور عصر حاضر کی ضرورت کا لٹریچر مہیا کرنے میں دونوں میں تقارب رہا اور دونوں اس سلسلے میں ایک دوسرے کے قدرداں بھی رہے، اسی لیے مولانا مودودیؒ کی وفات کے اس سانحہ کو مولانا مدظلہ نے بہت محسوس کیا، دونوں حضرات عالم اسلام کے متعدد عالمی اداروں کے رکن اساسی تھے مولانا مرحوم جب تک صحت اجازت دیتی رہی ان میں شرکت کرتے تھے، آخر کے برسوں میں گردوں اور گھٹنوں کی تکلیفات کی وجہ سے سفر متروک ہو گئے تھے مولانا کا سفر امریکہ دو تین ماہ قبل ان کے صاحبزادے کی خواہش پر جو کہ خود ڈاکٹر ہیں اور امریکہ میں ہیں برائے علاج ہوا، لیکن خدا کی مرضی تھی کہ مولانا نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح ۷۶ سال کی عمر میں جس میں ۵۰ سال سے زیادہ مدت مولانا نے اسلام کے دفاع وتشریح میں صرف کی تھی مولانا اپنے خالق سے جا ملے۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ۔

قاضی عدیل عباسیؒ

ملت اسلامیہ ہند کے مخلص خادم، دینی غیرت وحمیت میں ممتاز، ملی اور ملکی کاموں میں پیش پیش رہنے والے قاضی محمد عدیل عباسی ۸۰ سال کی عمر میں ۲۲ر مارچ ۱۹۸۰ء کو اس دارفانی سے دار باقی کو کوچ کر گئے۔ اناللہ وإنا إلیہ راجعون۔

قاضی صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ تھے، سیاسی اور عملی زندگی کا آغاز انھوں نے صحافت سے کیا، اور مولانا ظفر علی خاں کے مشہور روزنامہ ''زمیندار'' میں اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے، پھر تحریک خلافت میں ایسے لگے کہ آخر تک آزادیٔ وطن کی تحریک سے وابستہ رہے، اس سلسلے میں انھوں نے قربانیاں بھی دیں، تقسیم ہند کے وہ مخالف تھے، اور اس کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے، آزادی کے بعد قاضی صاحب نے اپنی تمام تر جدوجہد مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ملک کی ترقی وخوشحالی کے لیے وقف کردی اردو کی بقاوترقی کے لیے ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ دینی تعلیمی کونسل اور اس کی فرعی تنظیم انجمن تعلیمات دین کا قیام ہے جو اپنی نوعیت کی غیر معمولی منفرد تنظیم ہے، جس کے ذریعہ قاضی صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کو دینی وفکری ارتداد سے بچانے کا غیر معمولی مجتہدانہ کارنامہ انجام دیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں قاضی صاحب نے جب بستی میں پہلا جلسہ منعقد کیا تو اس میں شرکت کے لیے سارے ملک سے مسلمان قائدین ورہنما اور ملی کارکن اہتمام سے آئے، اور نمونے کے مکاتب کو بچشم خود دیکھ کر نئے حوصلے اور عزم کے

ساتھ اپنے اپنے صوبوں کو واپس ہوئے پھر تو بیشتر صوبوں میں اسی طرز پر کام شروع کر دیا گیا، اس طرح اللہ کے اس مخلص بندے کی بیدار مغزی، دور اندیشی اور دینی غیرت وحمیت کی وجہ سے نئی نسل کے ایمان وعقیدے کی حفاظت کا سامان فراہم کیے جانے کی تحریک ''دینی تعلیمی کونسل'' کے نام سے شروع ہوئی جس کے وہ بانی جنرل سکریٹری ہوئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اس کے سربراہ منتخب ہوئے، حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اس تحریک کے سرگرم اور مؤثر ذمہ داروں میں سے ایک تھے، قاضی صاحب کے معاون خاص ان کے ہی ایک قریبی عزیز مولانا محمود الحسن عثمانی تھے، جو اس کی دفتری ذمہ داریوں کو انجام دیتے تھے، اور اس تحریک کو مؤثر اور فعال بنانے میں اہم کردار رکھتے تھے، اب ان کے بیٹے اور قاضی صاحب مرحوم کے بھانجے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی دونوں کے فکر روشن کے وارث وامین ہیں۔

یہ قاضی صاحب کا بنیادی دینی تعلیم کے سلسلے کا نئی نسل کے ایمان وعقیدے کے تحفظ کے تعلق سے وہ عظیم کارنامہ ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا اور یہ ایسا کام ہے جو کہ تنہا ان کی مغفرت کے لیے کافی ہوسکتا، قاضی صاحب کی سیاسی پکڑ بھی تھی، جس سے وہ دین وملت کے کام میں تقویت پہنچانے کا کام لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر وجمیل عطا فرمائے، (آمین)

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ

رمضان المبارک کا مہینہ تھا کہ اچانک یہ رنجدہ خبر ملی کہ ۳/ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ ۲۰/ مارچ ۱۹۹۱ء کو ملت اسلامیہ ہند کے عظیم دینی رہنما مولانا سید شاہ محمد منت اللہ رحمانی ایک مختصر قلبی دورہ کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ للہ ما اعطی وولہ ما اخذ و کل شئی عندہ لاجل مسمی وانا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ اپنے عظیم والد ماجد حضرت مولانا محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء وبانی خانقاہ جامعہ رحمانی مونگیر) کے جانشین اوران کے علمی ودعوتی کام کی جاری رکھنے والے تھے اورانھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو بڑے اچھے ڈھنگ سے پورا کیا، وہ بہار واڑیسہ کے امیر شریعت بھی منتخب ہوئے اور شرعی امارت کی ذمہ داری بطریق احسن انجام دیتے رہے، پھراس ملک میں حفاظت شریعت کا مسئلہ ہندوستان کے آزاد اور سیکولر ملک بن جانے کے بعد بڑی اہمیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آیا، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے محض یہی نہیں کہ اس کو محسوس کیا، بلکہ اپنے تن من دھن سے وہ اس کی فکر میں لگ گئے، اپنے معاصر علماء کو ساتھ لے کر اس کو تحریکی حیثیت دی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پہلا بڑا اجتماع بمبئی میں ہوا، اوراس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ تشکیل میں آیا، ہندوستان کی عظیم تاریخی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کے سربراہ مولانا قاری محمد طیبؒ اس کے صدر اور خود مولانا منت اللہ رحمانی اس کے ناظم اعلیٰ (جنرل سکریٹری) منتخب ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف دینی مراکز اور فقہی مکاتب کی نمائندگی اس بورڈ میں رکھی گئی، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ کے وفات کے بعد جو ۱۹۸۳ء کو

پیش آئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بورڈ کے صدر منتخب ہوئے ان کے دور صدارت میں ہندوستانی عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) کے ایک فیصلہ کے سبب جس سے مسلمان مطلقہ کے سلسلے میں شریعت اسلامیہ کے قانون سے سخت تصادم سامنے آیا، جس کے سبب بورڈ کو سخت چیلنج کا سامنا ہوا، اور بورڈ نے اپنے صدر اور جنرل سکریٹری کی رہنمائی میں زبردست مہم چلائی جو جمہوری سطح پر عوامی جلسوں کے انعقاد اور رائے عامہ بنانے کے ذریعہ اور سیاسی سطح پر وزیر اعظم سے ملاقاتوں کے ذریعہ انجام دی گئی، یہ ایسا معرکہ تھا جس میں ملک کے اندر اسلامی شریعت کی بقاء وعزت کا مسئلہ سامنے آگیا تھا، جو مسلمانوں کی مذہبی موت وزیست کی حیثیت رکھتا تھا، دوسری طرف عدالت علیا کے فیصلہ کے خلاف مسلمانوں کی رائے عامہ دیکھ کر ملک کی اکثریت نے اس مسئلہ کو ایک طرح سے ملک اور اکثریت کے خلاف سمجھ لیا، اور اس طرح مسئلہ میں مزید سنجیدگی پیدا ہوگئی۔

لیکن الحمدللہ بورڈ نے اپنے صدر مولانا علی میاں ندویؒ اور جنرل سکریٹری مولانا سید منت اللہ رحمانی کی حکیمانہ قیادت میں معاملہ اس طرح چلایا کہ بالکل تلخی پیدا نہ ہونے دی، اور آہستہ آہستہ حکومت وقت نے مسلمانوں کے موقف کو صحیح تسلیم کرلیا، اور عدالت علیا کے فیصلہ کا حل پارلیمنٹ میں مطلقہ قانون کو تبدیل کر کے نکالا، اس طرح بورڈ کا یہ کارنامہ ایک تاریخی اور بے مثل کارنامہ قرار پایا اور اس سلسلے میں حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ نے اپنی ملی زندگی کے شروع دور میں ملک کی سرگرم سیاست میں بھی حصہ لیا، لیکن پھر بعد میں انھوں نے اپنی جدوجہد کو صرف دینی وعلمی وملی مقاصد کے دائرہ میں ٹھوس اور ٹھنڈے طریقہ سے کارگزاری پر محدود کیا، چنانچہ ان کی سرپرستی میں مونگیر میں جامعہ رحمانی، بہار واڑیسہ کی امارت شرعیہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نظامت اعلیٰ رہی اور اسی کے ساتھ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی کوششوں میں بہ حیثیت رکن تاسیسی کے فکرمندی کے ساتھ شریک رہے، ان کے والد ماجد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ ندوۃ العلماء کے ناظم اول اور اس کے اولین بانیوں میں سے تھے، اس کی وجہ سے ان کے خاندان کا تعلق بھی ندوۃ

العلماء کے ادارے سے خاص رہا اور اسی بنیاد پر مولانا منت اللہ رحمانی نے ندوۃ العلماء میں بھی دینی تعلیم کا ایک دور گزرا اور بعد میں وہ یہاں کے مؤثر رکن انتظامی رہے، اور آخر میں تو متعدد جلسوں کی صدارت بھی فرمائی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے مولانا رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق زیادہ قریبی اور گہرا ہوا اور آخر میں تمام ملی کاموں میں دونوں قریبی ساتھیوں کی طرح برابر کے شریک ہوئے، مولانا کی فہم وفراست اور اجتماعی وملی مسائل میں طویل تجربہ، ان کے تمام مشوروں اور کاموں میں بڑا ممد ومعاون ہوتا تھا، اور ملت کے مختلف کاموں کو بڑی تقویت اور مدد ملتی تھی۔

آخر میں مولانا رحمانی کا شمار مسلمان ملی قائدین میں صرف دو تین چوٹی کے افراد میں ہوتا تھا، ہر اہم موقع پر ان کی دور اندیشی اور علم سے ملت کو مدد ملتی تھی افسوس ہے کہ ملت اسلامیہ ہند اپنے اس عظیم فرزند سے محروم ہوگئی۔

مولانا کی وفات "موت العالم موت العالم" کا صحیح مصداق بن گئی، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت کے اس عظیم خسارہ میں اس کی مدد فرمائے، اور بدل عطا فرمائے، اور مولانا مرحوم کو اپنے خاص قرب سے نوازے، مولانا کی وفات رمضان المبارک کے مہینہ میں اور صلوٰۃ تراویح ادا کرتے ہوئے پیش آئی اس سے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا جو مقام ہوگا اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے لیے یہ واقعہ مزید بڑا صدمہ ہے کہ ان کے ملی کاموں میں ان کا ایک بہت قریبی رفیق اب ان کے ساتھ نہیں رہا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے، اور ان کے ملی ودینی وعلمی معاملات میں پیش آنے والی دشواریوں کے دور ہونے کے اسباب برابر مہیا فرماتا رہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم وھو نعم المولی ونعم النصیر۔

مولانا کے معاونین میں اس وقت ان کے صاحبزادہ گرامی قدر مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب کے علاوہ مولانا سید نظام الدین صاحب اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا تعلق امارت شرعیہ سے بھی ہے جس کے وہ سربراہ تھے، اور مسلم پرسنل لا بورڈ سے بھی ہے جس کے وہ جنرل سکریٹری اور روح رواں تھے، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو درجات عالیہ پر فائز کرے، اور ان کی حفاظت دین کے کام اور تمام تر دینی وملی خدمات ومساعی کو قبول فرما کر اس پر اضعافا مضاعفہ اجر عطا کرے۔

مولانا شاہ ابوالسعود احمد باقویؒ

حضرت مولانا شاہ ابوالسعود احمد باقویؒ امیر شریعت کرناٹک رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور ومعروف عالم دین اور جنوبی ہند کے امیر شریعت اور رہبر ملت اور داعی شخصیت کے حامل بزرگ تھے، انھوں نے دینی تعلیم اور دینی رہبری کے کام میں اپنی زندگی صرف کی، جس کی ایک بڑی علامت بنگلور کا موقر اور معروف جامعہ دینیہ دارالعلوم سبیل الرشاد ہے، جس سے فارغ ہونے والے اور دینی وتعلیمی فیض حاصل کرنے والے اشخاص میں کئی نامور شخص ہوئے جو جنوبی ہندوستان میں متعدد درسگاہیں چلا رہے ہیں، اور دین وملت کی رہنمائی کا فرض انجام دے رہے ہیں، ان میں خود حضرت مولانا ابوالسعود باقویؒ کے صاحبزادے مولانا مفتی اشرف علی صاحب باقوی اپنے جلیل القدر والد مغفور ومرحوم مولانا شاہ ابوالسعود احمد باقویؒ کی قائم مقامی کررہے ہیں، اور جامعہ سبیل الرشاد کے مہتمم ہیں اور امیر شریعت کرناٹک کا منصب رکھتے ہیں۔

مولانا شاہ ابوالسعود احمد باقوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ساری زندگی اصلاح وارشاد اور تعلیم دین اور دعوت وتبلیغ میں صرف کردی، اور دعوتی کام کی سرپرستی اس طرح کی کہ دارالعلوم سبیل الرشاد کے طلبہ کو دینی رنگ میں ڈھالنے کا کام اہتمام سے کیا، دعوت وتبلیغ کے کام سے دارالعلوم کو جوڑا اور برابر اس سے وابستہ رکھا، اس کا ثبوت طلبہ کے لباس اور معمولات سے اور مدرسے کے پروگراموں سے مربوط رہا، جس کو دیکھ کر اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور جہاں اکثریت مشرک ہے، اور مسلمانوں کی بڑی تعداد دینی بے اعتنائی اور بدعات میں مبتلا ہے، دین کی حفاظت اور اس کی صحیح روح کے ساتھ قائم رہنے کے لیے جو اہتمام ضروری ہے اس کا نمونہ مدرسے کے حجرات اور حالات کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جنوبی ہندوستان کا قدیم ترین مدرسۂ دینی باقیات

الصالحات نے ایسے افراد پیدا کیے جنھوں نے دینی تعلیم کو اس پورے علاقے میں پھیلانے کی فکر کی، خود حضرت مولانا ابوالسعود باقویؒ وہاں سے دینی تعلیمی فکر لے کر آئے اور بنگلور کو اپنے فیض سے مستفید بناتے ہوئے ایک ایسے مرکز کی تشکیل کر گئے جس سے طالبانِ علم، دین وملت کی خدمت کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔

جناب میر مقصود علی خاںؒ مدیر اعلیٰ روزنامہ سالار بنگلور نے آپ کی حیات وخدمات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''حضرت قریہ بلیخ پور میں پیدا ہوئے تھے، یہ قریہ نارتھ ارکاٹ ریاست تملناڈو میں واقع ہے، حضرت کا خاندان اپنی مذہبیت اور شرافت کی وجہ سے مشہور تھا، دینی تعلیم مدرسہ باقیات الصالحات تشریف لے گئے، مہتمم بنائے گئے اور ساتھ ہی ساتھ درسِ حدیث کی ذمہ داری بھی قبول کی، آٹھ سال تک مہتمم رہے، مدرسے میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت اپنی معلّمی کے زمانے مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک تبلیغ سے جڑ گئے تھے، تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرتے اور دین کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔ آپ شہر بنگلور آئے، وہاں دیکھا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاکھوں مسلمان آباد ہیں، کوئی مدرسہ جو طلباء کو مختلف درجوں میں فارغ کر کے علوم اسلامیہ کی سندیں ان کے ہاتھ میں دے دے، نظر نہیں آتا، بس ارادہ کر لیا کہ اس شہر میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد مدرسہ باقیات الصالحات ودارالعلوم کے طرز پر رکھیں گے، چنانچہ ۱۹۶۰ء میں ایک چھوٹی سی زمین کا ڈگنڈنہلی میں اہل خیر کی مدد سے خریدی۔ رفتہ رفتہ مدرسے کی عمارت تعمیر کرائی، اور کئی عالیشان عمارتیں احاطے میں کھڑی ہوگئی ہیں، دیکھنے والے کا دل خوش ہوجاتا ہے، اور مدارس دینیہ کی عظمت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ دارالعلوم سے فارغ ہوکر نکلنے والوں میں حفاظ بھی ہیں، قاری بھی ہیں اور عالم وفاضل بھی۔ پڑھنے والے طلبہ دنیا کے مختلف حصوں سے آتے ہیں۔

حضرت ابوالسعود احمد باقوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی دینداری کا بس ایک نمونہ تھی، آپ کو دیکھنے اور سننے سے پرانے بزرگوں کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، ہمیشہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا ذکر زبان پر ہوتا۔ طلبہ کو قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول رہنے کی دن میں کئی مرتبہ ہدایت

ہوتی، خود حافظ تھے، بس چلتے پھرتے یا بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے قرآن کریم پڑھتے تھے، ایک دفعہ بتایا کہ دن میں درس وتدریس کی مصروفیتوں کے علاوہ جو وقت مل جاتا اس میں تین چار پارے آسانی سے ختم کر لیتے۔ دینی کام کے لیے برابر سفر کرتے رہتے تھے۔"

عزیز گرامی مولوی سید مصطفیٰ رفاعی ندوی (جو ان سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں) نے بتایا کہ شاہ ابوالسعود احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عبادات کا ذوق، تلاوت وذکر کا شوق بچپن ہی سے تھا، طالب علمی کے زمانے میں بھی آپ ذاکر وشاغل تھے، آپ طبعاً ہی صوفی درویش تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تزکیہ واحسان اور سلوک وتصوف میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ ایک واسطہ حضرت شاہ سعید کیرنوری سے حکیم الامت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، بلاشبہ ایک طرف آپ وقت کے جلیل القدر عالم تھے تو دوسری جانب زمانے کے ولی کامل درویش بھی تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت رکھی، اور ان کی کوششوں کے فیض کو بنگلور اور اہل بنگلور کے لیے خاص طور پر مفید بنایا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی شخصیت تھی کہ ان کے نمونے کو اپنانے سے دین وملت کے خادموں کی تشکیل میں مدد ملے۔ ان کا سانحہ ارتحال ان کا ملت کے لئے عظیم سانحہ سمجھا گیا جو ۲۶ رفروری ۱۹۹۴ء کو بینگلور میں پیش آیا، ان جانشین ان کے صاحبزادے مولانا مفتی اشرف علی صاحب ان تمام ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں جسمیں وہ انجام دیتے تھے اللہ ان کی عمر میں برکت دے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق شمالی ہندوستان کے بزرگوں اور علماء سے اور وہاں کے دینی اداروں سے بھی رہا تھا، اور ایک دوسرے کا احترام قائم تھا، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے معزز رکن تھے، اور اس کے نائب صدر رہے، اسی کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں کی مجلس شوریٰ میں تھے، ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، اور اس کی میٹنگوں میں تشریف لانے کا اہتمام فرماتے تھے، اس طریقے سے ان کو شمال کے لوگوں کو دیکھنے اور قدر شناسی کا موقع ملتا تھا۔ ان کی شخصیت ایسی ہے جو ان کے بعد بھی یاد رکھی جائے، اور ان کی خوبیوں سے مستفید ہونے کی طرف توجہ کی جائے۔

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ

۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو دہلی میں ملت اسلامیہ کی قائد شخصیت اور وسیع النظر عالم دین مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے ۶۶ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

قاضی صاحب کا سانحۂ وفات صرف مسلمانان ہند کے لئے خسارے کی بات نہیں بلکہ عالم اسلام کے لئے خسارے کی بات ہے، وہ علاج کے سلسلہ میں عرصے سے دہلی میں مقیم تھے اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ دار ہونے کی وجہ سے بھی دہلی میں قیام تھا لیکن وہل وطن واہل خاندان کی خواہش کی وجہ سے ان کا جنازہ ان کے وطن دربھنگہ بہار لے جایا گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی، وہ اگرچہ مجھ سے عمر میں چند سال چھوٹے تھے مگر میں ان کے علم وفضل اور ملت کے لیے ان کی مجاہدانہ مساعی کی وجہ سے ان کی توقیر کرتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرے۔

قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عہد حاضر کی ایک ممتاز عالمانہ اور قائدانہ خصوصیات کی حامل تھی وہ گوناگوں اور پر اثر صلاحیتوں کے مالک تھے، امت اسلامیہ ہند کی بہبود کے متعدد کام انجام دیئے، ان کو اپنے اختیار کردہ کاموں کے ہمدرد اور معاونین کو ساتھ لینے اور ان کی صلاحیتوں کو دین وملت کے مطلوبہ مقاصد کے لیے عامل بنانے کا بھی اچھا ملکہ حاصل تھا۔

اس طرح وہ ایک فرد میں ایک انجمن تھے، ان کی علمی وعملی صلاحیتوں کا آغاز ان کی زندگی کی ابتدا سے ہوا اور انھوں نے فقہ کو اپنا بنیادی موضوع بنایا اور ترقی کر کے مقام استناد تک پہنچے، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ میں جو ملک کا ایک مستند اور بڑے اعتبار کا مالک ادارہ ہے وہ قاضی

القضاۃ کے عہدہ پر مامور ہوئے اور جلد اس وقت کے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کے معاون خاص بن گئے، مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل دیئے جانے پر اس کے سکریٹری جنرل منتخب ہوئے، اس کے کام میں بھی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ ان کے معاون رہے اور انھوں نے اپنی فقہی کارکردگی سے بورڈ کو تقویت پہونچائی، ہندوستانی مسلمانوں کے اس وقت کے حالات میں بورڈ کو اس کے مذکورہ بالا سکریٹری جنرل نیز بورڈ کے صدر محترم کے فکر واہتمام سے ملک میں بڑا اعتبار حاصل ہوا اور بعض مہمات سر ہوئیں اور ہندوستان میں بورڈ کو واحد نمائندگی کا اور استناد کا مقام حاصل ہوا۔ اس سلسلے میں بھی بورڈ کے دیگر اہم ارکان ومعاونین کے ساتھ ساتھ مولانا مجاہد الاسلام صاحب کا خاصہ حصہ رہا۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی فعال شخصیت نے ان کو اس امر کی طرف خصوصی طور پر متوجہ کیا کہ وہ ملت کی دیگر اجتماعی ضرورتوں کی بھی فکر کریں، انھوں نے مسلم مجلس مشاورت کے کمزور ہونے پر اس میں طاقت بحال کرنے کو دشوار محسوس کیا تو اس کے متوازی ادارے کے طور پر ''آل انڈیا ملی کونسل'' تشکیل دی۔

دوسری طرف ملک کی فقہی ضرورت کے لیے ''فقہ اکیڈمی'' کی تشکیل کی۔ پھر ان تینوں اداروں کے توسط سے انھوں نے کل ہند سطح پر مسلمانوں کے ملی معاملات کو تقویت پہونچانے کی کوشش کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک زندہ قوم ہونے کے تصور کو تقویت پہنچائی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر ان کی زندگی کے آخری دو سالوں میں ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' کے صدر (مولانا علی میاںؒ) کی وفات کے بعد اس کی صدارت کی ذمہ داری بھی ہوگئی۔ وہ اس کے سرد وگرم مسائل کو دیکھے اور برتے ہوئے تھے اس لیے ان سے زیادہ اس منصب کے لیے کوئی دوسرا فرد موزوں نہیں سمجھا گیا، اس طرح ان پر ملت کی رہنمائی اور سرپرستی کے تین محاذوں کی ذمہ داری پڑ گئی۔ اس دوران ان کی صحت خاصی کمزور ہوگئی تھی، کیوں کہ وہ اس مدت میں ایک پریشانی پیدا کرنے والی مسلسل علالت میں

رہے لیکن وہ اسی کے ساتھ اپنی حد تک پوری رہنمائی اور دلچسپی سے کوشش کرتے رہے اور ان سے ان کے اختیار کردہ ان تینوں محاذوں کو تقویت ملتی رہی، جس سے قضاء وقدر کے فیصلہ کے مطابق آغاز اپریل میں تینوں محاذ محروم ہوگئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ امت اپنے وقت کے ممتاز رہنمایانِ علم ودین سے یکے بعد دیگرے جلدی جلدی محروم ہوتی چلی گئی تھی اس میں یہ سانحہ اور بھی باعث فکر اور قابل افسوس محسوس کیا گیا۔

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے امتیاز وتفوق کی طرف بڑھتے ہوئے فرد کی حیثیت سے دیکھا گیا تھا۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں نمایاں طالب علم رہے۔ فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ترقی کر کے علمی دائرہ میں اپنا مقام بنایا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے اگرچہ وطنی یا ادارہ کی نسبت کا تعلق نہ تھا لیکن ان کو حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے علمی ذوق ورجحان اور فکری بلندی ووسعت سے مناسبت محسوس ہوئی تھی اور اسی بنیاد پر انھوں نے اپنے دارالعلوم دیوبند میں زمانۂ طالب علمی کے دوران اپنے صوبہ کے تعلق سے قائم کردہ انجمن کے ذریعہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو توسیعی خطبہ دینے کے لیے دارالعلوم دیوبند بلایا اور خطاب کرایا وہ خطاب اہم خطاب تھا جس میں مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے دینی علوم کے طالب کی خصوصیات اور ذمہ داریوں پر بہت جامع اور روح پرور خطاب کیا جو بعد میں طبع ہو کر طلباء مدارس دینیہ کے لیے مشعل راہ بنا۔

مولانا علی میاںؒ کو خطاب کے لیے بلانے نیز ان سے قریبی تعارف ہو جانے سے مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب کا حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے قریبی ربط کے آغاز کا بھی کام ہوا۔ پھر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے محاذ پر اکٹھا ہونے کے تعلق سے یہ ربط بڑھتا رہا۔ اور انھوں نے حضرت مولانا کے علمی ودعوتی ذوق ورجحان کو قریب سے دیکھا اور اس سے ہم آہنگی محسوس کی اور کارملت میں ان کے ساتھ رفاقت سے مزید قرب محسوس کیا، جس کا انھوں نے بعض نجی گفتگو میں ذکر بھی کیا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ قاضی صاحب کے قدرداں

رہے اور ملت کو تقویت پہنچانے والے ان کے کاموں اور کوششوں سے مسرت محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی قاضی صاحب کی علالت سے انھیں بڑی تشویش ہوئی اور وہ ان کی عیادت کے لیے مستقل سفر کر کے تشریف لے گئے، جس سے قاضی صاحب نے بڑی تقویت محسوس کی اور بعد میں انھوں نے اس کا کئی موقعوں پر ذکر کیا۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو ان کے وسیع میدان عمل نے انسانوں کے مختلف حلقہائے فکر سے گلا ملا کر رکھنے میں مدد دی اور انھوں نے ملی ضرورتوں کے تنوع کو خصوصی طور پر سمجھا اور اس میں شرکت کی کوشش کی نیز کاموں کی ضرورت کے تحت بیرون ملک سے بھی ان کا رابطہ بڑھا اور وہاں بھی ان کے تعارف اور ان کی اہمیت میں اضافہ ہوا اور اس طرح ان کی شخصیت کو آفاقیت حاصل ہوئی۔

اس کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی ان کا تعارف بڑھا اور ایک کو دوسرے سے رفاقت کار اور تعاون کا فائدہ ہوا، اور یہ سب ملت کے لیے وسیع تر خیر طلبی کا ذریعہ بنا۔

مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے مسلمانوں کے دینی علمی حلقوں کو ایک دوسرے سے قریب ہونے میں بھی معاونت کی اور فقہ اسلامی کو اس کے جدید اور وسیع پس منظر میں دیکھنے کی اور اس کے لیے اجتماعی سطح پر فکر کرنے کی طرف توجہ دی انھوں نے اپنی زندگی کی خاص طور پر آخری مدت جو کئی برسوں پر مشتمل رہی اپنی علالت کے ساتھ اپنے اختیار کردہ کاموں پر محنت ولگن میں گزاری، جس میں کام کے انجام دینے کے لیے ان کی بے چینی ظاہر ہوئی تھی، اور ان کی دلسوزی کا پتہ چلتا تھا، ان کے انتقال سے امت اسلامیہ ہند ایک خیر خواہ فکر مند، وسیع النظر اور ممتاز عالم دین سے محروم ہوگئی جس کے بدل کے لیے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ان کو ان کی خدمت ملت کی بہترین جزا دے۔ آمین۔

جناب ابراہیم سلیمان سیٹھؒ

محترم عالی مرتبت جناب ابراہیم سلیمان سیٹھؒ ہندوستانی مسلمانوں کی اس ملک میں پوزیشن اور حالات کو باعزت اور بہتر قائم رکھنے کے لیے طویل مدت تک اپنی خدمات صرف کرتے ہوئے اور اب جب کہ آل انڈیا ملی کونسل کے صدر منتخب ہوجانے کے بعد ان کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہوگیا تھا، ان کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے رب کے حضور جا پہنچے۔ ان کو اور ان کی انڈین نیشنل مسلم لیگ کو جس کا خاص طور پر جنوبی ہندوستان کے لوگوں میں تقسیم ملک کے بعد بڑا اثر رہا، اور اس سے مسلمانوں کے ملت کے لیے متحد ہوکر کام کرنے کے جذبہ کو تقویت ملی، ملت اسلامیہ کی اس ملک کی تاریخ میں اہمیت کے ساتھ یاد کیا جائے گا وہ مسلم لیگ کے جنوبی ہندوستان میں قائد اول جناب محمد اسماعیل صاحب کے عرصہ تک دست راست رہے، اور جنوبی ہندوستان سے منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں موقر ممبر کی حیثیت سے عرصے تک برابر آتے رہے، اور مسلمانوں کے کاز کی حمایت کرتے رہے۔ وہ عوام میں خطابت کے ایک مؤثر انداز سے بات کرتے تھے، اور ان کے خطاب کا بڑا اثر لیا جاتا تھا۔

بعد میں مسلمانوں کا نیم سیاسی اتحاد مسلم مجلس مشاورت کے نام سے تجویز پایا تو وہ اس میں بااثر رکن کی حیثیت سے شامل رہے، اور پھر بعد میں آل انڈیا مسلم لا بورڈ کی تشکیل کے بعد اس میں بحیثیت رکن کے ان کا بہت اچھا حصہ رہا، ادھر کچھ عرصہ ملی کونسل کی تشکیل کے بعد اس میں بھی ان کو بڑی حیثیت حاصل ہوئی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ سے پہلے ملی کونسل کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ان تمام پلیٹ فارموں سے انھوں نے مفید خدمات انجام دیں، خاص طور سے جنوبی ہندوستان میں ان کی قیادت کا بڑا فائدہ اٹھایا گیا۔

ملک کے موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کو متعدد مسائل کا سامنا ہے، ان کے انتقال سے ان کے تجربات اور ان کی مفید رایوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو محرومی ہوئی، اور ملی سطح پر کی جانے والی کوششوں کو خسارہ ہوا، اس وقت وہ مسلمانوں کے سینئر رہنماؤں میں سے تھے، ان سے مسلمانوں کے جونیر ملی کارگزاروں کو جو تقویت حاصل ہو رہی تھی اس کا بھی خسارہ ہوا، اور مسلم قیادت کے میدان میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔

سیٹھ صاحب کا انتقال ۲۷/اپریل ۲۰۰۵ء کو ۸۲ بہاریں دیکھ کر بنگلور میں ہوا۔ ۳/نومبر ۱۹۲۳ء کو کنور کالی کٹ (کیرالا) میں پیدا ہوئے تھے، تعلیم حاصل کرنے کے بعد استاد کی حیثیت سے میدان عمل میں قدم رکھا پھر اپنی تقریروں کے ذریعہ اپنی افادیت کو اور عام کیا، ۱۹۶۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر ہو گئے پھر وہ لوگ سبھا کے لیے منتخب ہو گئے اور ایک موقر و ممتاز پارلیمنٹیر کی حیثیت سے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے رہے، اس طرح انھوں نے اپنی پوری عمر ملی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد میں گزار دی۔ انھیں سچا اور حقیقی ملی درد نصیب ہوا تھا، اب جب کہ وہ صحت کے اعتبار سے بڑے کمزور ہو گئے تھے، ملی غیرت وحمیت کی کوئی بات ہوتی تو ان کا خون پوری طرح گرما جاتا تھا۔ جمشید پور راوڑکیلا فساد کے زمانے میں جب ملت کے قائدین اور علماء ندوۃ العلماء میں ایک صاف اور متعین بات طے کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، اور مسلم مجلس مشاورت کی داغ بیل پڑی تھی تو اس میں بھی سیٹھ صاحب کا کردار نمایاں رہا تھا۔ تحفظ شریعت کی لڑائی لڑی، بابری مسجد کی بازیابی کی کوشش میں پیش پیش رہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اقلیتی کردار کی بحالی کی جدوجہد میں بھی وہ آگے آگے رہے، انھیں صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کی فکر نہیں تھی وہ عالم عرب کے مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، فلسطین کے مسئلہ سے ان کا تعلق ایسا تھا جو ایک باحمیت وغیرت مند مسلمان کا ہونا چاہیے، یہی وجہ تھی ۱۹۶۷ء میں اسرائیل مصر جنگ کے موقع پر فلسطین کانفرنس منعقد کی، ان کی پہچان ایک مخلص اور غیور مسلم قائد و لیڈر سے تھی۔

امریکہ، لندن، بغداد، تہران، کولمبو وغیرہ میں انھوں نے اسی حیثیت سے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ وہ ایک اچھے نقاد و ادیب بھی تھے، انسان دوست انسانیت نواز تھے، مسلمانوں کے نقیب تھے، طبیعت میں سادگی، ملن ساری، تواضع، بے نیازی تھی، یہی وجہ تھی کہ مادی منافع سے دور رہ کر اور نیک سیرت زندگی گزار کر رخصت ہوئے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور دین وملت کے لیے ان کی جو قربانیاں رہی ہیں اس پر انھیں اجر جزیل عطا فرمائے اور جو کمزوریاں رہی ہوں انھیں معاف فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے نہ رہنے سے جو خلا ہوا ہے اور جو کمی محسوس کی جارہی ہے خصوصیت سے جنوبی ہندوستان کے حصہ میں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کمی کو دور فرمائے اور ان کا نعم البدل عطا کرے۔

ہم ان کے پسماندگان کو اور ان سے منسلک لوگوں کو اپنے نیک جذبات پیش کرتے ہیں، اور مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

مولانا سیّد اسعد مدنیؒ

محرم الحرام ۱۴۲۷ھ کو یہ افسوس ناک خبر ملی کہ قائد ملت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعۃ العلمائے ہند بھی نہ رہے ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔غفر اللہ لہ ورحمہ رحمۃً واسعۃً وادخلہ فی جنات النعیم۔

مولانا ادھر کچھ عرصہ سے بیمار تھے اور پھر اس بیماری نے شدت اختیار کرلی تھی اوعروہ دہلی کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے ان کا جنازہ دارالعلوم دیوبند لایا گیا اور نماز جنازہ مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی مدظلہ صاحبزادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے پڑھائی اور قبرستان قاسمی میں اپنے عظیم والد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی، اللہ تعالی انہیں اونچے مراتب عطا فرمائے اور راضی ہو، مولانا سیّد اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کی ایک بڑی شخصیت تھے۔مزید یہ کہ وہ ایک عظیم شخصیت کے بیٹے بھی تھے، اس طرح ان کو ان دونوں پہلوؤں سے عظمت حاصل ہوئی، اس عظمت کے آثار ان کے آغاز عمر سے شروع ہوگئے تھے، انھوں نے شعور کی زندگی حاصل کرنے اور فراغتِ تعلیم کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے مسائل سے دلچسپی لینا شروع کردی تھی۔ پھر اپنے بڑوں کے انتقال کے بعد ان کی جگہ بحیثیت ''رہبر ملت'' کے حاصل کرلی، اور برصغیر کی مقتدر اور ملتِ اسلامیہ کی ضرورتوں کے لیے روح رواں جماعت ''جمعیۃ علمائے ہند'' کے وہ سربراہ قرار پائے۔

انھوں نے ملت کے لیے کوششوں کا مشکل دور پایا، ان سے پہلے جمعیۃ علمائے ہند کو حصولِ آزادی کے لیے ضروری جدوجہد کو انجام دینا پڑا تھا، ان کا مقابلہ غیر ملکی اقتدار سے تھا۔اس مقابلے میں ان کو غیر مسلم اہل وطن کے ساتھ شرکت اور آپسی تعاون حاصل رہا

تھا، اور مولانا اسعد میاں صاحب کو جمعیۃ علماء کی جدوجہد کا وہ عہد ملا جس میں غیر ملکی طاقت کے بجائے ملکی اقتدار سے واسطہ پڑا، یعنی سامراجی غلبہ ختم ہونے پر اہل ملک کا اقتدار قائم ہوا، لیکن اکثریتی فرقے کو حکومت میں اوّلیت حاصل ہوئی، ایسی صورت میں ملتِ اسلامیہ کے مسائل کے پیش نظر اس کی نصرت اور تقویت کے معاملات سامنے آتے، اور ان کے حل کے لیے فکر کرنا ہوتی تھی، اس میں شروع کا عہد ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت کے درمیان ایک طرح سے کشمکش اور منافرت کا دور بن گیا تھا، اس لیے مسائل کے حل میں حکمت عملی کی، محنت کی اور مخلصانہ جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اس عہد کی ذمہ داریوں کی فکرمندی میں مولانا اسعد میاں صاحب نے نمایاں حصہ لیا، چنانچہ مسلمانوں کا ایک خاصا طبقہ ملت کے مسائل کے پیچیدہ ہونے کی صورت میں ان سے اچھی توقع قائم کرتا تھا، اور ان سے فکر اور تلاش حل کی اُمید کرتا تھا۔

مولانا اسعد میاںؒ کو اللہ تعالیٰ نے ہمت اور حوصلہ کی بھی بڑی خصوصیت عطا فرمائی تھی، اور یہ صفت ان کو بڑی حد تک اپنے والد کی عظیم شخصیت سے وراثت میں ملی تھی، ان کے عظیم والد شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے برطانوی استعمار کے ظلم وستم کے ماحول میں امت اسلامیہ کی آزادی اور عزت کے لیے نہایت مخلصانہ اور انتھک جدوجہد کی تھی، اور اپنے راحت وآرام کی مسلسل قربانی دی تھی، اور بار بار جیل گئے تھے۔

ان کی عظمت کی ایک بڑی علامت یہ تھی کہ انھوں نے سیاست اور دین داری کو بہت خوبی کے ساتھ جمع کیا تھا، ایک طرف وہ علمی لحاظ سے اُستاد حدیث اور علوم دینیہ کے بلند مقام علمی شخصیت اور بڑی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تھے۔ وہ اپنی اس علمی بلندی کے ساتھ عملی لحاظ سے بڑے ربانی اور بزرگ شخصیت تھے کہ جن سے ارادت واسترشاد میں سینکڑوں ہزاروں لوگ منسلک تھے، اور اس راہ سے بھی ان کا بڑا فیض جاری تھا۔

انھوں نے جنگ آزادی میں شرکت مخلصانہ اور رضائے الٰہی کی طلب کے

جذبے سے کی تھی، اور اس کے لیے تکلیفیں اٹھائی تھیں، جس کی قدر مسلمانوں کے بڑے طبقے میں تھی، اور اس کی بنا پر وہ ''شیخ الاسلام'' کے خطاب سے موصوف کیے جاتے تھے۔

انھوں نے اپنے اس دینی وعلمی بلند مقام کے ساتھ ملکی سیاست کی جدوجہد آزادی کے کام سے اپنے کو وابستہ رکھا جو کہ سامراج کے اس ظلم اور حق تلفی کو روکنے اور باہری طاقت کو باہر کر دینے سے تعلق رکھتا تھا جس کی ضرورت اہل وطن کو اور خاص طور پر مسلمانوں کو بہت زیادہ تھی، ان کی اور ان ہی سے ملتی جلتی صفات کے حامل رفقاء کی پُرخلوص فکر دین وملت اور جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ ملک سامراجی طاقت سے بغیر مسلح ٹکراؤ کے آزاد ہوا، اور غیر مسلم اکثریت کے ایک معتد بہ افراد کے اس جدوجہد میں شریک ہونے کی وجہ سے ملک کی آزادی کے بعد بھی ان علمائے کرام کا اثر اکثریت کے ان افراد کے ذہنوں میں باقی رہا، حالانکہ ملک کی آزادی ہندو مسلم تفریق کے اصول پر انجام پائی، جس کی وجہ سے ہندو اکثریت کے تحت آنے والے حصّۂ ملک میں مسلمانوں کو اجنبی محسوس کیا جانے لگا تھا کہ ان کا حصّہ یعنی پاکستان ان کو الگ سے دے دیا گیا ہے، لہٰذا اب یہاں ان کا کوئی بڑا حق نہیں رہا، ہندو اکثریت کے ان احساسات کی بنا پر ہندوستان کی ملّت اسلامیہ کو خاص دشواریوں سے سامنا پڑنے لگا تھا۔

ان پیچیدہ حالات میں ملت کی سیاسی اور سماجی نصرت وخدمت کی ذمہ داری اس نسل کو منتقل ہوئی جس کے نمایاں افراد میں مولانا اسعد میاں صاحب بھی تھے، ایک عظیم باپ کے فرزند ہونے کے تعلق سے ان پر خاصی مشکل ذمہ داری آپڑی تھی، جس کو انھوں نے جرأت وہمت سے سنبھالا، اور اپنے معاصر زعمائے ملت کے ساتھ اس ذمہ داری کو انجام دینے کی کوشش کی، ملت کے ان زعماء کے درمیان نقطۂ نظر کا اختلاف بھی پیدا ہوتا رہا، لیکن اس اختلاف کے باوجود عموماً سبھی حضرات نے اپنے اپنے دائرے میں فکر ومحنت کا ثبوت دیا، ان میں مولانا اسعد میاں صاحب کی حیثیت زیادہ نمایاں رہی، اس لیے جلد ہی ملت کی اہم اور قدیم جماعت جمعیۃ علمائے ہند کے وہ درجۂ اول کے سربراہ کے مقام پر

پہنچے، اور جماعت کو ان کی برابر رہنمائی حاصل رہی، اور اپنی اس رہنمائی سے انھوں نے ملت کو مختلف پہلوؤں میں فائدہ بھی پہنچایا۔ وہ اپنی پُرعزم صلاحیت کے نتیجے میں پارلیمنٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے اور پارلیمنٹ کے اندر انھوں نے مسلمانوں کی نمائندگی میں حصہ لیا، اور متعدد اہم مسائل میں کامیابی حاصل کی۔

مولانا اسعد میاںؒ بڑے عالم دین بھی تھے، دارالعلوم دیوبند کے دینی تعلیم کے مرکز سے تعلیم وتربیت یافتہ تھے، وہاں کچھ عرصہ تدریس وتعلیم کا فریضہ بھی انجام دیا تھا، اور ایک بڑے بزرگ وربانی صفت رکھنے والی شخصیت کے فرزند ہونے کے ناطے بزرگی اور ربانی طریقۂ زندگی کے اوصاف بھی وراثت میں پائے تھے، چنانچہ سیاسی اور سماجی معاملات میں وہ ملت کی جو فکر کر رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ تصوف اور ربانیت کی راہ میں بھی اپنے سے منسلک لوگوں کی رہنمائی اور تربیت بھی کرتے تھے، اس طریقے سے وہ رہبر ملت ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت بھی تھے، لہٰذا ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کو اس سلسلے کا بھی ایک خسارہ ہوا، یہ ایک ایسا خسارہ ہوا جس کی تلافی عام طور پر مشکل سے ہوتی ہے، البتہ یہ خوش آئند بات ہے کہ جن کاموں کی ذمہ داری ان پر تھی، ان کو ان کے برادر خورد مولانا سیّد ارشد مدنی جو دارالعلوم دیوبند ہی کے استاد اور شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار ہیں، اور مولانا اسعد میاں کے ایک ممتاز خصوصیت کے حامل صاحبزادے مولانا سیّد محمود مدنی نے بڑی حد تک سنبھالا ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ ملت کی نصرت کا فریضہ انجام دیں گے، اور اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ان سے خسارے کی بہت حد تک تلافی ہو سکے گی۔

مولانا سیّد اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک پُرعزم، باہمت اور مستعد شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے اپنی پوری زندگی مسلسل جدوجہد اور عمل میں گزاری، اور ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی کمزور اور شکستہ حال حیثیت کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی، اور جمعیۃ علمائے ہند جس کا حصول آزادی کے لیے کوشش میں ایک بڑا اور تسلیم شدہ حصہ رہا تھا، تقسیم

ہند کے بعد بھی اس کو سنبھالا اور جمعیۃ علماء کی جماعت کو قائم اور جاری رکھا۔ مولانا کی حیثیت اس ملک میں ایک ایسے رہبر کی تھی جس کے عزم وارادے کی مضبوطی کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

وہ خوش اخلاقی، ہمدردی اور انسانی اور اسلامی سطح کا تعاون کرنے میں بھی ممتاز تھے، ان کے عظیم والد کی وفات کے وقت مولانا اسعد صاحب کے بھائی اور بہنیں کم عمری کی منزل میں تھیں، ان کو مولانا اسعد صاحب نے والد کے نہ ہونے کا احساس حتی الوسع نہیں ہونے دیا، اور ان سب کا ایسا خیال رکھا جس سے ان کے والد کی قائم مقامی ہوئی، جس کا اعتراف ان کے بھائیوں کو بھی ہے۔

مولانا اسعد میاںؒ کے والد حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قدرداں بلکہ مسترشدین میں میرے خاندان کے متعدد بزرگ بھی تھے، جس میں خاص طور پر میرے ماموں ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، ان کے تعلق سے حضرت کا ان کے یہاں آنا بھی ہوتا تھا، اس تعلق سے مجھے بھی ان حضرات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اور ان کے صاحبزادے مولانا اسعد میاں صاحب سے بھی تعارف ہوا اور قدر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا سید اسعد مدنی کو متعدد خوبیوں سے نوازا تھا، انھوں نے محنت وجدوجہد کی زندگی گزاری، اور اچھی شہرت ومقبولیت کے ساتھ اس دنیا سے گئے، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں اور خدمات ملت کو قبول فرمائے اور اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

(۳) علمائے کبار

(۱) مولانا عبدالباری ندویؒ
(۲) مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ
(۳) علامہ عبدالفتاح ابوغدہ حلبیؒ
(۴) مولانا محمد منظور نعمانیؒ
(۵) مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندویؒ
(۶) مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ
(۷) شیخ عبدالرحمٰن حسن حبنکہ المیدانیؒ

مولانا عبدالباری ندویؒ

برصغیر میں صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہنے کے بعد جب زوال ہوا اور باہری طاقت نے ان کے اقتدار کو ختم کرنے کے جابرانہ قبضہ کے بعد مسلمانوں کے دین سے جڑے ہوئے طبقے اور علمائے دین کو ظلم وتشدد کا شکار بنایا اور تعلیم میں بھی ملحدانہ رہن بنانے کا نظام قائم کیا تو علمائے دین نے دین کے بقا کے لیے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے ضروری تدابیر کے طور پر خالص دینی مدرسے قائم کیے، یہ مدرسے تعداد اور ضرورت کے لحاظ سے بہت کم تھے، لیکن ان کے ذریعے دینی علوم باقی رکھے جاسکے، اور ان کے ذریعے مسلمانوں کو دین پر قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی، ان کے ذریعے علوم اسلامیہ کے قدیم سرمایے کی حفاظت اور ان علوم دینیہ کی نشر واشاعت کی خدمت ایسے سخت ماحول میں کی جارہی تھی جس میں استعماری طاقت اپنے کارگر اور طاقتور ذرائع سے اسلامی علم وفکر کو مٹانے دینے کی وسیع پیمانے پر کوشش کررہی تھی۔ اسی کے ساتھ مغربی تعلیم اور ملحدانہ فکر کو استعماری سرپرستی کے ذریعے اس طرح پھیلایا جارہا تھا کہ لوگ اپنی دنیاوی ضرورتوں کے تقاضے کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے، اور یہ خطرہ ہوگیا تھا کہ دین ودنیا کی ایسی جدائی نہ ہوجائے کہ دنیاوی تقاضوں کے تحت ملحدانہ علم رائج اور غالب ہوجائے، اور دین کا نام لینے والے اور اس کے تحفظ کی کوشش کرنے والے کم سے کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے زندگی کے میدان سے باہر کردیے جائیں، جس طرح مغربی ملکوں میں عیسائی مذہب کے ساتھ کیا گیا، لیکن ہمارے دینی مدارس نے برطانوی استعمار کی ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیا، لیکن ان کی کوشش صرف دینی تعلیم تک محدود رہی، کیوں کہ ان کے وسائل اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتے تھے، دین ودنیا دونوں علوم کو

جمع کرنے میں اسلامی نقطۂ نظر کو عمل میں نہ لانے سے علمائے دین کا میدانِ عمل صرف دین کے پہلو تک محدود تھا، اور دنیاوی پہلوؤں میں ان سے رہنمائی نہیں مل رہی تھی، جن پر دین بیزار لوگوں کا غلبہ تھا، اس سے جو نقصان تھا، اس کا خطرہ محسوس کر کے علمائے دین کے ایک طبقے نے یہ ضروری سمجھا کہ زندگی کے دیگر امور سے تعلق رکھنے والی ضروری معلومات جو معاشرتی وتمدنی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں، ان سے بھی امت کی جدید نسل کے علمائے کرام کو واقف کرایا جائے تاکہ وہ دنیا پر اثر ڈال سکیں، اور ان کی نظروں میں وہ ان پڑھ ظاہر نہ ہوں، وقت کے دانشور علمائے دین نے اس نقطۂ نظر کے مطابق کوشش شروع کی، جس کی تائید سب علماء نے کی، اس نے نئی تعلیمی تحریک چلی جو ندوۃ العلماء کے نام سے موسوم ہوئی، اور الحمدللہ اس کی کوششوں سے تعلیم کا جامع اسلامی تصور سامنے آیا۔

اس کے لیے ندوۃ العلماء نے ''دارالعلوم'' کے نام سے درسگاہ قائم کی، ندوۃ العلماء کی اس درسگاہ سے جو پہلی نسل سامنے آئی، اس کے حضرات دینی علوم میں گہری واقفیت رکھنے کے ساتھ زندگی کی صحیح ضرورتوں میں کام دینے والا علم اور مؤثر زبان، دونوں لائنوں کا علم وفضل رکھنے والے ہوئے۔ ایک طرف ان میں دینی علوم کی پختگی تھی، دوسری طرف جدید علوم کے حامل اور علوم دینیہ سے ناواقف افراد سے بات کرنے اور متاثر کرنے کی صلاحیت بھی تھی، ان میں خاص طور پر لائق ذکر لوگوں میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور دیگر کئی حضرات کا کام بہت سے اہل علم کو متاثر کرنے والا، اور اسلامی فکر اور احکام کی بہتر سے بہتر اسلوب میں ترجمانی کرنے والا ثابت ہوا۔

یہ دونوں حضرات اپنے علمی کمالات کے مشہور مقام پر پہنچنے کے بعد اپنی ذاتی زندگی کے دینی پہلو کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے اپنے وقت کے مشہور عالم ومربی بلکہ دینی زندگی کی عملی خصوصیات وصفات کی تجدید کرنے والی شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے وابستہ بھی ہوئے، ان سے فیض اٹھانے کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کے طبقے کی ذہنی اصلاح ودرستگی کا کام بھی جاری رکھا، مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے

نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے اس خیال کی تردید کی کہ دین اور سائنس الگ الگ ہیں، انھوں نے سائنس کا دین سے اور دین کا سائنس سے تعلق ثابت کیا، وہ قدیم فلسفے سے تو اپنی دینی تعلیم کے دوران اچھی واقفیت حاصل کر چکے تھے جو قدیم یونانی فلسفے سے خصوصی تعلق رکھتا تھا، اس کے ساتھ انھوں نے جدید فلسفے سے ایسی واقفیت پیدا کی کہ اس کے غلط افکار کی علمی سطح پر بہت خوبی کے ساتھ تردید کی۔

یونانی فلسفہ ایسی عقلیت پر مبنی تھا جو اسلام کے عقائدی و مذہبی فکر سے متصادم تھا، لیکن عربوں نے اسلام کے آنے کے بعد علم کی طرف جو توجہ کی اس میں ان کے سامنے یونانی فلسفے میں جو عقلی موشگافیاں ہو چکی تھیں، ان سے واقفیت حاصل کرنے کے دوران ان سے متاثر ہوئے، اور اپنی اختیار کردہ علمی کوششوں میں ان سے مدد لی، اور اس طرح اس فلسفے کے رجحانات عربوں کے علوم میں داخل ہوئے، اور پھر ان کے اثر سے قرآن وحدیث کے عطا کردہ فکر سے سے اختلاف کی صورت پیدا ہوئی جس کا امام غزالی اور دوسرے ائمۂ فکر اسلامی نے مقابلہ کیا اور ان کا ابطال کیا۔

عصر جدید میں جب کہ مسلمانوں نے علمی میدانوں میں خصوصی اور مزید کوششوں میں پہلوتہی کی، اور یورپ نے اپنے قدیم سرمایۂ علمی کو جو ان کو عربوں کے توسط ہی سے ملا از سر نو اپنی علمی کوششوں کا موضوع بنایا، اور زندگی کے سربستہ حقائق کو کھولنے کی کوشش کی، اور ان میں نئے انکشافات کیے اور اپنے علوم وانکشافات کو مذہب سے متصادم تصور کیا اور مذہب کو زندگی کے حقائق سے علاحدہ کر دیا تو ان درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے سے مسلمانوں کے ذہن میں بھی سائنس اور مذہب کے درمیان علاحدگی اور مغربی فلسفے کے اثر سے اسلامی فلسفے کی بے بضاعتی کا احساس پیدا ہوا، اور اس کے نتیجے میں مذہبی حقائق کے معاملے میں بے یقینی پیدا ہوئی، اور بات نے مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی ملحدانہ رجحانات نے جگہ بنائی، یہ بہت خطرے کی بات اور اسلام کے علمی امتیازات کے لیے ایک سخت چیلنج تھا۔

مولانا عبدالباری صاحب جو کہ علوم دینیہ کا صرف علم ہی نہیں حاصل کر چکے تھے،

بلکہ انھوں نے ان میں تحقیق وتجدید کی صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی، مغربی فلسفے اور سائنس کا مہارت کے ساتھ مطالعہ کیا اور بہت کامیاب انداز میں اسلامی نظریے کی برتری ثابت کی، اور مذہب سے سائنس کے ٹکراؤ کے تصور کا ابطال کیا، جس کو دیکھ کر ممتاز اہل علم بھی متاثر ہوئے اور اسلام کے عطا کردہ حقائق کی صحت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ مولانا عبدالباری صاحب نے اس سلسلے میں کئی کتابیں تصنیف کیں، جنھوں نے موجودہ عہد کے پس منظر میں بھی بلند مقام حاصل کیا، اس سلسلے میں ''مذہب وسائنس'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، مذہب وعقلیات بھی انہوں نے لکھی یہ کتاب مولانا نے جب لکھی تو ان کی عمر بہت تھی لیکن ان کی بڑی شہرت ہوئی اور ان کے مرشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اسے پڑھ کر اپنا تأثر ظاہر کیا کہ یہ اسلام کا آہنی قلعہ ہے اس کتاب کا عربی ترجمہ مولانا واضح رشید حسنی ندوی نے کیا اور اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

پھر مولانا عبدالباری صاحب نے باوصف اپنے جدید علمی امتیاز کے تربیت باطنی کی خاطر مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے استرشاد کا تعلق قائم کیا تو استرشاد کے حصول کے ساتھ ان کے باطنی علوم کو اپنے محققانہ اور عصر حاضر کے اسلوب میں پیش کرنے کے سلسلہ بھی قائم کیا اور کئی ایسی کتابیں تصنیف کیں جن میں تصوف وتربیت باطن کے اسرار کی تشریح وتوضیح اس انداز سے کی کہ تصوف کے سلسلے میں اہل حق کے ذہنوں میں جو بعض اشکالات پیدا ہورہے تھے مولانا کی تشریحات وتوضیحات سے دور ہوئے، اور اس طرح علم ومعرفت کے دینی پہلو میں بھی مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ایک مجددانہ تحقیق کا کام انجام دیا، اسی سلسلہ میں ان کی اہم کتاب تجدید دین کامل اور تجدید تصوف وسلوک خاص طور پر قابل ذکر ہے تجدید تصوف وسلوک کو عربی میں منتقل کرنے کی سعادت ہمیں حاصل ہوئی اور بین التصوف والحیاۃ سے عرب ممالک میں اور پھر ہندوستان سے المنہج الاسلامی لتربیۃ النفس کے عنوان سے مولانا کے صاحبزادگان نے شائع۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے علمی تحقیق وتصنیف کی خصوصیت علامہ شبلی نعمانی

سے تلمذ حاصل کر کے حاصل کی تھی، جس کے وہ معترف تھے، اپنی اس علمی تحقیق وتصنیف کی خصوصیت کو انھوں نے فلسفہ وسائنس کو اسلامی نظریات پر منطبق کر کے اپنے امتیازی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے علم باطن کے اسرار کے لیے بھی استعمال کیا اور یہاں بھی اپنا امتیاز ثابت کیا۔

اس طرح انھوں نے عظیم مفکرین ومحققین کے درمیان اپنا مقام بنایا، اور یہ سب انھوں نے علوم جدیدہ کے اپنے شخصی مطالعے سے کیا، ورنہ ان کی تعلیم دینی مدرسے میں ہوئی تھی، عصر جدید کی درسگاہوں میں وہ طالب علم کی حیثیت سے نہیں، معلم کی حیثیت سے گئے، اور وہاں اس میدان میں بھی اپنے تفوق کا ثبوت دیا۔

وہ کئی عصری کالجوں میں پروفیسر رہے، پھر حیدرآباد کی یونی ورسٹی میں اپنے اسی علمی مقام کی بنا پر پروفیسر مقرر ہوئے، نظام حیدرآباد کے سامنے ان کا یہ تعارف کرایا گیا کہ **''ان کے ہاتھ پر اسلام لایا ہے۔''** انھوں نے اپنی اس جامع علمی خصوصیت کے باوجود مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فیض باطنی حاصل کرنا جاری رکھا بلکہ اس کو اپنی زندگی میں سمو دیا۔ ان کی ایک یہ بھی خصوصیت رہی کہ حضرت تھانویؒ کے افکار وارشادات اور سلوک ومعرفت کو وقت کے نئے اسلوب وزبان میں پیش کرنے کا کارنامہ انجام دیا، اس طرح جدید ذہن کے لیے ان کو سہل الفہم بنا دیا، اور اس طریقے سے بہت مفید اور اہم کام انجام دیا۔

ان کو خود ذاتی زندگی حضرت تھانویؒ کے پرتو سے ایسی متاثر ہوئی کہ ان سے ملنے والے ان کیفیات وحالات سے صرف واقف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنی زندگیوں میں ان کو داخل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ایک تڑپ تھی کہ کس طرح لوگ اپنی سیرت وکردار کو دینی روح سے آراستہ کریں، جو بھی ان سے ملتا وہ اچھے انداز میں اس کی تلقین کرتے، ان کی یہ بات اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ان کے ملنے والوں کے سامنے پوری طرح نمایاں ہو جاتی تھی، اس مجھے بھی بارہا تجربہ ہوا۔

بہرحال مولانا عبدالباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں لائنوں میں خصوصی علمی کام انجام دیا، وہ ایک طرف تصنیف وتالیف کے ذریعے سے حضرت تھانویؒ

کے رشد وہدایت کی باتوں کو وقت کے جدید اسلوب نگارش میں پیش کرتے رہے اور دوسری طرف اپنے ملنے والوں اور تعلق رکھنے والوں کو دین کے صراط مستقیم کو اختیار کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ اس طریقے سے انھوں نے غیر معمولی کام انجام دیا، اور وہ خود اپنی ذاتی زندگی میں بھی بڑی احتیاط اور صلاح وتقویٰ کے حامل رہے، اور اصلاح وارشاد کے کام کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کیا، اور اس طرح ان کی زندگی بڑی قابل استفادہ گزری، ایسا آدمی جو فائدہ پہنچانے والے حالات رکھتا ہے اپنی جسمانی موت سے ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے ملفوظات وارشادات قائم رہتے ہیں، اور اس سے آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاتی ہیں جن کو اس شخصیت سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

مولانا کا سانحہ ارتحال جو ۳۰ رجنوری ۱۹۷۶ء لکھنؤ میں پیش آیا، علمی دینی حلقوں کے لئے خاص طور پر کسی بڑے حادثے سے کم نہیں اللہ تعالیٰ انہیں دینی جوار رحمت میں جگہ دے اور راضی ہو مولانا کے صاحبزادگان میں خاص طور پر الحاج فضل الباری صاحب اور حافظ احمد الباری صاحب مولانا کی کتابوں کی اشاعت کی فکر رکھتے ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت دے اور مزید توفیق دے۔ بڑے صاحب زادے جناب شمس الباری پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور وہیں وفات پائی سب سے چھوٹے عبید الباری صاحب ہیں ایک صاحبزدای مولوی ایوب ہاشمی ندوی کو منسوب ہوئی اور دوسری صاحبزادی کا نکاح بھی دین پسند گھرانے میں کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے برکات ان کے گھر میں اور گھر کے باہر قائم دائم رکھے۔ آمین

مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ہندوستان کے علماء میں بڑی مایہ ناز شخصیت رہی ہے، خاندانی لحاظ سے اور اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے اور علماء کے باوقار اور اصحاب کردار اور شیریں اخلاق کی خوبیوں کے لحاظ سے نمونے کی حیثیت رکھتے تھے، اُن کو اپنے عہد کے عظیم المرتبت مرشدوں کی صحبت و تربیت حاصل رہی، اور علوم دینیہ کے فروغ کے معاملے میں اپنے جد مکرم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی وراثت کا حصہ وافر ملا تھا، اور وہ اپنی نرم خوئی اور محبت آمیز رویہ سے دلوں کو موہ لیتے تھے، چنانچہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں میں بہت مانوس عالم دین تھے، وہ اپنی خوش اخلاقی اور نرم خوئی کے ذریعے ملک سے بہت سے سربرآوردہ اشخاص کی اصلاح کا اور دین سے ان کی وابستگی بڑھانے کا ذریعہ ہے، ان کی مجلسیں دینی لحاظ سے گل گلزار ہوتی تھیں، اور اُن کے وعظ اتنے پسندیدہ ہوتے تھے کہ لوگ بڑے ذوق وشوق سے آخر تک سنتے اور فائدہ اُٹھاتے تھے، اُن کے وعظ کا خاص انداز تھا، جس میں وہ منفرد تھے، انھوں نے اپنی خصوصیات اور دینی صفات کے لحاظ سے ایسا مقام حاصل کرلیا تھا کہ ملک کے گروہ علماء میں ان کو بہت بلند اور معدودے چند بلند مقام رکھنے والوں میں شمار کیا جاتا تھا، اور ملت اسلامیہ کے خصوصی قائدین اور رہنماؤں میں شمار کیا جاتا تھا، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ قائم ہوا تو وہ اس کے بالاتفاق صدر منتخب ہوئے، ان کی اصلاحی وتبلیغی خدمات بھی بڑی گرانقدر ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''علم وفضیلت، بصیرت وسعتِ علم، اور علم کی پختگی ورسوخ، خدمت دین اور اس کے ساتھ اصلاح ووعظ وارشاد، عوام سے رابطۂ تربیت ودعوت، بیعت وارشاد ان سب

پہلوؤں اور گوشوں پر ان کی زندگی محیط تھی، واقعہ یہ ہے کہ شاید (کم سے کم ہندوستان میں) کسی علمی و دینی شخصیت کو کم ایسی ہر دل عزیزی، عام شہرت ومقبولیت اور مختلف دینی اداروں اور جماعتوں کا اعتماد حاصل ہوا ہوگا، جو ان کو حاصل تھا، اس کے ساتھ ان کو طویل عرصے تک دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم وجلیل اور بین الاقوامی شہرت کے ادارے کی خدمت اور ترقی کا موقع ملا، ان کی اس عام مقبولیت اور جامعیت اور ان کے ذات کے اختلافات سے بہت حد تک بالاتر ہونے کا نتیجہ تھا کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے لیے (جو ہندوستان کے مختلف الخیال گروہوں دینی جماعتوں اور اداروں کا نمائندہ ہے بروز اول سے ان کی وفات کے دن تک ان سے زیادہ موزوں اور متفق علیہ صدر نظر نہیں آیا، اور وہ اس عہدے بہ اتفاق آرا اس کے قیام کے پہلے دن سے وفات کے ان تک صدر رہے، ان کو نبیرۂ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (م ۱۲۹۷ھ) ہونے کی نسبت گرامی کا شرف حاصل تھا، اور وہ نصف صدی تک مسلسل اس مؤقر اور عظیم ادارے کے منصب اہتمام پر فائز رہے۔ اور ان کے دور اہتمام میں اس ادارے نے ایسی ترقی کی جو اس کے ابتدائی دور کے دیکھنے والوں کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی، انھوں نے بڑے بحرانی موقعوں پر اس ادارے کی حفاظت اور رہنمائی کی، انھوں نے اپنا نام اور زندگی اس ادارے کے نام اور اس کی زندگی سے ایسی وابستہ کردی تھی کہ ان میں سے ایک کا تصور دوسرے کے ساتھ آتا تھا، کاش کہ وہ اس سے علاحدگی کا داغ اٹھائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوئے، انسان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور سخت سے سخت بات برداشت کرے، راقم نے قاری صاحب کو اس معاملے میں بہت عالی ظرف اور قوی الارادہ پایا، واقفیت رکھنے والے پورے حلقے میں یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ قاری صاحب نہایت کریم النفس، بڑے شیریں اخلاق، نرم خو، نرم رو، اور نرم گفتگو تھے، اقبال نے جو کہا کہ ع

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو

یہ تعریف قاری صاحب پر صادق آتی ہے" (پرانے چراغ حصہ سوم، ص ۱۹۳، ۱۹۴)

حضرت قاری صاحب مصلحین امت میں بھی شمار کیے گئے، اور صرف ہندوستان، ہندوستان باہر برصغیر اور یورپ وافریقہ کے ممالک میں بھی ان سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا، ان کی تقریروں، تحریروں کے علاوہ ان کی مجالس وملفوظات اور بیعت وارشاد کے ذریعے بھی ان کا علمی، دینی وروحانی فیض عام ہوا، وہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ممتاز خلفاء میں تھے، اور حضرت کو ان سے خاص انس وتعلق تھا، یہی وجہ تھی کہ ازراہِ شفقت حضرت نے آپ کے صاحبزادے وخلف اکبر مولانا محمد سالم قاسمی صاحب حال مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کو ابتدائی اسباق کی تعلیم دی۔

اس حقیقت سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا کہ حضرت قاری صاحب نے دارالعلوم دیوبند بڑا فیض پہنچایا اور خواص کے حلقے سے اٹھا کر عوام میں اس کی ایسی پہچان بنائی کہ مسلک کی وہ علامت بن گئی، ان کے عہد میں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث وصدر مدرس شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ رہے، جن سے آپ کو بڑی تقویت پہنچی اور بعد میں بھی جو حضرات ان کے جانشین ہوئے وہ بھی تقویت کا ذریعہ بنتے رہے، اس طرح حضرت قاری صاحب کو اچھے معاون رفقاء بھی حاصل ہوئے، راقم کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ان کے عہد میں دارالعلوم میں کچھ عرصہ تعلیمی زمانہ گزارا، اور ان کی سرپرستی حاصل کی۔

دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تعلیمی ودعوتی تقریبات اور اس مناسبت سے ملک اور بیرون ملک سے علماء، خواص اور عوام کا اجتماع یہ ان کا آخری بڑا کارنامہ تھا، لیکن ان کی صحت پر جس بات نے زیادہ اثر ڈالا وہ دارالعلوم کے کچھ ایسے مسائل تھے جو اندرونی تھے لیکن وہ باہر آئے اور صحافت وسیاست کی نظر ان پر لگ گئی اور کچھ ہی عرصہ بعد ماہ شوال المکرم ۱۴۰۳ھ (مطابق جولائی ۱۹۸۳ء میں انتقال فرما گئے اور ایسا خلا چھوڑ گئے جس کا پر ہونا آسان نہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مقربین میں جگہ دے اور ان کی برکات کو قائم ودائم رکھے آمین۔

علامہ عبدالفتاح ابوغدہ حلبیؒ

ادھر قریبی عرصے میں جن عظیم المرتبت علمی اور دینی شخصیتوں نے داغ مفارقت دیا ان میں ایک اہم ترین اور نمایاں نام علامہ محدث محقق العصر شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا بھی ہے، وہ رجب ۱۳۳۶ھ موافق ۱۹۱۷ء میں حلب (شام) میں پیدا ہوئے، اور ان کا خاندان قریشی مخزومی ہے اور وہ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کی نسل میں ہیں، مسلکاً حنفی تھے، وطناً حلبی تھے، ان کے والد محمد بن بشیر بن حسن ابوغدہ کا انتقال ۱۳۶۱ھ (مطابق ۱۹۴۲ء) میں ہوگیا تھا اور اس وقت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا پورا خاندان علم دین سے وابستہ تھا، اور اس کے ساتھ دینی حمیت اور ملی غیرت کی صفات سے بھی متصف تھا، ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالکریم ابوغدہ نے فرانس سے مقابلے میں حصہ لیا اور غلبہ حاصل کیا، شیخ عبدالکریم کے بیٹے ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ نے فقہ وشریعت کے علم میں رسوخ پیدا کیا، خاص طور پر اس میں انھوں نے معاشیات ومعاملات کو موضوع بنایا، دوسرے بھائی شیخ عبدالغنی ابوغدہ کے بیٹے ڈاکٹر حسن ابوغدہ کی کتاب قیدیوں کے احکام ومسائل پر اور ''احکام السجن ومعاملۃ السجناء فی الإسلام'' اس موضوع پر منفرد کتاب ہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے والد بڑے نیک صفات اور متدین وعبادت گزار شخص تھے، تلاوت قرآن کریم کا بڑا معمول تھا، اور علماء ومشائخ کی صحبت میں خاص خاص وقت وقت گزارے اور ان کی مجالس وملفوظات سے مستفید ہوئے، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ پر سب سے پہلے اسی کا رنگ چڑھا، پھر وہ مدرسے میں داخل ہوئے، اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدرسہ خسرویہ کا انتخاب کیا، جو وزیر دولت عثمانیہ خسرو باشا کا قائم کردہ تھا، یہاں چھ سال کا عرصہ گزرا، اور اس عرصے میں وہ ممتاز اور سب پر فائق رہے، اس کے بعد انھوں

نے جامع ازہر مصر میں ۱۹۴۴ء میں داخلہ لیا اور کلیۃ الشریعہ سے ۱۹۴۸ء میں عالمیت کی سند حاصل کی، پھر کلیۃ اللغۃ العربیہ میں تخصص کر کے ۱۹۵۰ء میں فراغت حاصل کی ساتھ میں علم النفس میں سند حاصل کی، پھر اپنے وطن حلب (شام) سے آ گئے، پھر حلب کے مدارس اور اس کے بعد جامعۃ دمشق میں تدریسی خدمت انجام دی، پھر جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض منتقل ہو گئے، فقہ میں ان کے استاد علامہ مصطفیٰ الزرقاء اور مفتی احمد الحجی الکردی رہے، ان کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ انھوں نے فقہ حنفی کے ساتھ فقہ شافعی میں درک حاصل کیا، اس لیے کہ یہ دونوں مسلک بلاد شام میں رائج تھے۔

بلاد عرب وعجم میں جن بڑی شخصیات سے علامہ عبدالفتاح ابوغدہ نے استفادہ کیا، ان میں علامہ محمد زاہد کوثری جن سے ان کو خاص ربط اور تعلق ومحبت تھی، اور امام حسن البنا شہید جن سے انھوں نے اپنے زمانۂ قیام مصر میں ربط قائم کیا تھا، اور اپنے پورے زمانۂ قیام مصر میں جب تک وہ حیات رہے ان کی خدمت میں حاضری اور ان کے دروس ومحاضرات میں شرکت کی پوری پابندی کی، اور ان کو چار سال کا یہ مبارک عرصہ ملا، اور اس سے ان کے اندر وہ حوصلہ اور جرأت اور حمیت پیدا ہوئی جس نے ان کو عالم اسلام کا ایک درخشاں ستارہ بنا دیا، برصغیر کے علماء میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا محمد یوسف کاندھلوی، مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی (کراچی) علامہ یوسف بنوری (کراچی) مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی محدث سے استفادے کے لیے انھوں نے باقاعدہ سفر کیا، اور وہ ندوۃ العلماء سے تعلق کی بنا پر کئی بار دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کو محبت تھی اور وہ بھی ان سے محبت کرتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کی تشریف آوری سے مجھے بھی ان سے استفادے کا موقع ملا، اور میں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس ایک دردمند دل، اور ایک روشن دماغ ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض فضلاء ان سے استفادے کے لیے ریاض گئے جہاں وہ جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ سے وابستہ تھے، انھوں نے اپنے ان ندوی خوشہ

چینوں پر بڑی شفقت فرمائی جن میں عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ان سے خصوصی طور پر استفادہ کیا، اور اپنے استاد کا بڑا اعتماد حاصل کیا، وہ ان کے مقالے کے مشرف بھی رہے۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے شاگردوں میں شیخ محمد عوامہ، مولانا محمد تقی عثمانی اور بھتیجے شیخ عبدالستار ابوغدہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے کہ اللہ نے ان کو سعادت مند اولاد عطا فرمائی جو سب کے سب صاحب علم وفضل ہیں، شیخ محمد زاہد ابوغدہ اور شیخ سلمان ابوغدہ اور اسی طرح ان کے داماد استاد احمد براء الأمیری، ان سب نے ان سے علم ودین میں کسب فیض کیا۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی خدمات کا اعتراف بلاد عرب وعجم میں کیا گیا، ان کو ہندوستان کی شخصیات سے خاص لگاؤ تھا، اور علامہ عبدالحی فرنگی محلی کی کتابوں کو خاص طور پر انھوں نے موضوع تحقیق بنایا، اور ان کو عام کیا، ان کے علاوہ علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی کی بھی بعض کتابوں کو جو علم حدیث سے متعلق تھیں ایڈٹ کیا، اسی طرح اپنے معاصر محقق عالم مولانا عبدالرشید نعمانی جے پوری کی امام ابوحنیفہ پر کتاب کی بھی تحقیق کی اور شائع کرایا، اور ان کی دوسری کتاب الإمام ابن ماجه و كتابه السنن کی بھی تحقیق کی اور اس کو بھی طباعت کے اعلیٰ اور جدید معیار میں شائع کرایا، اور اپنی ''کتاب صفحات من صبر العلماء'' پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے مقدمہ لکھوایا، نومبر ۱۹۹۲ء میں وہ ہندوستان آخری بار تشریف لائے اور اس سفر میں بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء کا خیال رکھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کا کئی دن قیام رہا، محاضرات بھی ہوئے اور اجازت حدیث کی ایک نشست بھی ہوئی، جس میں دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ بھی شریک ہوئے، مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوئی اور خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بھی ان کی تکریم میں اس موقع پر تشریف فرما رہے، اسی سفر میں شیخ عبدالفتاح ابوغدہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالم ربانی حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی کی زیارت وملاقات

کے لیے ان کے وطن ہتھورا باندہ تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے وطن تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی بھی تشریف لائے، اور یہ ان کے اس تعلق ومحبت کی بات تھی جو ان کو دینی شخصیات سے تھا۔ ان راحت کے لئے اس سفر میں ندوۃ العلماء سے مولانا محمد مرتضیٰ صاحب بستوی ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء مولوی سید سلمان حسینی ندوی قاضی فاروق بھٹکلی صاحب بھی ساتھ تھے اور استفادہ کے لئے عزیزی سید محمود حسن حسنی ندوی اور مولوی ظفر الدین ندوی بھی ساتھ ہوگئے تھے اس سفر میں وہ جہاں گئے وہاں ان کے لئے مسند حدیث سجائی گئی اور انہوں نے سبھی سامعین وحاصرین مجلس اور اپنے رفقاء سفر کو اجازت بھی دی ہتھورا باندہ میں حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نے ان کے سامنے صحیح بخاری شریف کی حدیث کی قرأت بھی کی۔

وہ رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن تاسیسی بھی تھے، اور شام (سوریا) میں دو بار اخوان المسلمون کے رئیس (مرشد) منتخب ہوئے، اس کے علاوہ جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) کی مجلس علمی اور المجمع العلمی عراق کے ممبر بھی تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ کئی بار تشریف لائے، لیکن بحیثیت استاذ زائر کے ۱۳۹۹ھ میں ان کی تشریف آوری ہوئی، اس موقع پر طلبہ، اساتذہ اور ذمہ داروں نے بھی ان کے دروس ومحاضرات میں شرکت کی اور یہ ایسے پُر بہار ایام تھے جس کے نقوش آج بھی تازہ ہیں۔

ان کے اعزاز وتکریم میں جو نشستیں دنیا کے مختلف حصوں میں ہوئیں ان میں سب میں ممتاز نشست استاد عبد المقصود خوجہ کے مکان پر نشست تھی جس میں عالم اسلام وبلاد عربیہ کی چیدہ وچنیدہ شخصیتیں جمع تھیں جو شیخ عبد الفتاح ابوغدہ کو ان کی علمی ودینی خدمات پر خراج تحسین پیش کررہی تھیں، یہ حفلۂ تکریم ۱۵/ ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ کو دوشنبہ کے دن منعقد ہوئی تھی، اور جن ممتاز شخصیتوں نے اس میں شرکت کی تھی، ان میں شیخ علی طنطاوی، شیخ مصطفیٰ الزرقاء، استاذ محمد علی الھاشمی، شیخ محمد عوامہ، شیخ ضیاء الدین صابونی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جہاں تک ان کی تصنیفات اور تحقیقات کا تعلق ہے چھوٹی بڑی ۶۷ کتابیں ہیں اور جس میں ایک علمی کارنامہ علامہ ابن حجر عسقلانی کی رجال حدیث میں اہم کتاب لسان المیزان کی تحقیق ہے جس کی اشاعت وطباعت ان کی وفات کے بعد ان کے خلف رشید استاد سلمان ابوغدہ کی خصوصی توجہ اور فکر سے ہوئی اور دس ضخیم جلدوں میں وہ منظر عام پر آئی۔

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کا سانحۂ وفات اتوار ۹/شعبان المکرّم ۱۴۱۷ھ کو ریاض (سعودیہ) میں پیش آیا، ان کی عمر ۸۱ سال تھی، اور جنازہ مدینہ منورہ لے جایا گیا، جہاں دوسری نماز مسجد نبوی شریف میں ہوئی اور جنت البقیع میں تدفین عمل میں آئی، اور متعدد ممالک میں غائبانہ نماز ادا کی گئی، ان کے صاحبزادے شیخ سلمان ابوغدہ کہتے ہیں کہ روح پرواز ہونے سے پہلے جو آخری جملہ ان کی زبان سے ادا ہوا وہ کلمۂ توحید لا إله إلا الله تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی سبھی علمی ودینی خدمات وحسنات کو قبول فرمائے اور اس کے نفع کو زیادہ سے زیادہ عام فرمائے۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانیؒ گزشتہ صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے اصلاح معاشرہ اور دعوت حق کے کام میں بہت توجہ اور فکرمندی کے ساتھ حصہ لیا، اور اپنے ماہنامہ کے ذریعے سے جو ''الفرقان'' کے نام سے انھوں نے شروع کیا تھا، عقائد کی اصلاح اور اعمال حسنہ کی تلقین اور بھٹکے ہوئے ذہنوں کی اصلاح کی خدمت اپنی تحریروں اور اپنے رفقاء دعوت کی تحریروں کے ذریعے انجام دی۔ ان کا ربط و تعلق یوں تو اپنے وقت کے اکثر دعوتی کام کرنے والے اور شیوخ اصلاح وارشاد سے رہا، لیکن بعض عظیم شخصیتوں سے ان کی تحریکی کام میں بھی مشارکت رہی، اسی سلسلے میں انھوں نے اپنے کاموں کی ابتدا اہل بدعت وضلال سے مناظروں کے ذریعے کی، پھر مثبت کام کے اس رجحان کی تائید کی جو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے فکر اور طریقہ کار سے تعلق رکھتا تھا، بلکہ مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ کی تحریکی ابتدا کے موقع پر بھی انھوں نے ان سے مشارکت کی، بعد میں حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ کی دعوت وتبلیغ سے قریبی واقفیت پر اپنی عملی وتحریکی توجہات ادھر منتقل کردی۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک کو عملی طور پر پوری طرح اپنالیا، البتہ ان کا عمل، دعوت فکر، تحریری طریقے سے بھی جاری رہا، جو ''الفرقان'' کے ذریعے اور تصنیفی طریقے سے بھی انجام پاتا رہا، اور اس طریقے سے ان کے دعوتی اور فکر اسلامی کے عمل کے دو پہلو ہیں: ایک خالص عملی، جو مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے طریقہ کار کے مطابق تھا۔ دوسرا فکری وعلمی جو تحریر وتصنیف کے ذریعے ہوتا تھا، مولاناؒ کو حالات زمانے کے سامنے رکھتے ہوئے اس کا تقاضا بھی شروع سے رہا کہ ان کو ان کے ہم فکر وہم ذوق رفقاء بھی حاصل ہوں۔ اس سلسلے میں ان کو کئی رفقاء ملے جن میں سب طویل

مدت کے لیے بلکہ ان کی مذکور کوششوں کے آغاز سے وفات تک جاری رہنے والی رفاقت، طریقہ عمل اور انداز فکر وذوق میں مشارکت مولانا سید ابوالحسن صاحب ندویؒ سے رہی، یہ مشارکت اتنی قوی ہوگئی کہ دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوگئے تھے، عملی کاموں میں بالکل حقیقی بھائیوں کی طرح ہوگئے تھے، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ مشارکت فکری کے وقت سے لے کر بعد میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کے طریقہ کار سے وابستگی کے عہد میں دونوں شریک کار رہے۔ اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ تحریری اور تصنیفی کاموں کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں دونوں ہم خیال رہے۔ اور اپنے اپنے دائرے میں یہ خدمت بھی انجام دیتے رہے، اور دیگر دینی دلچسپیوں میں دونوں ایک دوسرے کے مشیر اور بڑی حد تک رفیق کار رہے، اس میں وہ دور بھی آیا جب ملت کے نیم سیاسی مقاصد کے لیے کوششیں کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی، جس میں جماعتی سیاست سے الگ رہتے ہوئے ملی مصالح کے نیم سیاسی طریقوں کو اختیار کیا، چنانچہ دینی تعلیمی کونسل جس کے صدر مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ہوئے اور مسلم مجلس مشاورت جس میں دونوں نے قائدانہ حصہ لیا اور خود ندوۃ العلماء کے تعلیمی وانتظامی معاملات جس کے ذمہ دار مولانا ابوالحسن ندویؒ تھے، میں مشوروں اور تعاون سے پوری شرکت کی۔ یہ سلسلہ نمایاں طریقے سے اس وقت تک چلا ہے جب مولانا نعمانی کو ایک سڑک حادثے میں چوٹ لگی، اس کی وجہ سے ایک معذوری کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور اس کی وجہ سے اپنی اختیار کردہ مصروفیات کو کم کرنا اور کچھ چھوڑنا پڑا، اور مزید یہ بات بھی پیش آئی کہ ایک مدت تک قیام ایک ہی عمارت میں یعنی لکھنؤ کے مرکز تبلیغ میں تھا، وہ بدل کر مولانا دوسری جگہ ایک مکان میں، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء میں رہنے لگے۔ ان سب کی وجہ سے وہ بات نہ رہی، لیکن تعلق اور عملی مشارکت جاری رہی۔

مولانا منظورؒ نعمانی کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیتوں اور جذبۂ عمل سے نوازا تھا۔ جس پر نمایاں طور پر ان کی کوششوں اور مشغولیتوں میں نظر آتا تھا۔ اپنی صلاح وفلاح کے

لیے ایک تڑپ اور مسلمانوں کی اصلاح حال کے لیے ایک اعلیٰ جذبہ صاف محسوس کیا جاتا تھا، جس کے لیے جو مروجہ طریقہ ان کے سامنے آیا ان کو انھوں نے اختیار کیا۔ چنانچہ درس قرآن وحدیث اور عوامی خطاب کے موقعوں پر اور اپنے اہل فکر کی مجالس میں اپنی بات کہتے اور توجہ دہانی کے عمل کو برابر اختیار کرتے رہے، اس کے ساتھ ساتھ شخصی زندگی میں عبادت اور سنت کی اتباع کی پوری کوشش اور اصلاح باطن کی پوری فکر صاف دیکھی جاتی تھی۔ وہ ایک طرف رہبر ملت اور واعظ وخطیب اور معلم ومصنف اور اصلاح معاشرہ کی کوششوں اور تبلیغ دین میں عملی شرکت کی تو دوسری طرف وہ تصوف وتزکیہ کی راہ کے رہبر بھی تھے اور حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔ حضرت سے پہلے ان کا بیعت واسترشاد کا تعلق اپنے استاذ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔

مولاناؒ نے ان مذکورہ خصوصیات کی بنیاد پر امت کے اس طبقے پر جس سے ان کو واسطہ پڑا بہت مفید اثر ڈالا اور اپنی تحریری کوششوں سے ان کے لیے بہت اچھا مواد اکٹھا کر دیا، ان کا اسلوب تحریر بلکہ اسلوب تقریر بھی سادہ اور عام فہم ہوتا تھا اور دین کی بنیادی اور عملی تعلیمات کے موضوع کو ترجیح حاصل رہتی تھی۔ چنانچہ ان کی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' سے اسلامی بنیادی تعلیمات کو واضح اسلوب میں پیش کرنے کا اچھا نمونہ سامنے آیا۔ اور کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا، اس کے علاوہ مولانا نے درس حدیث کا ایک سلسلہ اپنے رسالے الفرقان میں شروع کیا تھا، جو مختلف موضوعات پر مفید ہوتا چلا گیا اور پھر مولانا نے اس کی افادیت محسوس کرتے ہوئے اسے معارف الحدیث کے نام سے کتابی شکل دے دی جو آٹھ (۸) جلدوں پر مشتمل ہے اور زندگی سے تعلق رکھنے والی ہے، وہ مولانا کا امت کے ایسے اہل علم حضرات کے لیے جو عربی سے واقف نہیں ہیں ایک بہت قابل قدر تحفہ ہے جو مولانا کے لیے برکت اور آخرت میں اجر کا یقیناً بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ان کے علاوہ دین کے متعدد اور متنوع موضوعات پر بھی مولانا کی کتابیں ہیں جو مولانا کے اس دنیا سے آخرت کی طرف رخصت ہونے کے بعد ان کے شروع کیے ہوئے عمل کے جاری رہنے کا ذریعہ اور ان کی یادگار ہے۔ مولانا کے چار صاحبزادگان ہیں جو سب کے سب علم دین کے حاصل کرنے والے ہیں اور ان میں سے متعدد اپنے علمی اور دعوتی صلاحیتوں کے لحاظ سے معروف اور معاشرے پر اثر انداز ہونے والے ہیں۔ انھوں نے مولانا کے جاری کردہ رسالے الفرقان کو اس کے مقاصد کے تحت قائم رکھا، اس سلسلے میں مولانا مرحوم کی نیابت کررہے۔ ان میں سب سے بڑے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی علمی اور فکری راہ میں اپنے قلم سے خدمت انجام دے رہے ہیں اور چھوٹے صاحبزادے مولوی خلیل الرحمٰن سجاد ندوی انتظامی اور عملی کاموں میں اپنے شخصی دائرے کے اندر رہتے ہوئے مصروف ہیں۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے دینی کاموں میں مشارکت اور رفاقت ایک تابناک دور کی حیثیت سے یاد رکھا جاسکتا ہے کہ اس میں ملت اسلامیہ کی جو ملی مشکلات اور دینی تقاضے اور فکری رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کو پوری توجہ اور فکرمندی سے کام میں لگایا اور ایک طرف مسلمانوں کے عوامی طبقے کو وعظ و نصیحت کے راستے سے فائدہ پہنچایا اور دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقوں کی دینی الجھنوں اور بے اعتنائی کو رفع کرنے کا مفید کام انجام دیے۔

تیسری طرف شریعت اسلامی کے تحفظ اور دینی تعلیم کے میدان میں جو خطرات اور تقاضے تھے ان کی بھی ضروری فکر کی اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس کے مسائل کو حل کرنے اور شریعت اور دینی تعلیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوششوں میں نمایاں حصہ لیا۔ اور اسی بنا پر ہندوستان کی ملت کے رہبروں میں ان دونوں کا نام ایک ساتھ چلتا ہے، اور ان کاموں میں ان دونوں کی مشارکت ایسی رہی کہ خاصی مدت تک دونوں کا کام ان کوششوں کے سلسلے میں نمایاں اور ایک ساتھ آتا رہا، اور متعدد ملی تحریکوں کے قیام کے سلسلے

میں ان کا نام سرفہرست رہا، مثلاً دینی تعلیمی کونسل، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور بعض غیر سیاسی ملی تنظیمیں ہیں جنھوں نے مثبت اور تعمیری کام کو اپنا مقصد بنایا۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ کو جب سے صحت کی معذوری پیش آئی اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے درمیان مشارکت اور رفاقت اس طرح نہیں رہی جس طرح پہلے تھی، لیکن دونوں کی فکری اور عملی کوششیں اپنی اپنی جگہ پر جاری رہیں۔ حسب ضرورت مشورے کے ذریعے مشارکت رہی، دونوں شخصیتوں کی ایک دوسرے سے وابستگی اور قرب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ دونوں کے خاندان کے آپسی تعلقات بہت قریبی اور محبانہ تھے، اس طرح ملت کے لیے فکرمندی اور حسب تقاضائے وقت کام میں یکجہتی اور مشارکت سے ملت کی ضرورت کے لیے کوشش کو بڑی تقویت حاصل رہی۔ دونوں حضرات کی معاصرت اور مشارکت کے آخری دور میں دونوں کے دیگر رفقاء اور معاونین کے اپنے اپنے رجحانات کے کچھ اثرات ان دونوں حضرات کی فکری یکجہتی پر کسی حد تک پڑے جس کی بنا پر بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ دونوں کی مشارکت و رفاقت میں دراڑ پیدا ہوگئی ہے لیکن لوگوں کے اس خیال میں سوءظن کا اثر تھا اور حقیقت میں دونوں کے مابین آپسی محبت اور تعلق خاطر قائم رہا۔ دونوں کی صحت کی کمزوری اور بڑھاپے کے اسباب نے ان کے معاونین پر کام کی ذمہ داریاں بڑھادی تھیں اور وہ معاونین جو ان کے نائبین ہوئے وہ آپسی تعلق کے ساتھ ساتھ ملت کی جو خدمت ان کے کرنے کی ہے، وہ انجام دے رہے ہیں اور ان کے سامنے اپنے بڑوں کا نمونہ ہے۔ بہرحال ان عارضی اور وقتی حالات کو اہمیت دینے کی ضرورت نہیں، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ دونوں شخصیتوں نے کیا اثر ڈالا اور شمع کی حیثیت سے مسلم معاشرے کو کیا فائدہ پہنچایا اور اپنا جو علمی و دعوتی سرمایہ چھوڑ گئے تھے اس کی کیا اہمیت ہے اور اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں!

مولانا منظور نعمانی جو ایک عظیم شخصیت کے حامل تھے انھوں نے ملت کے مسائل کے حل کرنے کے لیے اور شریعت و دین کے تحفظ کے کام کو اس عہد میں شروع کیا تھا جب

وسائل کی بہت کمی تھی اور حالات بہت کم ساز گار تھے اور دشواریاں خاصی تھیں۔ ان میں اپنا راستہ بنانا اور مقصد کی طرف عزم وہمت کے ساتھ بڑھنا اور اسلامی فکر ور جحان کی آبیاری کرنا ایک عظیم کام تھا، جس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایسی شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں اور جو ہوتی ہیں وہ اپنے کام کے تذکروں کو تاریخ کا باب بنادیتی ہیں۔ میں نے مولاناؒ کو ان کے مختلف کاموں اور مختلف حالات میں ان کی فکر مندیوں کو دیکھا ہے اور مجھے ان سے اپنے ماموں مولانا ابوالحسن علی صاحب ندویؒ کے توسط سے بہت قربت حاصل کرنے کا موقع ملا اور ان کی شفقت سے سابقہ پڑا، حضرت مولانا علی میاں میرے ماموں اور سرپرست تھے، ان کے سفر یا غیر موجودگی میں مجھے مولانا کی شفقت اپنے لیے اپنے ماموں کی شفقت کے قائم مقام معلوم ہوتی تھی۔ مولانا کی توجہات اور مشورے اور میرے ساتھ جو ان کا احساس تعلق تھا، مجھے برابر یاد ہے اور میرے دل میں ملی طور پر بھی اور ذاتی طور بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ مولانا کی معذوری وعلالت کے سلسلہ طویل رہا لیکن اس میں بھی ان کی علمی مشغولیات جاری رہیں اور ایرانی انقلاب سے متعلق ان کے قلم سے بڑی اہم تصنیفات سامنے آئی، جب میں انہوں نے خمینی صاحب کے افکار اور شیعیت کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا اور اسلام کے لئے بڑا خطرہ بتایا۔

مولانا کے چار صاحبزادے ہوئے جن میں بڑے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سنبھلی ہیں اور وہ اعلیٰ تصنیفی وتحریری صلاحیت رکھتے ہیں اور لندن میں مقیم ہیں ان سے چھوٹے حفیظ الرحمٰن نعمانی صاحب نے صحافت کا میدان اختیار کیا، ان سے چھوٹے مولوی محمد حسان نعمانی صاحب ندوی ان کے قائم کردہ دارالاشاعت الفرقان بکڈپو کے نگراں وذمہ دار ہیں، اور سب سے چھوٹے فرزند عزیزی مولوی خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی ندوی ملی دعوتی کاموں میں مصروف رہ کر ماہنامہ ''الفرقان'' کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہیں اور داماد مولانا محمد زکریا ندوی سنبھلی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کے بڑے استاد اور شعبہ حدیث کے ذمہ دار ہونے کے ساتھ کلیۃ الشریعہ کے عمید بھی ہیں۔

مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندویؒ

مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے عالم دین اور استاذ معلم ہونے کے ساتھ ساتھ صالح و موقر بزرگ اور مربی بھی تھے۔ وہ نگرام ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اور ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور دین و علم دین کی خدمت میں مصروف ہوئے اور یہ مصروفیت عمر کے آخری وقت تک جاری رہی، تعلیم و تدریس کا سلسلہ پہلے لکھنؤ سے باہر ضلع بستی میں ایک دینی مدرسہ کی سربراہی کے ساتھ رہا، پھر ندوۃ العلماء میں آگئے اور برسوں یہاں مدرس اور مدرسی کے ساتھ نگراں و مربی طلبہ رہے، اور جب عمر کے تقاضہ سے صحت خاصی کمزور ہونے لگی تو تدریس کے بارِ گراں سے سبکدوشی اختیار کی اور تربیت دینی و عبادت الٰہی کی طرف انقطاع اختیار کیا بالآخر صحت کمزوری کے اس مرحلہ تک پہنچی کہ زندگی کا ساتھ نہ دے سکی اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ مورخہ ۲۴ر شوال ۱۴۱۸ھ کو اپنے خالق و مالک سے جا ملے، پسماندگان میں مولانا ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی اور مولوی حکیم سید حسان نگرامی دو فاضل صاحبزادگان ہیں اور ایک صاحبزادی جو ایک فاضل مولوی سید ضیاء الحسن ندوی کی اہلیہ ہیں۔ نماز جنازہ کے لیے ان کے صاحبزادگان نے ندوۃ العلماء کے میدان کو پسند کیا اور وہاں مولانا مرحوم کے رفیق درس و دوست مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے امامت فرمائی اور ڈالی گنج شمال میں کھدرا کے قبرستان میں تدفین انجام پائی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے علوم دینی میں تو استفادہ ندوہ میں کیا تھا لیکن دینی تربیت شیخ وقت و اویس زمانہ مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد ابادی کے خلیفہ مولانا سید بدر علی شاہؒ صاحب سے حاصل کی اور ان کے خلفاء کی فہرست میں بھی جگہ پائی۔ اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ علم و طریقت دونوں کے جامع ہوئے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک با اخلاق، ہمدرد و جذبہ اصلاح و تربیت کے حامل بزرگ

تھے ان سے علمی فیض کے ساتھ دینی فیض بھی پہنچا، دینی حمیت رکھتے تھے اور دین کی دعوت وحمایت میں سرگرم رہتے تھے، مولانا سے عامۃ المسلمین کو ایک فائدہ پہنچا تھا کہ آسیب وعملیات سے پریشان حال لوگوں کی مدد قرآنی آیات وعملیات سے بھی فرماتے تھے، تعلیم کے سلسلے میں نحو و صرف کے موضوع کو دل نشین طریقہ سے پڑھانے میں ان کو امتیاز حاصل تھا، مضمون خشک ہونے کے باعث عموماً اس کو دل نشین انداز میں پڑھانا مشکل ہوتا ہے لیکن مولانا مرحوم اس کو اچھے انداز میں پڑھاتے تھے ان کی اس تدریس سے طلبا نے خاص طور پر فائدہ اٹھایا اور اچھے فضلاء ثابت ہوئے۔ مولانا نے اپنے ان تجربات کو تحریری شکل بھی دی اور ''مہمات الصرف والنحو'' کے نام سے ایک اچھی کتاب سامنے آئی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مولانا نے تفسیر کے گھنٹے بھی کئے اور علم قرأت کی کتاب سراجی کا بھی درس دیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد کا تعلق مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تھا، انھوں نے ان سے جو فیض اٹھایا تھا اسی کا اثر تھا کہ ان کے بعض اجداد نے نگرام اور اس کے اردگرد اچھا اصلاحی وتربیتی کام کیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس تعلق کی بنیاد پر بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ سے تعلق محسوس کرتے تھے، چنانچہ دونوں کی رفاقت درس صرف درس کی رفاقت نہیں رہی بلکہ وہ زیادہ وسعت وقرب کا تعلق بنی جس کا اندازہ دونوں کے اکٹھا ہوجانے پر ہوتا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ندوۃ العلماء میں تدریسی سلسلہ اختیار کرنے سے قبل سے ہی ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے جس کا سلسلہ تاحیات قائم رہا وہ اس کے جلسوں میں پابندی سے شرکت فرماتے۔ یہ سلسلہ ان کی عمر کے آخری سال تک قائم رہا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے صاحبزادگان کے علاوہ اپنے شاگردوں کی ایک جماعت چھوڑی جو مولانا کی معنوی اولاد ہے اور ان کے لیے دعا کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی ندویؒ

بروز پنجشنبہ ۲۹/ ربیع الآخر ۱۴۲۰ھ (۱۲ اگست ۱۹۹۹ء) برصغیر کے ایک بڑے موقر عالم دین اور استاذ حدیث مولانا محمد عبدالرشید نعمانی جے پوری نے کراچی پاکستان میں رحلت فرمائی اور علمی حلقوں میں وہ خلا چھوڑ گئے جس کا پر ہونا آسان نہیں "اناللہ وانا الیہ راجعون"۔

مولانا نہ صرف یہ کہ ایک بڑے محدث، صاحب نظر اور صاحبِ ذوق عالم تھے بلکہ قحط الرجال کے اس دور میں علمائے سلف کی یادگار اور محدثین متقدمین کا نمونہ تھے۔

تقریباً بیس سال قبل مولانا عرصہ دراز کے بعد ہندوستان تشریف لائے تھے، شعبان کی ۲۹ تاریخ کو دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں تشریف آوری ہوئی، مولانا کی آمد پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خوشی اور مسرت وانبساط کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی تعلق ہے اور یہ تعلق دو مضبوط رشتوں کی وجہ سے تھا۔ ایک اہم استادی کا رشتہ کہ دونوں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی کے عزیز شاگرد تھے دوسرے یہ کہ دونوں کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت وارادت کا تعلق تھا اور دونوں کو ان سے اجازت حاصل ہوئی۔

مولانا کا آبائی وطن جے پور (راجستھان) تھا، ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ کو غالباً اکتوبر کے مہینے میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم متوسطات تک اپنے وطن ہی میں حاصل کی، تکمیل کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا، جہاں مولانا ہی کے وطن جے پور سے متصل شہر ٹونک کے مشہور عالم ومحدث جلیل حضرت مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ منصب اہتمام پر فائز تھے، اور حدیث کی منتہی کتابوں کا درس بھی ان ہی سے متعلق تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب راجستھان راجپوتانہ کے طلبہ خال خال ادھر کا رخ کرتے تھے۔

مولانا مرحوم مسلسل چار سال دارالعلوم میں تکمیل کے لیے مقیم رہے، عربی ادب کے کئی اساتذہ سے بھی استفادہ کیا، مگر مولانا کی توجہ کا اصل محور مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کی ذات گرامی تھی، جو اس وقت دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور حدیث میں مرجع کی حیثیت رکھنے والے یمنی عالم علامہ حسین بن محسن انصاری (خزرجی) کے خاص تلامذہ ومستفیدین میں تھے۔

مولانا نعمانی نے مولانا حیدر حسن خان صاحبؒ سے بھرپور استفادہ کیا اور شب وروز حاضر باش رہے، انھوں نے مولانا کو خلوت وجلوت، مشغولیت وراحت اور رات دن کے مختلف حصوں میں بے تکلف دیکھا، مولانا کی صفات وکمالات اور زاہدانہ زندگی کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھی، جس کو انھوں نے اپنی زندگی میں اس طرح جذب کرلیا کہ گویا وہ مولانا کے مثنیٰ بن گئے، یہیں سے ان کے اندر حدیث کا وہ ذوق پیدا ہوا جس نے ان کو متقدمین محدثین کی صف میں لاکھڑا کردیا، اور یہیں ان کو زہد کا وہ ذائقہ ملا جو اسلاف کی میراث ہے۔

مولانا کے اسی شوق وطلب کو دیکھتے ہوئے (جس میں ہم وطنی کا ایک رشتہ بھی شامل ہوگیا تھا) مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ نے خصوصی شفقت وتوجہ فرمائی اور تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی پورا خیال رکھا جس نے مولانا نعمانی کے ذاتی جوہر کو جلا بخشی، اختصاص فی الحدیث اور تعمق فی العلم کے ساتھ ان کی عملی زندگی میں بھی ایک امتیازی شان پیدا ہوگئی، مولانا حیدر حسن خاں صاحبؒ خود حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے اجازت یافتہ اور صاحب سلسلہ تھے، ان کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا کے اس امتیازی وصف کو بھانپ لیا اور سند فضیلت کے ساتھ ہی اجازت بیعت وارشاد سے بھی سرفراز فرمایا۔

بعد میں انھوں نے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری سے وابستگی اختیار کی اور یہاں سے بھی اجازت وخلافت پائی۔ لیکن ان کے اندر برابر اصلاح واستفادہ کا جذبہ کارفرما رہا، اور حضرت کے خلفاء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے مناسبت محسوس کرکے ان سے رجوع کرلیا اور ان سے اپنے تمام معاملات میں رہنمائی لینی شروع کردی اور ان کی جانب سے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔ مولانا نعمانی نے

دین کی خدمت کے لیے حدیث شریف کو موضوع بنا کر کئی اہم تصنیفات یادگار چھوڑیں، جن میں ''ابن ماجہ اور علم حدیث'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، دوسروں میں حدیث کا ذوق پیدا کرانے کا بھی انھیں بڑا ملکہ حاصل تھا، بہت جلد طلبہ ان سے مانوس ہو جاتے اور تھوڑی صحبت میں بہت کچھ سیکھ لیتے، ۱۴۱۰ھ میں ندوۃ العلماء کے ذمہ داران نے کچھ وقت ندوۃ العلماء کے احاطے میں گزارنے اور علمی فیض سے طلبہ واساتذہ کو مستفید کرنے کی دعوت دی، جسے انھوں نے خوشی سے قبول کیا اور دو ماہ کا عرصہ قیام فرما کر طلبہ واساتذہ کو خوب مستفید کیا، ان کی علمی جلالت شان کا اس سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی کتاب ''مکانة الإمام أبی حنیفة فی الحدیث'' اور ''ماتمس إلیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجه'' کو حدیث کے شہرۂ آفاق عالم دین ومحقق علامہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے ایڈٹ کر کے شائع کرایا، مولانا کی ایک اہم کتاب لغات القرآن بھی جو مولانا نے ندوۃ المصنفین کے ذمہ داروں کی خواہش پر تصنیف کی تھی مگر اس کی دو جلدیں مرتب کر سکے اس کی اخری جلد مولانا عبدالدائم جلالی کے قلم سے مکمل ہوئی تین جلدوں میں یہ کتاب اردو زبان میں اگر دیکھا جائے تو ان موضوع پر منفرد نظر آتی ہے اس میں مولانا کا تحقیقی ذوق سامنے آیا ہے اور اس کی حیثیت ایک مرجع کی ہوگئی ہے اس کے علاوہ مولانا کے متعدد رسائل ردناصبیت پر لکھے گئے ہیں اور بعض حلقوں میں ردشیعیت کے نتیجہ میں جو غلو پیدا ہوا مولانا نے اس کا مقابلہ کیا۔

مولانا کے ایک صاحبزادے مولانا ڈاکٹر عبدالشہید نعمانی ہیں، جو کراچی یونیورسٹی میں ایک عرصے تک پروفیسر رہے، اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور علمی خدمت میں مشغول ہیں، وہ بھی اچھا علمی وتحقیقی مزاج رکھتے ہیں، اور اپنے والد کے نقش قدم پر ہیں، بھائیوں میں مولانا عبدالحلیم چشتی نعمانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ان کے دامن تربیت اور فیض صحبت سے وابستہ رہے، اور وہ ان کی ہی جگہ پر جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں علم حدیث میں فضلاء کی تربیت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

مولانا نعمانی کی وفات کو علم دین کے تمام حلقوں میں بڑا خسارہ سمجھا گیا اور خدمت حدیث وعلوم اسلامیہ کے اہم شخص کے رخصت ہوجانے کا غم امت نے محسوس کیا، مولانا کا حادثہ وفات اہل ندوہ نے خاص طور پر زیادہ محسوس کیا کہ ان کا ندوۃ العلماء سے استفادہ اور افادہ دونوں کا تعلق رہا تھا اور ۱۹۹۰ء میں ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا علی میاںؒ کی دعوت پر ندوہ وہ تشریف لائے تھے اور دو ماہ تک سال کے آغاز میں طلبہ کو صحیح بخاری شریف کا درس دیا، اس کے علاوہ اصول حدیث کا بھی درس دیا، اور حدیث کے موضوعات طلبہ کو تحقیقی ذوق وتصنیفی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے دئے، اساتذہ کے لئے بھی استفادہ کا بہترین موقع تھا جس کی انہوں نے قدر کی اس طرح ان کے قیام سے ندوہ کو فائدہ ہوا مولانا نے زمانہ طالب علمی میں دارالعلوم کے احاطہ میں رہ کر خوب استفادہ کیا تھا اور یہاں کے اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا لیکن وہ باضابطہ یہاں کے فارغ نہ تھے لیکن آخر میں ندوۃ العلماء میں ان کی تشریف آوری اور قیام کی مناسبت سے ان کی تکریم میں حضرت مولانا علی میاںؒ نے ایک جلسہ منعقد کرایا اور اعزازی طور پر انہیں ندویت کی سند عطا کی جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے دور معتمد تعلیمی میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے ساتھ یہ خصوصیت برتی تھی اس کا بھی مولانا علی میاںؒ نے تذکرہ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کے دروازے وسیع فرمائے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس واقعے کو مزید رنج کا محسوس کیا اور صدمہ کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کے مراتب بلند فرمائے۔

شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ المیدانی

شیخ عبدالرحمٰن بن علامہ حسن حبنکہ المیدانی بلاد عربیہ میں علمائے حق کے زمرہ میں ایک بلند قامت شخصیت تھی، جو اپنے گہرے اور وسیع علم کے ذریعہ درس وافادہ کا بہت مفید کام انجام دے رہے تھے، اس وقت پورے عالم عربی میں مغربی استعمار واستشراق نے مسلمان ذہنوں اور طبیعتوں پر جو گہرا اثر ڈالا ہے، اس اثر کو توڑنے اور روکنے میں ایسی شخصیتوں کی ضرورت خاصی بڑھ گئی ہے جو علمی میدان میں اس کا توڑ کرسکیں، یہ خصوصیت شیخ عبدالرحمٰن میں نمایاں حد تک پائی جاتی تھی، وہ شام کے بہت بڑے عالم دین اور مصلح شیخ علامہ حسن حبنکہ المیدانی کے صاحبزادے تھے، شیخ حسن حبنکہ اپنے عہد کے بہت ممتاز عالم دین تھے اور ان کا ملک شام میں بڑا اثر اور ان کی بڑی قدر تھی اور انھوں نے اپنی علمی ودینی وجاہت سے بہت فائدہ پہنچایا، ان کی علمی واصلاحی خصوصیات کے وارث ان کے یہ بڑے بیٹے شیخ عبدالرحمٰن ہوئے جنھوں نے ۲۷ر جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ بدھ کے روز انتقال کیا۔

انھوں نے اولاً اپنے والد کے ہی قائم کردہ مدرسہ میں اپنے والد کی خصوصی سرپرستی ونگرانی میں تعلیم حاصل کی، پھر جامع ازہر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے، اور وہاں تکمیل کی، جامع ازہر کے اس عہد کے مقتدر اساتذہ وعلماء سے خصوصی فائدہ اٹھایا، پھر شام کے مدارس میں تدریسی وتعلیمی خدمات انجام دیں اور پھر سعودی عرب کی جامعات میں استاد رہے، اور اس طریقہ سے نئی نسل کے کثیر افراد کی علمی وذہنی تربیت میں ان کا حصہ رہا، ان کا علمی واستدلالی نہج ان کی تصنیفات میں ظاہر ہوا، اور اس میں انھوں نے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، وقت کے اہم موضوعات پر انھوں نے اپنی علمی کاوش سے اچھا مواد اکٹھا کردیا، اور وقیع کتابیں تصنیف کیں، اس سلسلے میں ۱- "غزو فی الصمیم" ۲- "مکاید

یھو دیة عبر التاریخ" ۳-" أجنحة المکر الثلاثة (التبشیر- الاستشراق- الاستعمار)" ۴-"العقیدة الإسلامیة و أسسھا" ان کی اہم کتابیں ہیں۔

خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا ربط اولاً ان کے والد شیخ حسن حبنکہ رحمۃ اللہ علیہ سے قائم ہوا تھا، دمشق کے سفر میں وہ ہوٹل میں ملنے کے لیے بھی تشریف لائے تھے اور مولانا بھی ان کے جائے قیام پر تشریف لے گئے تھے اور ان کی تعلیمی وتربیتی کوششوں اور ان کے مدرسہ کو جو مقام حاصل ہوا تھا اس سے واقف ہوئے تھے، اور اس کے بعد سے ان سے ربط عملی شکل اختیار کر گیا تھا، مولانا نے ندوہ کے ایک استاد کو بھی ان کے یہاں بھیجا تھا، یہ بھٹکل کے قاضی محمد فاروق ندوی صاحب ہیں جو وہاں کئی سال رہ کر مستفید ہوئے، پھر شیخ حسن حبنکہ ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ اجلاس میں تشریف بھی لائے تھے اور اس کے ذریعہ سے شام کی اچھی نمائندگی ہوئی، پھر ان کے رشتے سے ان کے صاحبزادے شیخ عبدالرحمٰن سے بھی تعلق قوی ہوا، اور شیخ عبدالرحمٰن نے اس کو برابر نبھایا، اور حضرت مولاناؒ جب بھی حجاز جاتے، تو شیخ عبدالرحمٰن مولانا سے ملنے مولانا کی قیام گاہ پر آتے، اور اپنی تصنیفات جو گہری علمی کاوشوں پر مبنی ہوتیں، وہ پیش کرتے، اور ندوۃ العلماء کے متعلق اپنی قدردانی کا بھی اظہار کرتے، اس کے عربی رسالوں کی بھی قدر کرتے، اور کبھی کبھی عطیہ کے طور پر انھوں نے تعاون بھی کیا، ان کا یہ تعلق مولانا سے متجاوز ہو کر مولانا کے شاگردوں تک بڑھ گیا تھا، مجھ کو بھی ان کی محبت اور اظہار تعلق سے سابقہ پڑا، مکہ مکرمہ میں مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی کے یہاں ان کا آنا جانا بھی ہوا کرتا تھا، اور ان کے ذریعہ بھی ان کی تصنیفات آئیں، ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا جو بڑا بین الاقوامی سمینار ہوا جو ادب اسلامی کی پہلی کانفرنس تھی جس میں بلاد عربیہ کے نمائندے بھی کافی تعداد میں آئے تھے، اس میں شیخ عبدالرحمٰن حبنکہ بھی شریک ہوئے تھے اور ادب اسلامی پر ایک ضخیم مقالہ انھوں نے پیش کیا جو اپنے موضوع پر بڑا قیمتی مقالہ تھا جو بعد میں کتابی صورت میں طبع بھی ہوا، انھوں نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ندوہ سے اپنا ایسا تعلق قائم کر لیا تھا کہ جیسے اس

علمی خانوادے کے وہ بھی ایک فرد ہوں، اس سے ان کی وفات کا حادثہ ندوہ کے ایک قریبی تعلق والے کے حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیخ عبدالرحمٰن میدان کے رہنے والے تھے جو دمشق (شام) کا ایک مردم خیز محلّہ اور علماء کی بستی ہے اس کو وہی حیثیت حاصل ہے جو لکھنؤ میں فرنگی محل کو اور بغداد میں اعظمیہ کو حاصل رہی جس کی طرف نسبت ایک اعلیٰ نسبت سمجھی جاتی ہے، شیخ عبدالرحمٰن نے اپنے کو قدیم علماء کے طرز پر رکھا تھا، ان کو دیکھ کر قدیم علماء کی وضع داری اور علمی شغف اور عالمانہ کردار اور عقیدہ وفکر میں قدیم علماء کی اتباع ان میں نمایاں نظر آتی تھی، ان سے مل کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علمائے سلف کو نمونہ سمجھنے والے اور ان کی راہ پر چلنے والے ایک بڑے صاحب علم وثقافت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے ایک طریقہ سے اپنے والد کی عظیم عالمانہ شخصیت کی جگہ پر کی تھی، رابطہ عالم اسلامی کے مکہ مکرمہ کے وہ رکن رکین بھی تھے، اس طرح ان کی وفات علوم دینیہ کے باوقار حاملین کی صف کے ایک لائق شخص سے محروم ہونے کا نقصان ہے، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو اور ان کے مفید علمی کارناموں کو قبول فرمائے، اور اضعافاً مضاعفۃ اجر عطا فرمائے۔

چند بلند پایہ داعی ومبلغ دین

(۱) مولانا عبیداللہ بلیاوی
(۲) حافظ عبدالرشید رائے پوری
(۳) مولانا محمد عمر پالنپوری

مولانا عبیداللہ بلیاویؒ

حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاویؒ اپنے عہد کے دعوت وتربیت کا ذہن رکھنے والے مربی، داعی الی اللہ اور ممتاز عالم دین تھے، ۲۰/محرم الحرام ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۰/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو سکندر پور ضلع بلیا میں پیدا ہوئے، ابتدائی وثانوی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی انھیں معروف عالم دین مولانا عبدالسلام فاروقی پسر امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی سرپرستی ورہنمائی بھی ملی، پھر وہ مظاہر علوم سہارن پور آ گئے، یہاں ان کے رفقائے تعلیم میں مولانا سعید احمد خان صاحب مرحوم اور مولانا قاری امیر حسن صاحب (أطال اللہ بقاءہ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

مظاہر علوم سے فراغت کے بعد وہ گورکھپور آ گئے اور وہاں انجمن اسلامیہ میں ایک سال تک تدریسی خدمت انجام دی، وہاں سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی خدمت میں دہلی آئے اور داعیانہ فکر وجدوجہد کے لیے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی دعوت وتبلیغ سے وابستہ ہوئے اور ان ہی سے بیعت واسترشاد کا تعلق بھی قائم کیا، اور ان کی وفات کے بعد اصلاح واسترشاد کا یہ تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ سے قائم کیا، اور ان کے مجاز خلیفہ ہوئے۔

حجاز (سعودی عرب) میں جب تبلیغی کام کے تعارف کا موقع آیا تو ان پر اور ان کے ساتھ ان کے رفیق تعلیم مولانا سعید احمد خان صاحب سہارن پوری پر ذمہ داری ڈالی گئی اور انھوں نے مکہ مکرمہ میں قیام اختیار کرلیا، مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران حرم مکی اور مدرسہ صولتیہ میں درس کا بھی سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ بخاری شریف، تفسیر ابن کثیر، مشکوٰۃ المصابیح، ریاض الصالحین کا درس دیا۔ حجاز مقدس میں دعوت کے کام کو استحکام اور فروغ دینے کے لیے

وہ فکرمند اور کوشاں رہتے تھے، وہ اس سلسلے میں اپنے ملک ہندوستان میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سے برابر رابطہ بھی رکھتے اور وہ یہاں کے حالات اور اپنی سرگرمیوں سے واقف کراتے رہتے، اس کے ساتھ یہ تقاضا بھی رکھتے کہ کچھ اور افراد حجاز مقدس بھیجے جائیں، جو اپنی صلاحیتوں سے یہاں کے باصلاحیت اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو متاثر کرسکیں، ان کے پہ در پہ خطوط کے بعد خال محترم و معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا وہاں جانا طے ہوا، چنانچہ وہ ۱۹۴۷ء میں حج کے موقع پر اپنے گھر کے بعض افراد کے ساتھ تشریف لے گئے، تاکہ یکسوئی کے ساتھ وہ کام کرسکیں۔ یہ حضرات وہاں پہلے سے موجود ہی تھے، ان دونوں حضرات کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے وہاں پہنچنے سے بڑی مسرت حاصل ہوئی اور تقویت ملی، اس لیے کہ بلاد عربیہ میں ہندوستانی علماء کا پہلے سے کوئی تعارف نہیں تھا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر گفتگو اور تقریر کے لحاظ سے عربی کا استعمال ہندوستان کے علماء کے یہاں نہیں تھا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے وہاں پہنچنے پر کہ وہ پہلے ہی سے حضرت مولانا الیاس صاحب کی تحریک دعوت وتبلیغ سے جڑے ہوئے تھے اور ان کا تعلق واعتماد حاصل کیے ہوئے تھے، یہ دونوں حضرات بہت خوش ہوئے اور پھر ان دونوں حضرات نے ان کے تعاون سے وہاں کے علماء اور اعیان سے ربط حاصل کیا، اور مولانا کے رسائل اور کتابوں کے وہاں پہنچنے سے مولانا کا وہاں جو تعارف تھا اس سے کام کو مدد ملی۔ مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کو حضرت مولانا سے قریبی ربط تھا، مولانا سے دعوتی کام کے سلسلے میں فکری ہم آہنگی بھی پائی جاتی تھی، چنانچہ مولانا کے دوسرے سفر حج ۱۳۷۰ھ۔ مطابق (۱۹۵۰،۵۱ء) میں جب حج کے بعد مولانا نے مصر وسوڈان اور شام کا سفر کیا تو مولانا عبیداللہ صاحب کی رفاقت رہی، اور اس ربط اور رفاقت سے دونوں ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہوئے اور مناسبت قائم ہوئی۔ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بلاد عربیہ کے سفروں سے واپس لے آئے، لیکن مولانا عبیداللہ صاحب حضراتِ مرکز نظام الدین دہلی کے مشورے سے مولانا سعید احمد خان صاحب کے

ساتھ وہیں رہے، اور اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔

مولانا عبیداللہ صاحب کی خصوصیات میں جو حجاز میں نمایاں دیکھی گئیں ان کا حلم اور تواضع تھی کہ وہاں کے دعوتی کام میں جو خاص طور پر حجاج میں انجام دیا جاتا تھا، بعض مواقع۔ بڑے صبر آزما آجاتے تھے، اس لیے کہ حاجیوں کے مزاج مختلف ہوتے تھے، ان کے مزاجوں کی رعایت میں صبر سے کام لینا پڑتا تھا، اور حجاز کے علماء اور غیر علماء سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ان کے حجازی ہونے کا احترام ملحوظ رکھنا ہوتا تھا، اور تبلیغی کام کا تقاضا بھی یہ تھا کہ نرم دلی، محبت اور ہمدردی کے رویے کے ساتھ دینی ہدایات پر پابندی کریں، اور عقیدۂ توحید کی درستگی کی تلقین بہت محبت آمیز طریقے سے کرنے کی ہدایت تھی، جس کی یہ حضرات پابندی کرتے تھے، یہ نرم دلی اور تواضع مولانا میں برابر قائم رہی، انھوں نے دینی تعلیم محنت اور فکر سے حاصل کی تھی، اس کی وجہ سے ان کے علم میں ترقی بھی ہوتی رہی، اور وہ بحیثیت دعوتی اور علمی خصوصیت کے شہرت حاصل کرتے رہے، اور جب حجاز سے واپسی کا فیصلہ ہوا تو نظام الدین کے مدرسہ کاشف العلوم میں وہ استاد کے منصب پر بھی فائز ہوئے اور حدیث کی اہم کتابوں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور حدیث کی دوسری کتابوں اور تفسیر جلالین کا درس دیتے رہے، ان استفادہ کرنے والوں میں مشہور بزرگ اور عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ اور مولانا سید محمد طاہر منصور پوریؒ وغیرہ تھے۔

مرکز تبلیغ میں قیام کے باعث تبلیغی معاملات میں مشیر تھے اور ان کے دائرے میں کام کی جتنی سرپرستی رکھی گئی وہ اس میں سرپرستی بھی کرتے رہے، انھیں جو علمی رسوخ حاصل تھا اس سے مرکز تبلیغ میں مقیم دوسرے داعی اور معلم بھی استفادہ کرتے اور بہت سی علمی گتھیاں ان سے حل کرتے۔ ان خصوصیات کے ساتھ ذکر و دعا اور ابتہال کے جن اوصاف سے وہ متصف تھے، ان سے ان کا وجود برکتوں کا بھی باعث تھا، یہی سب وجوہات تھیں کہ ان کے انتقال سے پیدا ہونے والا خلا دینی علمی دعوتی حلقوں میں بہت

محسوس کیا گیا، خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اسے اپنا ذاتی حادثہ محسوس کیا۔

مولانا کی زندگی متعدد جہتوں سے محاسن وکمالات کی جامع تھی، انھیں شعر کہنے پر بھی اچھی قدرت تھی، ان کا مجموعہ کلام بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

صلاح وارشاد کے لحاظ سے ان کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے جو ان کے استاد بھی تھے، اجازت وخلافت بھی حاصل ہوئی، اور اس وقت حاصل ہوئی جب حضرت شیخ نے ایک دو لوگوں کو ہی اپنا مجاز بنایا تھا، اس طرح وہ داعی، معلم، اور مرشد تینوں دائروں میں ایک مؤثر شخصیت کے مالک ہوئے، اور ان دائروں میں ان کا فیض ان کے تعلق والوں کو حاصل ہونے لگا، اور ان کو اہمیت وعظمت کا مقام حاصل ہوا، اپنے عہد میں ان کا بڑا قابل قدر کام ہے جسے وہ انجام دے کر گئے، ان کا شمار تحریک دعوت وتبلیغ کے رہنماؤں میں تھا، اور مرکز میں رہنے کی وجہ سے اور جو انھوں نے دعوت وتبلیغ کے راستے میں سفر کیے اور قربانیاں دیں اس کی وجہ سے وسیع طریقے سے لوگوں کا ان سے ربط ہوا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے تعلق کی وجہ سے ہم ندوۃ العلماء والوں سے بھی ان کا تعلق تھا اور انھوں نے اپنے صاحبزادوں میں مولوی عبدالرشید اور مولوی عبدالرحیم کو ندوہ میں تعلیم کے لیے بھیجا، جنھوں نے یہاں رہ کر تعلیم حاصل کی، ان کے علاوہ ان کے خاندان کے بعض افراد نے بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی جن میں مولوی عزیز عالم ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو سرگرم داعی ومبلغ بھی بنے لیکن عنفوان شباب میں انتقال کر گئے، مولانا ندوۃ العلماء تشریف لاتے تھے، اور ان کا یہاں اساتذہ ومدرسین اور دیگر کارکنوں کے سامنے ایک خطاب ہوتا تھا، طلبہ کو بھی خطاب فرماتے، اور ندوۃ العلماء کے بعض فضلاء اور اساتذہ نے ان کے ساتھ حجاز مقدس میں وقت لگایا تھا، اور ان کی صحبتوں اور فیوض سے مستفید ہوتے تھے، مجھ کو بھی حجاز میں کچھ وقت رہ کر ان کو دیکھنے اور

ان کی صحبت وشفقت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا تھا، وہ شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے، ہمیں اس کے بعد بھی ان کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی خوبیوں کا مالک بنایا تھا، وہ خوبیاں جو آج عنقا ہوتی جارہی ہیں۔ وہ اپنے عہد میں مسلمانوں کی ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے حجاز کے قیام کے دوران ابتدائی مرحلے میں مجھے خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ ایک سفر حج میں جب جانا ہوا تھا، تو ان کے ایک واقعے سے مجھ میں ان کی قدر وعظمت کے احساس میں اضافہ ہوا، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ سعودی عرب کی ترقیات کا زمانہ نہیں آیا تھا، حج کے انتظامات جو آج بہت بہتر نظر آرہے ہیں اتنے اچھے نہیں تھے، جدہ میں ہم حجاج مکہ مکرمہ جانے کے لیے بسوں کے انتظام کے منتظر تھے، ہمارے قافلے کے علاوہ ایک دوسرے قافلے کے لیے جو بس آنے والی تھی، اس کے آنے میں دیر لگی، ایک حاجی صاحب اس بات پر مشتعل ہوئے اور مولانا عبیداللہ صاحب جو کارِ خیر کے طور پر حجاج کی سہولت کے لیے منتظمین کو توجہ دلا رہے تھے، ان کو ان حاجی صاحب نے منتظمین کا ہی ایک فرد سمجھا اور وہ حاجی صاحب مولانا پر بہت گرم ہوگئے اور بڑے نامناسب الفاظ کہے اور شاید مارا بھی، لیکن مولانا نے اس کو برداشت کیا، جیسے کوئی بات پیش ہی نہیں آئی، مجھے وہ واقعہ بہت ہی غیر معمولی نیکی اور تقوے کا محسوس ہوا، اور مولانا کی عظمت میرے دل میں بہت بڑھ گئی، یہ ان کی خوبیوں کی مثالوں میں ایک مثال ہے کہ انھوں نے انتقام تو بڑی چیز ہے ناگواری کا بھی اظہار نہیں کیا۔

مولانا بڑے ذاکر، شاغل، عبادت گزار عالم اور داعی ومربی تھے، بڑا مطالعہ کرنے والے اور معاملہ فہم تھے، اور ایک مخلص داعی اور رہنمائے دین ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ان کا وجود ایک قیمتی سرمایہ تھا، اور ان کی شخصیت ہندوستان کی رہنما شخصیتوں میں اپنی ایک حیثیت رکھتی تھی، علماء اور زعماء بھی ان سے آکر استفادہ کرتے،

ان کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا، ان کی حیثیت ایک ضرورت کی تھی، اس لیے ان کا انتقال ملت اسلامیہ کے لیے بڑا خسارہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو پیش از پیش مغفرت ورحمت سے نوازے اور بے حدوحساب فضل سے نوازے، مولانا کی یادگار میں چار صاحبزادے مولوی عبدالرشید، مولوی عبدالرحیم، مولوی عبدالعلیم اور مولوی عبدالعظیم سلمہم اللہ ہیں، چاروں دعوت وتعلیم کے کام سے وابستہ ہیں، آخرالذکر مظاہر علوم سہارنپور میں استاد بھی ہیں۔ صاحبزادیوں میں بڑی صاحبزادی مولانا اجتباء الحسن کاندھلوی پسر حضرت مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کو منسوب ہیں۔

حافظ عبدالرشید رائے پوریؒ

قصبہ رائے پور ضلع سہارنپور میں دینی وروحانی تربیت کا ایک بڑا مرکز عرصہ سے رہا ہے، یہ قصبے کی آبادی سے باہر گلشن رحیمی نامی جگہ پر حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری پھر ان کے خلیفہ اعظم وجانشین حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے آباد روحانی دینی تربیت کا نور دور دور تک کے طالبین کو بانٹتا رہا، روحانیت کے ہزاروں متلاشی وہاں پہنچتے اور فیض حاصل کرتے، اس روحانی مرکز کے شاندار دور کا آخری حصہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہ کے دم قدم سے جاری رہا، ان سے فیض اٹھانے والے اور ان کے خلفاء میں حافظ عبدالرشید صاحب بھی تھے جنھوں نے اپنے شیخ سے استفادہ کیا اور اپنے شیخ کی رحلت کے بعد فیض روحانی کے جاری رکھنے کا ذریعہ بنے اور بہت سوں کو فائدہ پہنچایا۔

موصوف ایک بہت نیک خصال، بزرگ طبیعت، دینی فیض رساں شخص تھے، ان کی ذات بابرکت سے لوگوں کو دینی جذبہ ملتا تھا، اور ان کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھاتے تھے تواضع صفت، خاموش طبیعت اور ذکر وشغل روحانی میں مشغول رہتے تھے ان سے واقفیت رکھنے والوں کو ان سے بہت تعلق تھا اور وہ بھی سب سے محبت وشفقت کا برتاؤ کرتے تھے، رائے پور کی یہ خصوصیت رہی کہ یکے بعد دیگرے وہاں دینی فضا قائم رکھنے والے حضرات کا تسلسل رہا حضرت حافظ عبدالرشید صاحب اس سلسلے کی ایک برگزیدہ کڑی تھے، لیکن اس جہان فانی سے ہر شخص کو ایک نہ ایک دن رخصت ہونا یقینی امر ہوتا ہے، چنانچہ حافظ عبدالرشید صاحب نے بھی ۷ رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ کو اپنی جان جانِ آفریں

کو پیش کردی اور اپنے متوسلین ومحبین کے لیے صدمہ چھوڑ گئے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی وفات سے رائے پور میں جو خلا پیدا ہوا اور دعوت وارشاد وتصوف کے میدان میں جو کمی واقع ہوئی ہے اس کو پر کرنے کا انتظام فرمائے۔

چونکہ راقم کا بیعت کا تعلق مخدومنا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے رہا ہے اور ان کی خدمت میں خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اور ویسے بھی حاضر ہونے کا بار بار موقع ملا اس لیے حضرت حافظ عبدالرشید صاحب کی بھی ملاقات وزیارت ہوتی رہتی تھی، وہ حضرت کی خدمت میں بھی رہتے، ان کی گوناگوں صفات اور اصلاح ودعوت اور رشد وہدایت کے کام وجاں فشانی کا علم کچھ اس وقت ہی ہوگیا تھا اور بعد میں کچھ تفصیلات اور بھی معلوم ہوئیں جس سے ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، خاص طور سے ملک کی تقسیم کے بعد جب ہریانہ، پنجاب وہماچل پردیش اور مغربی یوپی کے بعض اس اضلاع میں ارتداد کے واقعات پیش آنے لگے تو انھوں نے دیہاتوں وقصبات کے بڑے دورے کیے، پہاڑوں کے سفر کیے، ایسی ایسی جگہوں پر گئے جہاں رخ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایمان کی تجدید اور غیر مسلموں میں اسلام کا تعارف ودعوت کا انھوں نے جو کام کیا وہ گرانقدر بھی ہے اور حیرت انگیز بھی، یہاں پر ہم صرف ایک شہادت انہی کے برادر استرشاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

حضرت حافظ عبدالرشید صاحب رائے پوری باکمال شخصیتوں میں ہیں، وہ داعی الی اللہ، رشد ہدایت اور ضلالت وارتداد عن الاسلام کی سرزمین میں ایک شمع فروزاں اور ایک بلند وبالا مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے جن کے اخلاص ودرد اور سرگرمی وتندہی بلکہ مجاہدہ وقربانی کی برکت سے ہزاروں انسان جو دین وحق کی دولت سے ونعمت سے محروم ہوگئے تھے اور انھوں نے ارتداد اختیار کرلیا تھا اور ان کی صورت وسیرت سب بدل چکی تھی، دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، کثیر التعداد مسجدیں جو منہدم ہوگئی تھیں دوبارہ ان کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ آباد ہوئیں، مسلمانوں کی اس نسل کی جس نے ارتداد کا راستہ اختیار کرلیا تھا

اسلام کی طرف بازگشت ہوئی تھی، نئی نسل ارتداد کے خطرے سے محفوظ ہوئی، اس کی دینی تعلیم وتربیت کا انتظام ہوا بڑی تعداد میں مدارس قائم ہوئے۔''

افسوس کہ اس عظیم المرتبت شخصیت کے وجود بابرکت سے ہم یکا یک محروم ہوگئے۔خوشی کی بات ہے کہ ان کے پوتوں میں ڈاکٹر شفیق احمد صاحب اور منشی عتیق احمد صاحب ان کے کام ومشن کو آگے بڑھانے کا عزم وحوصلہ رکھتے ہیں اور انھیں اپنے دادا کا اعتماد بھی حاصل رہا ہے، اور ان کی طرف سے اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے ہیں، اور اس وقت رائے پور میں اس مبارک خانوادے کے سرپرست مولانا مفتی عبدالقیوم رائے پوری مدظلہ ہیں، جن کے وجود سے اس وقت خانقاہ آباد ہے، أطال اللہ بقاءہ۔انہیں بھی حضرت حافظ صاحب سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔

مولانا محمد عمر پالنپوریؒ

۱۴ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ۔ مطابق ۲۲ر مئی ۱۹۹۷ء کو یہ رنجدہ اطلاع ملی کہ داعی الی اللہ لسان التبلیغ مولانا محمد عمر پالنپوری بھی سفر آخرت فرما گئے اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں ایک بہت بڑا خلا چھوڑ گئے ''اناللہ وانا الیہ راجعون''۔

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالنپوری ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ممبئی میں پیدا ہوئے گجرات کے معروف علاقے پالنپور میں واقع گھٹامن کے رہنے والے تھے، والد کا نام وزیر الدین تھا، مولانا کی عمر سات سال تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور والدہ نے تربیت کی پوری ذمہ داری سنبھال لی انہیں عبادت کا بڑا ذوق حاصل تھا، نماز اور دعا میں زیادہ وقت گزارتی انہوں نے اسکول کی تعلیم چھوڑ وا کر حفظ قرآن میں مولانا کو لگا دیا دینی تعلیم میں ترقی کر کے ۱۹۴۴ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا لیکن طبیعت ناساز ہونے کے باعث تعلیم موقوف کرنی پڑی البتہ تبلیغی کام سے جڑے رہے اور حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کے مشورے سے دوبارہ دار العلوم دیوبند جا کر دور حدیث میں داخلہ لیا اور تعلیم مکمل کی اس وقت دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، مولانا کو ان کی شفقتیں حاصل ہوئیں بیعت وارادت کا تعلق حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے تھا ان کے انتقال کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی سے رجوع کیا اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

داعی الی اللہ مولانا محمد عمر پالنپوری اس عہد کی ان مؤثر اور مقتدر شخصیتوں میں سے

تھے جن سے اللہ نے لوگوں کے دلوں کو حرارت ایمانی سے گرمانے ایمان بالغیب اللہ کے وعدوں اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت، اور خاتم النبین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت پر یقین اور اللہ کی ذات پر اعتماد و توکل پیدا کرانے اور رجوع الی اللہ اور اس کے نتیجہ میں اس کا داعی اور مبلغ و ناشر بننے کا جذبہ پیدا کرنے اور اللہ کی خاطر اپنی محبوب اور دل پسند چیزوں اور جگہوں کو چھوڑنے اور اپنی جان و مال کی قربانی دیکر لوگوں کو دین کی طرف لانے کا کام لیا وہ اپنے کام کے آغاز کے وقت سے ہی دعوت و تبلیغ کی عالم گیر تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے جس کی ابتداء اپنے وقت کے عظیم المرتبت مربی اور مصلح حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے کی تھی اور پھر ان کے بعد اس کو ان کے جانشین حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے ہمہ تن و ہمہ وقت فکر و توجہ سے بڑھایا اور ترقی دیکر بہت وسیع کر دیا کہ دیکھتے دیکھتے اس کے اجتماعات میوات کے محدود پیمانہ سے نکل کر اتنے عظیم اور وسیع بن گئے کہ جس کے تحت ملکوں میں وفود بھیجنے اور دنیا کے مختلف خطوں سے جماعتوں کی آمد و رفت کا وہ سلسلہ شروع ہوا کہ ایک طرف تبلیغی مرکز دہلی میں آپ کا رہنا ناگزیر ہوتا اور دوسری طرف مختلف ملکوں سے تقاضے وہاں آکر رہنمائی کے ہوتے یہ چیز برابر بڑھتی گئی۔

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی کا ایک دعوتی بیرونی سفر میں سانحہ ارتحال پیش آجانے پر ان کے ہی رفیق و عزیز اور شریک کار حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی کا دور امارت شروع ہوا اور ان کے دور امارت میں یہ کام بین الاقوامی سطح تک سیل رواں کی طرح پھیلتا چلا گیا اور ان کے عہد میں حضرت مولانا محمد عمر پالنپوری کی شرکت نے کلیدی حیثیت اختیار کر لی وہ اس کے سبھی مشوروں اور پروگراموں میں زبان کے ساتھ دماغ کا بھی کردار ادا کرتے اور پھر ان کا شمار اکابر تبلیغ میں ہونے لگا۔

مولانا محمد عمر پالنپوری کا خاندانی تعلق شمالی گجرات کے علاقے پالنپور کی مقامی برادری مؤمن قوم سے تھا جو دو تین صدی قبل ایک مصلح بزرگ کے ہاتھ پر مشرف با اسلام

ہوئی تھی یہ پوری قوم تبلیغی تحریک سے اس طرح جڑ گئی کہ وہ اس حصہ سمجھی جانے لگی اللہ نے کاروبار میں بھی برکت دی اور پوری قوم اس میں بھی امتیازی حیثیت کے ساتھ سامنے آئی اور اس کا جو دینی مزاج بن گیا تھا دین کی راہ میں اس کام لینے میں بڑی تقویت حاصل کی مولانا محمد عمر پالنپوری نے امت کی اصلاح کی فکر کے ساتھ اپنی قوم کی دینی تربیت واصلاح کی بھی بڑی فکر کی اور اپنی پوری زندگی دعوت وتبلیغ کے کام کے لئے اس کے مرکز میں طرح اقامت ڈال کر وقف کردی وہ اپنے وطن بھی اسی صورت میں جاتے جب ان کو مشورے سے اجازت ملتی مولانا پر دعوت وتبلیغ کے کام میں مرکز نظام الدین سے طے شدہ پروگرام کے مطابق اس کی تنفیذ واشاعت میں غلبہ اور فکر طاری تھا۔

اس کے ساتھ ان کی یہ فکر مغلوب نہیں ہوئی تھی کہ مدارس ومکاتب کا قیام اور فروغ بھی دین کے بقاوتحفظ کے لئے ضروری ہے انہیں اس کی بھی فکر رہتی کہ زندگی کے ہر شعبے میں دین زندہ ہو ایک مدت تک وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے معاملات کو صحیح اسلامی نہج پر لانے کے لئے عوام اور عمائدین کو برابر توجہ دلاتے رہے اور دعوت وتبلیغ میں لگنے والوں کو اس کی طرف متوجہ کرتے اور اس کو کافی نہیں سمجھتے کہ صرف دعوت وتبلیغ کی راہ میں نکلنے نکالنے پر اکتفا کیا جائے ،حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے جب تبلیغ کے کام کو وفود اور جماعتوں کے ذریعہ منظم کیا اور اس کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا تو ان وفود وجماعتوں کی تربیت ورہنمائی کے لئے مرکز سے ہدایت کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ روز ان وفود اور جماعتوں کے سامنے ایک مکمل ومدلل خطاب ہو جس میں دعوتی وتربیتی وقت گزارنے کے سارے تقاضے سامنے آجائیں حضرت مولانا محمد الیاسؒ یہ کام مختلف علماء سے لیتے تھے ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے خود ہی اس ذمہ داری کو انجام دینا شروع کیا اور روز کئی کئی گھنٹے ان کے ایسے بیانات ہوتے جن سے دلوں میں حرارت ایمانی پیدا ہوتی اور ایمان بالغیب اور یقین واعتماد الی اللہ کی وہ کیفیت پیدا ہوتی جو سلف صالح کے

مواعظ کی یاد تازہ کر دیتی ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں ان سے انقلاب آیا اور کتنے غلط راستے پر پڑے لوگ راہ ہدایت پر آ گئے اور اللہ والے بن گئے اور کتنوں نے اپنی زندگیاں دین اور اس کی دعوت وخدمت کے لئے وقف کر دیں۔

مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی وفات کے بعد اس میدان میں بڑا خلا محسوس کیا جانے لگا تھا اس خلا کو دور کرنے کی سعادت اللہ نے مولانا محمد عمر پالنپوری کے حصے میں مقدر کر دی تھی مولانا محمد انعام الحسن کاندھلوی کے دور امارت میں انہوں نے یہ ذمہ داری انجام دی اور چالیس سال سے زائد عرصہ تک وہ اس کے لئے وہ وقت فارغ کرتے رہے آخر میں انہیں ضعف بہت بڑھ گیا تھا اور مختلف اعذار نے گھیر لیا تھا پھر بھی وہ اس کام کو انجام دیتے رہے اور ان کے خطابات وبیانات سے بھی لوگوں کو کماً وکیفاً جو فائدہ پہونچا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، روزانہ سیکڑوں لوگ مستفید ہوتے اور پھر اس دولت کو دوسروں جا کر بانٹنے کا کام کرتے، ملک وبیرون ملک کے عظیم عظیم اجتماعات میں جن کے شرکاء کی تعداد لاکھوں کی ہوتی تھیں اس میں ان کے خطابات وبیانات سے مستفید ہونے والوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو یہ تعداد کروڑوں تک پہنچ جائے گی انہیں آخر میں اس دعوتی تبلیغی تحریک کا ترجمان اور زبان سمجھا جانے لگا تھا۔

مجھے مولانا کو قریب سے دیکھنے اور ان کے بیانات سننے کی سعادت حاصل ہوئی جس اندازہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خصوصی توفیق عطا ہوئی تھی اور پر اثر مضامین ان سے ادا ہوتے تھے ان کے بیانات میں مسلمانوں کی پستی اور دین کے معاملے میں بے توجہی کو دیکھ کر بڑی بے چینی اور فکر وتڑپ کا مشاہدہ ہوتا تھا، وہ دین کے تعلق سے سب اہل دین سے ربط رکھتے تھے مجھ سے بھی محبت وشفقت سے پیش آتے تھے وہ ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے احاطے میں سال دو سال کے وقفہ پر تبلیغی اجتماع میں پابندی سے شرکت فرماتے اور کلیدی خطاب بھی فرماتے جو اس پورے تین روزہ اجتماع کی روح ہوتا

تھا اس لئے ان کی وفات کا صدمہ ہم لوگوں کو ذاتی طور پر اور زیادہ ہوا۔

مولانا کے صاحبزادگان واخلاف میں مولانا محمد یونس صاحب پالنپوری وعظ وخطابت میں ان کے نقش وقدم پر ہیں اور تبلیغ ودعوت کے کام سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ تصنیفی ذوق کے بھی حامل ہیں بیعت وارادت کا تعلق حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے قائم کیا اور ان کے مجاز بھی ہوئے بارک اللہ فی حیاتہ واعمالہ، اللہ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے درجات کو خوب خوب بلند فرمائے اور ان کے نفع کا سلسلہ دراز تر فرمائے۔ آمین

(۵) سربراہان مملکت

(۱) شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعودؒ

(۲) صدر جنرل ضیاء الحق شہیدؒ

(۳) شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعودؒ

(۴) سردار فاروق احمد خان لغاریؒ

شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعودؒ

مملکت عربیہ سعودیہ کے بادشاہ شاہ خالد بن عبدالعزیز کا ۱۳ر جون ۱۹۸۲ء۔ مطابق ۲۱ر شعبان ۱۴۰۲ھ میں ریاض سعودی عرب میں انتقال ہوگیا، ''اناللہ وانا الیہ راجعون''۔

یہ عالم اسلام کا ایک اہم سانحہ ہے جو پیش آیا۔ مرکز اسلام کے سلطان ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اس واقعہ کی اپنی ایک اہمیت ہے، کیونکہ ایسے واقعات میں دیکھنا ہوتا ہے کہ مرکز اسلام کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، اور اس کا بدل کیا ہوسکتا ہے۔

شاہ خالد بن عبدالعزیز اس مملکت کے قائم ہونے کے بعد سے اس کے چوتھے بادشاہ تھے، پہلے اس کے بانی شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود ہوئے تھے جو ابن سعود اور ابوالترکی کہلاتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے شاہ سعود بن عبدالعزیز ہوئے۔ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ یونان علاج کے سلسلہ میں گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا پھر وہ یونان سے اپنے وطن لائے گئے اور ریاض میں مقبرہ السعود میں تدفین عمل میں آئی، ان کے بعد ان کے بھائی شاہ فیصل بن عبدالعزیز مملکت سعودی عرب کے بادشاہ ہوئے، جو ان کی غیر موجودگی میں نیابت کا کام انجام دیتے تھے، شاہ فیصل نے اتحاد اسلامی اور ملت اسلامی کے متعدد مسائل میں بڑی حکیمانہ قیادت کا ثبوت دیا تھا اور ان کی وجہ سے سعودی عرب کا وقار دنیا میں بہت بڑھ گیا، شاہ خالد مرحوم نے اپنے بھائی شاہ فیصل مرحوم کے ساتھ لندن کانفرنس ۱۹۳۹ء میں شرکت کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے والد شاہ عبدالعزیز فرماں روائے مملکت تھے شاہ فیصل مرحوم کہ عہد حکمرانی میں عالم اسلام کو بڑی تقویت حاصل تھی لیکن عالم اسلام کو اس وقت بڑے صدمے سے گزرنا پڑا جب ایک سازش کے نتیجہ میں ان کو شہید کردیا گیا،، ان کے بعد مملکت کے بادشاہ ان کے بھائی شاہ خالد بن عبدالعزیز

منتخب ہوئے، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ خاموش اور سنجیدہ شخصیت تھے، انھوں نے اپنے خاندانی وقار کے ساتھ شاہ فیصل کے چھوڑے ہوئے باعزت حالات کو باقی رکھنے میں بڑی کامیابی کا ثبوت دیا، ان کے چھوٹے بھائی فہد بن عبدالعزیز ولی عہد منتخب ہوئے تھے مملکت کے عملی معاملات عموماً وہی انجام دیتے تھے، انھوں نے شاہ فیصل مرحوم کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے اچھا تجربہ حاصل کر رکھا تھا، لیکن ان کے رجحانات سے لوگ ایک حد تک متردد تھے لیکن اب تک کے حالات نے کسی خرابی کی نشاندہی نہیں کی۔ اب جب کہ شاہ خالد کے بعد ان کا انتخاب بحیثیت بادشاہ کے کیا گیا تو ان سے اچھی توقع قائم کی گئی ہے اور یہ توقع بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئی انہوں نے ملک کی ترقی میں بڑا حصہ لیا چونکہ شاہ فیصل کے زیر سرکردگی کام کرتے رہے تھے تو شاہ خالد کے دور میں بھی وہ اسی طرح کام کرتے رہے اس میں شاہ خالد کے رویہ کا بھی اثر تھا کہ وہ خاموش اور نیک نسل انسان تھے۔

شاہ خالد کی نیک نفسی کا تذکرہ عام طور پر لوگ کیا کرتے تھے۔ ان کو ان کے موجودہ بھائیوں کے معاملہ میں پرانے اور روایتی رجحانات کی حمایت کرنے والا سمجھا جاتا تھا، اور یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ مملکت کی ان کی سربراہی کسی حد تک کسی بڑی تبدیلی سے بچانے کے ضامن ہے۔ ان کے دینی جذبہ کے لیے یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ انھوں نے گزشتہ رمضان میں حرم مکی میں آخری عشرہ اعتکاف میں گزارا، یہ بحیثیت بادشاہ ہونے کے بڑی بات ہے۔

ایک موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بھی ان سے ملاقات کی تھی اور مملکت سعودیہ کی ذمہ داریاں اور اس کی ملت اسلامیہ کے لئے مرکزی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کے مشورے دئے جو انہوں نے توجہ سے سنے امید ہے کہ یہ فائدہ سے خالی نہ رہا ہوگا۔

شاہ خالد رحمہ اللہ کہ عہد حکومت میں مؤسسۃ الملک فیصل الخیریہ کا قیام بھی عمل میں آیا اور بین الاقوامی شاہ فیصل ایوارڈ دئے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا مختلف شعبہ ہائے

حیات میں امتیازی و عالمی مقام و شناخت حاصل کرنے والی شخصیات کو ان کے میدانوں میں ایوارڈ دیا جانے لگا جس میں خدمت اسلام کے عنوان سے بھی غیر معمولی شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا اور اس عنوان سے علما کے حلقے سے پہلے ۱۹۷۹ء میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پھر ۱۹۸۰ء میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بین الاقوامی ایوارڈ دیا گیا شاہ خالد بن عبدالعزیز خود بھی علماء میں تھے اور علوم شرعیہ کی تعلیم ممتاز علماء سے حاصل کی تھی اس کے ساتھ وہ حافظ قرآن بھی تھے اور اپنے والد ملک عبدالعزیز آل سعود کے زمانہ میں عسکری خدمات بھی پیش کی تھیں ان کے کارناموں اور خدمات میں تعلیمی خدمات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں دمام میں شاہ فیصل یونیورسٹی اور مکہ مکرمہ میں جامعہ ام القری قیام ان کا کارنامہ ہے۔ افسوس کہ ان کو زیادہ موقع خدمت کا نہ مل سکا اور وہ ۷۷ سال مملکت سعودی عرب کے حکمراں رہ کر وفات پا گئے وہ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ۔ (۱۹۱۳ء) میں ریاض میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی ۷۱ سال کی عمر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور عفو و درگزر کا معاملہ فرما کر درجات بلند کرے آمین۔

صدر جنرل ضیاء الحق شہیدؒ

ہمارے پڑوسی اور مسلمان ملک پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق مع کئی رفقاء کے ایک ہوائی حادثہ میں انتقال کر گئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، للّٰہ ما أعطی ولہ ما أخذ وکل شیئ عندہ لأجل مسمی، رحمہ اللّٰہ رحمۃً واسعۃ وغفرلہ۔

جنرل ضیاء الحق شہید ان نیک صفت حکمرانوں میں تھے جن کو دین اور رجال دین سے محبت تھی اور وہ ان کی خدمت میں حاضری اور ملاقات کو باعث سعادت سمجھتے تھے، پاکستان کے ایک سفر میں جو خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی میں ہوا تھا جنرل ضیاء الحق کو ان کی تشریف آوری کا علم ہوا تو اسلام آباد کی دعوت دی لیکن ان کی مصروفیت اسلام آباد کے سفر سے مانع ہو رہی تھی تو خود ہی کراچی آکر ملنے کا پروگرام بنالیا اور اس موقع پر مجھے بھی انہیں قریب سے دیکھنے کو ملا اور نماز کا وقت آنے پر ساتھ میں نماز بھی پڑھی۔

جنرل ضیاء الحق شہید کا سن پیدائش ۱۹۲۴ء تھا اور ان کی شہادت کا واقعہ، بدھ ۱۷/اگست/۱۹۸۸ء مطابق ۵/محرم الحرام ۱۴۰۹ھ کو پیش آیا جس کا اثر پورے عالم اسلام نے بہت محسوس کیا اور خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز نے اس کا بھی اہتمام کرایا کہ جمعہ کی نماز کے بعد دونوں حرموں میں نماز غائبانہ ادا کی جائے اور بھی دنیا کے مختلف حصوں میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی اور مضامین ومقالات اور اپنے دلی تأثرات وجذبات کے اظہار کے ذریعہ تعلق ظاہر کیا۔

صدر محمد ضیاء الحق صاحب صوم صلوٰۃ کے پابند مسلمان اور اسلامی شریعت کے نفاذ کے لیے کوشاں انسان تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان اور ایک انسان کی حیثیت سے نیک دل متواضع، متحمل اور خلیق شخص تھے، انہوں نے اپنے مخالفین کی رائے اور مرضی

کے خلاف تو کیا، مگر ان پر اپنی طاقت کا استعمال نہیں کیا، جیسا کہ عام طور پر ڈکٹیٹر لوگ کرتے ہیں۔

بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی شریف سے ان کو بہت والہانہ تعلق تھا، سعودی حکمرانوں کے بعد کسی دوسرے مسلمان حکمراں نے حرمین شریفین میں اتنی بار حاضری نہ دی ہوگی، جتنی انہوں نے دی، اور وہاں حاضری پر اتنا زیادہ وقت وہاں صرف نہ کیا ہوگا جتنا وہ صرف کرتے تھے، مسلمانوں کی یکجہتی و ہمدردی کا بھی بڑا جذبہ رکھتے تھے، ایران عراق جنگ ختم کرانے کے لیے برابر کوشاں رہے، اس کے لیے خود بار بار سفر کئے اور وفد میں گئے، پڑوسیوں سے تعلق بہتر بنانے کے لیے بھی ان کا کردار اچھا رہا، ہندوستان میں وہ مختلف موقعوں سے بے تکلف آئے، اگرچہ ابھی کچھ عرصہ سے ہندوستان کی حکومت کا تاثر یہ رہا کہ ان کا رویہ اچھے پڑوسی کے رویہ کے مطابق نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ان کے اچھے رویہ کا بھی اعتراف ہندوستان کے متعدد اہم لیڈروں نے کیا ہے، ہم صدر ضیاء الحق صاحب کے اس رویہ سے یہاں بحث نہیں کرتے، کیوں کہ یہ ہمارا موضوع نہیں، لیکن بحیثیت ایک انسان کے اور اسلام کے لیے خیر خواہی رکھنے والے ایک مسلمان کے ہم ان کے حادثۂ وفات پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں۔

مرحوم میں متعدد اعلیٰ انسانی صفات کے ساتھ ایک مدبر اور دیدہ ور رہنما کی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں جن کی کمی ہر زمانہ میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حادثۂ ایسا ہے کہ

لمثل هذا إن كان يذوب القلب من كمد

إن كان في القلب إسلام وإيمان

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اس حادثہ سے ملت اسلامیہ اور اسلام کو جو بھی نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کی صورتیں پیدا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں عظیم و کریم جگہ عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود

افسوس کہ یکم اگست ۲۰۰۵ء کو شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود نے ریاض سعودی عرب میں طویل علالت کے بعد انتقال کیا، اِنا للہ وِانا الیہ راجعون۔

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز ۱۶ر مارچ ۱۹۲۰ء ۔مطابق ۲۵ر جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ کو ریاض میں پیدا ہوئے ان کی والدہ حصہ بنت احمد السدیری تھیں اور والد ملک عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود تھے جو ایک طاقت ور حکمراں شخصیت تھے شاہ فہد بن عبدالعزیز نے ۸۵ سال کی عمر پائی وہ ۲۱ شعبان ۱۴۰۲ھ ۔مطابق ۱۳ر جون ۱۹۸۲ء کو اپنے بڑے بھائی شاہ خالد بن عبدالعزیز کے وفات پانے پر سعودی عرب کے حکمراں ہوئے تھے، اس طرح ان کی مدت حکومت ۲۳ر سال رہی۔

انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں، حرمین شریفین خصوصاً مسجد نبوی کی توسیع اور خدمت کا جو کام کیا ہے، حجاج کرام کی راحت رسانی اور مملکت کی ترقی کا جو عمل کیا اس کی وجہ سے انھیں یاد کیا جاتا رہے گا، ان سے پہلے سعودی نظام حکومت قائم ہونے کے بعد شاہ سعود بن عبدالعزیز نے حرمین شریفین کے پہلے توسیعی پروگرام کا آغاز کیا تھا پھر ۱۴۰۸ھ میں شاہ فہد بن عبدالعزیز آل سعود نے دوسرے توسیعی پروگرام کو نافذ کیا جس کا تسلسل قائم ہے ان کا ایک امتیاز یہ بھی ظاہر ہوا کہ انھوں نے اپنے جلالۃ الملک کے خطاب کے بجائے خادم الحرمین الشریفین کہلانا پسند کیا، اور اس تعلق سے اسلام اور مسلمانوں کے تعاون کی جہاں ضرورت سامنے آئی تعاون دینے میں انھوں نے دریغ نہیں کیا، قرآن مجید اور دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم کی اشاعت کا کام، تصحیح عقائد کے سلسلے کا کام بھی ان کے کارناموں میں سے ایک ہے، ان کی خوبیوں میں اہل علمو

دین کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی بھی ہے اور دینی تحریکات اور مساجد و مدارس کے منصوبوں کی اعانت وتقویت کا کام بھی ہے اور اس سلسلے میں ان کے یہاں نسل وزبان کی تفریق نہیں رہی بلکہ دنیا بھر میں جہاں ان کو ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے تعاون سے دریغ نہیں کیا۔

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد سے مملکت میں ترقیات اور کتاب وسنت کی تقویت، اسلام کی نصرت اور شعائر اللہ کی خدمت کے جو عظیم کارنامے انجام دیے، وہ پوری امت مسلمہ کی طرف سے ایک بہت عظیم نمائندگی اور سرپرستی کے طور پر دین وملت کی خدمت تھی کہ جو پوری امت کی طرف سے شکریہ پیش کرنے اور اعتراف فضل کرنے کے لائق ہے، قرآن کریم کی وسیع ترین اشاعت اور حرمین شریفین کی عظیم توسیع اور مدینہ منورہ کی تمدنی ترقی کے لیے انھوں نے جو غیر معمولی دلچسپی لی، اور غیر معمولی مصارف کا انتظام کیا، وہ صدیوں میں کیا جانے والا کام ہے، اس کام کو اور شاہ فہد کو عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے تعلق تھا جس کا زیادہ اظہار ان کے انتقال کے بعد اس طور پر ہوا کہ رمضان المبارک کی راتوں میں سب سے اہم اور بہت بابرکت سمجھی جانے والی رات ۲۷ ویں شب کو دونوں حرموں نماز جنازہ غائبانہ کا اہتمام کرایا اور یہ اہتمام ان کا نام لیکر کیا گیا اور راقم السطور کے نام اپنے تعزیتی مکتوب میں بھی اس اہتمام کا ذکر کیا اس سے ان کے دینی مزاج اور علماء کی قدر دانی کے جذبہ کا پتہ چلتا ہے۔

شاہ فہد رحمہ اللہ کی توجہ کا مرکز ان کے زمام حکومت سنبھالنے کے بعد سے ہی حجاج بیت اللہ اور زائرین مسجد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سہولیات فراہم کرنا اور اس کے لیے حرم نبوی کو توسیع دینا بن گیا تھا، اور انھوں نے اس سلسلے میں جس فراخ دلی اور دینی وملی جذبے کا ثبوت دیا، اس میں وہ اپنے پیشروؤں پر سبقت لے جاتے نظر آتے ہیں۔

شاہ فہد بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو اپنے ولی عہد شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز سے جو کہ

اب ان کی جگہ پر ہیں سے بڑا تعاون حاصل رہا وہ ان کی علالت کے عرصہ میں نیابت کا کام بھی انجام دے رہے تھے اور ان کے بعد ان کے شروع کئے ہوئے کاموں کا نہ صرف انہوں نے تسلسل قائم رکھا بلکہ اس کو اور وسعت دی ان کی جگہ ولی عہد مملکت امیر سلطان بن عبدالعزیز ہوئے ہیں۔

سردار فاروق احمد خان لغاریؒ

گزشتہ دنوں اخبارات ورسائل کے ذریعے یہ خبر معلوم ہوکر قلق ہوا کہ سابق صدر پاکستان فاروق احمد خان لغاری بھی دنیا میں نہیں رہے، اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے، إناللّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

سردار فاروق احمد خان لغاری کا سانحۂ وفات قلبی تکلیف کے نتیجہ میں جو انہیں پہلے سے تھی ۲۰/اکتوبر ۲۰۱۰ء کو راولپنڈی میں ہوا، وہ ۲۹/مئی ۱۹۴۰ء کو پیدا ہوئے اس ان کی عمر ۷۰ سال ہوئی۔

سردار لغاری صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، اور ان کو قوم وملت کی خدمت کے لیے اعلیٰ مناصب ملے، یہاں تک وہ ترقی کر کے اپنے ملک کے سب سے اہم منصب صدارت پر فائز ہوئے، ان کا تعلق پاکستان کی اہم سیاسی پارٹی پیپلز پارٹی سے رہا تھا، اور اسی برسراقتدار پارٹی نے ان کا نام صدارت کے لیے پیش کیا، لیکن یہ ان کی دیانت اور امانت داری کی بات تھی کہ جب اس وقت کی برسراقتدار پارٹی پیپلز پارٹی سے متعلق لوگوں کی طرف سے کرپشن کی اطلاعات ان تک پہنچیں تو انھوں نے حکمراں پارٹی کو اس کے سد باب کے لیے متوجہ کیا، اور ایسا نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے اپنی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے حکومت کو برطرف کر دیا۔

لغاری صاحب کو دین اور اہل دین سے لگاؤ تھا، اس کا کھلا نمونہ راقم نے اس وقت دیکھا جب ۲۴/۲۵/اکتوبر ۱۹۹۷ء کو لاہور (پاکستان) مین عالمی رابطۂ ادب اسلامی کا انٹرنیشنل سمینار ''حرمین شریفین کے سفرنامے جدید تحدیات کے تناظر میں'' کے عنوان سے منعقد ہوا، اور اس میں وہاں کے منتظمین نے لغاری صاحب کو شرکت کی دعوت دی، اور یہ بھی

اطلاع دی کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب بھی شرکت فرما رہے ہیں تو انھوں نے حضرت مولانا سے اپنے قدیم تعلق اور وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے اور سمینار کے موضوع کی اہمیت کی پیش نظر رکھ کر شرکت کا وعدہ کرلیا، چنانچہ انھوں نے اس کے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی، جس کے لیے وہ کراچی سے خاص طور پر شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، اور ان کا مفید صدارتی خطاب بھی ہوا۔ لغاری صاحب نے اپنے تعلق کا اظہار اس طرح بھی کیا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کے ٹھہرنے کے لیے لاہور میں مال روڈ پر واقع اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں نظم کیے جانے کی خصوصی ہدایت کی تھی، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرنے کا نہیں تھا، اور وہ اپنے خاص اہل تعلق کی قیام گاہ یا مدرسے وغیرہ میں قیام کو ترجیح دیتے تھے، اس لیے جامعہ اشرفیہ میں قیام کو ترجیح دی، اور حکومت کے گیسٹ ہاؤس تھوڑی دیر کے لیے گئے، پھر جامعہ اشرفیہ منتقل ہوگئے۔

لغاری صاحب مرحوم نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے تعلق کو اس طرح بھی ظاہر کیا کہ انھوں نے وزارت خارجہ کی ذمہ داریوں کے دوران میں ایک مرتبہ مولانا کی اقتداء میں جنیوا کے ایک ہوٹل میں نماز پڑھی تھی جس کی لذت وہ آج تک محسوس کرتے ہیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی ملاقات مختصر رہی لیکن وہ بڑے تعلق سے ملے، جس سے محسوس ہو رہا تھا کہ دین کی نسبت سے ان کا یہ تعلق نیا نہیں پرانا ہے، بعض اہل تعلق نے بتایا کہ جب لغاری صاحب کو رابطہ ادب اسلامی کے سمینار میں شرکت کی دعوت دی گئی اور حضرت مولانا علی میاں صاحب کی شرکت کو بھی بتایا گیا تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ وہی علی میاں تو نہیں ہیں جو دبلے پتلے بزرگ ہیں، جن کا تعلق لکھنؤ شہر سے ہے اور اہل عرب بھی ان کا بے حد احترام کرتے ہیں، سوئزرلینڈ میں ہم اکٹھے تھے، ایک مصری عرب سعید رمضان بھی ہمارے ساتھ تھے، سیر کرتے کرتے ایک سرسبز وشاداب پہاڑی پر میں نے اور اس عرب سعید رمضان نے ان کے پیچھے نماز پڑھی تھی، ان کا حسن قراءت، جذب وشوق اور خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کا منظر آج بھی مجھے یاد ہے، میں اور میرے وہ عرب

دوست اس ناقابل فراموش منظر سے بہت محظوظ ہوئے تھے، اگر یہ وہی مولانا علی میاں ہیں تو پھر اس دن کی میری تمام مصروفیات ومعمولات منسوخ، میں اس افتتاحی اجلاس میں ضرور شریک ہوں گا۔

لغاری صاحبؒ نے یہ اہتمام بھی کیا کہ وہ افتتاحی اجلاس کے اختتام کے بعد جمعہ کی نماز پڑھنے جامعہ اشرفیہ کی مسجد گئے جہاں حضرت مولانا کو بھی نماز پڑھنی تھی، اور وہیں ان کی تقریر اور دعا میں بھی شرکت کی، لغاری صاحبؒ کا جب اجلاس میں شرکت پر شکریہ ادا کیا جانے لگا تو انھوں نے یہ کہہ کر خود شکریہ ادا کیا کہ شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کا شرف بخشا گیا، یہ تو میرا فرض تھا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی تشریف لائیں اور میں نہ آؤں، یہ کیسے ممکن ہے؟

اللہ تعالیٰ لغاری صاحبؒ کی مغفرت فرمائے اور ان کی خدمات کو جو انھوں نے اپنے ملک وملت اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے پیش کیں قبول فرمائے۔ لغاری صاحب ادھر کافی عرصے سے علیل تھے، اللہ تعالیٰ ان کے صاحبزادگان سینئر جمال لغاری صاحب اور جناب اُویس لغاری صاحب ان کا نعم البدل بنائے۔

(۳) ادباء و مصنفین اور صحافی

(۱) ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشاؒ
(۲) سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ
(۳) پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ
(۴) میر مقصود علی خاں بنگلوریؒ
(۶) مولانا سید وصی مظہر ندویؒ
(۷) مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ
(۸) ڈاکٹر محمود احمدؒ غازی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت باشا

عالم عربی کے مشہور اسلامی مفکر وادیب اور مصنف پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت الباشا کا حادثۂ وفات صرف عالم عربی کے لیے نہیں ملت اسلامیہ اور اسلامی ادب کے لیے زبردست خسارہ کی بات ہے، وہ استنبول (ترکی) چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے کہ وہیں ۱۸/ جولائی ۱۹۸۶ھ کو انتقال فرما گئے، انا للہ و انا الیہ راجعون،

استاد عبدالرحمٰن رافت الباشا شام کے شہر حلب کے مضافات میں پیدا ہوئے یہ تین ماہ کے تھے اسی وقت ان کے والد کا انتقال ہوگیا ان کی تربیت ان کے دادا نے کی، جو ایک بہت بڑے عالم اور حافظ قرآن تھے، اس کے ساتھ ساتھ صحیح بخاری کے بھی حافظ تھے، ڈاکٹر باشا کہا کرتے تھے کہ ان کے ذہن ودماغ میں اسلام کی قدر وعظمت کو جاگزیں کرنے اور قرآن وحدیث سے شغف پیدا کرنے میں ان کے دادا کا ہاتھ ہے۔ ڈاکٹر باشا مرحوم نے حلب اور دمشق میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد عربی کے استاد ہوئے پھر حلب میں انسپکٹر آف اسکول رہے پھر قاہرہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اور ۲۲ سال سے امام محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض میں پروفیسر اور پچھلے کئی سالوں سے وہ یونیورسٹی میں شعبۂ ادب عربی کی صدر تھے، اس طرح انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایک پوری نسل تیاری کردی ہے۔

ڈاکٹر باشا مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اور ندوۃ العلماء سے بڑا گہرا تعلق رکھتے تھے، انھوں نے مولانا کی اسلامی ادب کی دعوت کو لبیک کہا، اور اس کو اپنا لیا، چنانچہ انھوں نے خود مسلم نوجوانوں کے لیے "صور من حیاۃ الصحابۃ" اور "صور من حیاۃ التابعین" کے نام سے کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کردیا، اسی کے ساتھ انھوں نے تحقیق وریسرچ کرنے والے اپنے طلبہ سے "شعر الدعوۃ الإسلامیۃ" کے عنوان سے چھ جلدیں تیار کرائیں، وہ

اسلامی ادب کے موضوع پر جامعۃ الامام ریاض میں جہاں وہ استاد تھے کانفرنس رکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش پوری ہوئے دیر لگی جس کی بنا پر ندوۃ العلماء میں منعقد کرنے کی تجویز آئی اور الحمدللہ بہت اچھے پیمانہ پر ندوۃ العلماء میں ۸۰ء میں سمینار منعقد ہوا جس میں عرب وہندوپاک کے اساتذہ تخصص ادب اچھی تعداد میں شریک ہوں اور اس ادب اسلامی کی انجمن قائم کرنے کی کچھ تجویزیں پاس کیں جس پر عمل درآمد پانچ سال کے بعد رابطہ ادب اسلامی کے قائم ہونے سے ہوا، اس کا صدر دفتر ندوۃ العلماء میں قائم ہوا اور صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ منتخب ہوئے اور ڈاکٹر پاشا نائب صدر منتخب ہوئے۔ ان علمی خدمات کے ساتھ وہ نہایت متواضع خلیق اور وسیع القلب تھے، انھوں نے اپنی زندگی ادب کی راہ سے اسلام کی خدمت میں گزاری، جب ان کو ندوہ کی طرف سے مذاکرۂ ادبیات اسلامی میں شرکت کی دعوت دی گئی، تو صرف یہی نہیں انھوں نے اس دعوت کو منظور کیا تھا بلکہ اس کو اپنا کام سمجھا تھا اور جلسہ کی نظامت بھی کی تھی، اس طرح وہ بجائے مہمان کے میزبان بن گئے، اور وہ فرائض وخدمات انجام دیں جو ہماری ذمہ داری بنتی تھی۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ عالمی رابطۂ ادب اسلامی کا جب قیام عمل میں آیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی صدر منتخب ہوئے تو یہ اس عالمی ادبی تنظیم کے اول نائب صدر قرار پائے، اور عرب ممالک، یورپ، امریکہ اور افریقہ سے متعلق رابطہ کے شعبہ کے سربراہ ہوئے، وہ اس میدان کے ایک مجاہد تھے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی علمی دینی ودعوتی خدمت کو قبول فرمائے، اور انھیں اس پر بہتر سے بہتر صلہ عطا کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

۱۸ نومبر ۸۷ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور وقیع علمی و تحقیقی رسالہ ماہنامہ ''معارف'' کے مدیر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے اس جہان فانی سے جہان باقی کی طرف رحلت کی، موصوف کا سانحہ وفات ایک حادثہ کے طور پر پیش آیا، وہ رکشا سے لکھنؤ شہر کے ڈالی گنج پل پر سے گزر رہے تھے کہ گاڑیوں کی بے ترتیبی اور دھکّے سے گر پڑے اور یہ گرنا ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔

سید صاحب مرحوم نے تقریباً ۷۵ سال کی عمر پائی۔ لیکن یہ عمر انھوں نے علم وادب اور امت اسلامیہ ہند کی خدمت میں بہت مفید ڈھنگ سے گزاری وہ سیاست کے میدان میں نہیں رہے۔ اور نہ انھوں نے اصلاح و وعظ کا عمومی میدان اختیار کیا۔ انھوں نے صرف علم و تحقیق اور سنجیدہ صحافت کا میدان اختیار کیا اور اس میں وزنی اور مفید کام انجام دیے۔ ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند در چند قیمتی کتابیں لکھیں۔ اور تحقیقی کام کیے، جن سے متعدد مسلم دشمن نظریات جنھوں نے بعض مخالف اسلام تحریروں کے اثر سے شہرت و عمومیت حاصل کر لی تھی۔ اپنی علمی تحقیق سے غلط ثابت کیا اور اسلامی تاریخ سے الزام کو دور کیا۔ بابری مسجد کے حقائق پر بھی ایک وقیع علمی و تحقیقی کتاب لکھی جس میں انھوں نے تاریخی حقائق سے ان الزامات کو بے بنیاد اور غلط ثابت کیا جو مسلم حکمرانوں پر مسلم دشمن نظریات کے تحت عائد کیے گئے۔

ہندوستان کے مشائخ وصوفیہ پر ان کی قیمتی کتاب بزم صوفیہ ایک گراں قدر کتاب ہے، اور مسلمان حکمرانوں کی رواداری پر ان کی کتاب ہندو گردی کے آج کے

دور میں ہندوستانی مسلمانوں کے بلند کردار کی ایک مدلل وضاحت ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا پسندیدہ اور خاص موضوع تاریخ تھا۔ شبلی ڈگری کالج میں اس کے پروفیسر کی حیثیت سے، پھر دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے اس موضوع پر تحقیق وافادہ کا کام کرتے تھے اور دارالمصنفین میں ان کی علمی کاوشوں کے شاندار نمونے سامنے آتے رہے۔ اور وہ دارالمصنفین کے سابق ناظم شاہ معین الدین احمد ندوی کی جگہ پر ناظم منتخب ہوئے، انھوں نے اس عہدہ کی ذمہ داری کو بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اور دارالمصنفین کو مالی انتظامی استحکام عطا کیا۔ نظامت کے انتظامی فرائض کی مصروفیات میں بھی انھوں نے اپنی علمی وتحقیقی مصروفیات کو قائم رکھا۔ اور علمی وتحقیقی میدان میں برابر نئی چیزیں پیش کرتے رہے۔

سید صاحب کا قلم علمی اسلوب کی سنجیدگی قائم رکھتے ہوئے ادبی رعنائی کا بھی حامل تھا، وہ جب طبیعت کے جوش کے ساتھ لکھتے تھے تو بہت شاندار وحسین انداز تحریر اختیار کرتے، جس سے ان کی تحریر پڑھنے والے جھوم اٹھتے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ تحقیقی وفکری پہلو میں کمزوری نہیں پیدا ہوتی تھی۔

سید صاحب کے علمی وادبی مقام کا اعتراف ہندوپاک دونوں علمی وادبی حلقوں میں کیا جاتا تھا۔ اور ان کو متعدد انجمنوں کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔ تاریخ وادب اور اسلامیات کے سیمیناروں میں وہ مدعو ہوتے تھے، اور اپنی تحقیق وتحریر سے وہ شرکاء کو مستفید ومحظوظ کرتے تھے۔

دارالمصنفین کا علمی وتحقیقی واسلامی ادارہ خود ایک بڑے بلند مقام کا مالک ہے، اس عظیم علمی وملی ادارہ کے بانی مایہ ناز علمی وادبی شخصیت علامہ شبلی نعمانی اور اس کے اولین سربراہان میں ممتاز ومعروف عالم دین اور محقق علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مقتدر اسلامی شخصیت مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور اس کے نمایاں کارگزاران علم وتحقیق میں مولانا عبدالسلام ندوی جیسے حضرات رہے ہیں۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا ایسے ادارہ کا سربراہ ہونا ان کے لیے نہ

صرف شرف کی بات تھی۔ بلکہ مسلمانوں کی اجتماعی وعلمی زندگی میں ان کے ایک مقتدر شخصیت ہونے کی دلیل بھی تھی۔ سید صاحب موصوف نے اس سربراہی کو بحسن وخوبی پورا کیا۔ اور نہ صرف اس عظیم ملی ادارہ کو ترقی دی۔ بلکہ اپنی علمی وتحقیقی کاوشوں سے بھی ادارہ کی علمی شہرت کو قائم رکھا اور بڑھایا۔ آپ کی وفات سے ادارہ کو ایک دھکا پہنچا ہے۔ اس کے علمی وانتظامی دونوں پہلوؤں میں ایک خسارہ ہوا ہے۔ جس کی تلافی کی فوری صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام اور شہرت کو باقی رکھنے والے افراد مہیا فرمائے۔ اور اس کے علم وتحقیقات اسلامی کے سفر کو بخیر وخوبی جاری رکھنے کی بہتر سے بہتر صورت پیدا فرمائے۔

ان کا ایک بڑا کام اور علم ودین کی بڑی خدمت ''اسلام اور مستشرقین'' سے متعلق دارالمصنفین اعظم گڑھ میں ایک بین الاقوامی سمینار کا انعقاد تھا جس میں دنیائے اسلام کی ممتاز ترین دینی وعلمی بلکہ اپنے نہایت علمی وتحقیقی مقالات بھی پیش کیے اور پُر درد وفکر انگیز خطابات سے لوگوں کو جھنجوڑنے کا کام بھی کیا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے قیمتی مقالے کے ساتھ اس میں شرکت فرمائی، جب کہ چار روز پہلے انھیں اپنے بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنی کی وفات کے صدمہ سے گزرنا پڑا تھا اور ان حالات میں ان کے لیے سفر آسان نہیں تھا، مگر سمینار کے موضوع، دارالمصنفین سے تعلق اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے خیال سے انھوں نے سفر کو ملتوی نہیں ہونے دیا، اور انھوں نے اس میں اپنا پورا حصہ لیا جس سے سید صاحب نے بڑی تقویت محسوس کی اور وہ برابر حضرت مولانا اور ندوۃ العلماء کے شکر گزار رہے۔

سید صاحب ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے بھی ایک معتمد رکن تھے۔ اور ندوۃ العلماء سے تعلق ودلچسپی کا گہرا ربط رکھتے تھے، یہاں کے اجتماعات اور سیمیناروں میں شرکت کرتے اور مفید حصہ لیتے۔ ابھی اسی ہفتہ میں جس میں ان کی وفات ہوئی، وہ ادب اسلامی کے ایک سیمینار میں شریک ہوئے تھے۔ اور اس کی ایک نشست کی صدر نشینی بھی کی تھی۔ کیا

معلوم تھا کہ اس کے بعد جلد ہی وہ اس دنیا کے جہد وعمل سے سفر اختیار کر لیں گے۔

سید صاحب اپنی زندگی کے علمی وتحقیقی وادبی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی شخصی زندگی میں بھی مرنجامرنج صفات کے مالک تھے۔ سب سے اخلاق ومحبت سے ملنے والے ،تواضع وانکساری کے حامل، زبان کے بڑے میٹھے اور محبت والے شخص تھے وہ اپنے دوست تو دوست اپنے مخالفوں کے لیے بھی نرم اور ہمدرد دل رکھتے تھے۔ عالمانہ ظرافت اور ادبی اسلوب سے اپنی گفتگو کو دل نواز بنا دیتے تھے، انھوں نے اپنی ان خوبیوں اور اخلاق سے بہت سے لوگوں کو اپنا محب اور قدرداں بنالیا تھا اور علمی وادبی حلقوں میں بہت اچھی جگہ بنالی تھی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز تھے اور ان سے ان کو والہانہ تعلق بھی تھا ان کے فیض وصحبت اور علمی رہنمائی میں انھوں نے وقت بھی گزارا تھا۔ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندویؒ کے لگائے ہوئے علمی چمن کی آبیاری کے لیے وہ تیار ہوئے تھے، جو انھوں نے بخیر وخوبی انجام دی۔

سید صاحب دینی جذبہ وعمل میں بھی کم نہ تھے اپنے کو اس کے لحاظ سے بھی ترقی دینے کی طرف متوجہ رہے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی سے تعلق قائم کیا تھا۔ ان کی حیات میں ان کی خدمت میں کئی بار حاضری دی۔ پھر ابھی گزشتہ سال بڑے جذبہ کے ساتھ عمرہ ادا کیا۔ اور اس کے لیے کئی سال سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت کے انتظار میں رہے تھے اور پھر انھی کے ہمراہ یہ دینی تقاضا پورا کیا۔ پھر اس کا تذکرہ اپنے کسی مضمون یا سفرنامے میں نہیں کیا کہ اس عمل میں تشہیر کیوں کریں، بابری مسجد کا جب قضیہ اٹھا تو انھوں نے اس مسئلہ پر تاریخ کے اس سے متعلق حصے کا دوبارہ اور گہرا مطالعہ کر کے علمی دلائل وشواہد سے ایک رسالہ تیار کیا جو اس مسئلہ پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے دین کی حمیت کا اظہار بھی بارہا ان کے قول وعمل سے ہوتا رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے یہاں بلند مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

پروفیسر خلیق احمد نظامیؒ

۵؍دسمبر ۱۹۹۷ء کو پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علی گڑھ میں جو ان کی خدمات علمی کا مرکز رہا تھا اور وہیں ان کی رہائش گاہ بھی تھی، اس عالمِ فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی اور وہ علمی دنیا میں ایک ایسا خلا چھوڑ گئے جس کو عرصہ تک محسوس کیا جائے گا، وہ علم کے صرف جویا نہ تھے بلکہ علم کے خزانہ میں اضافہ کرنے والے تھے، اور نئی بیش بہا تحقیقات سامنے لانے والے محقق تھے، وہ عہد کے لحاظ سے جدید زمانہ میں ت ہے اور علمی انہماک اور کام کی مقدار کے لحاظ سے پرانی نسل کے فرد معلوم ہوتے تھے، جس کے متعلق کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایک آدمی کے بجائے اکاڈمی تھے، انھوں نے علمی زندگی کو صرف اختیار ہی نہیں کیا تھا، بلکہ وہ اس میں غرق ہوگئے تھے، انھوں نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا، پھر اس کا پورا حق ادا کیا، برصغیر کی اسلامی تاریخ کو موجودہ نسل کے سامنے اس کی صحیح شکل میں اور علم وتحقیق کے معیار پر پورا اترنے والے نہج پر پیش کرنے کا کام جدید مسلمان مؤرخین اس طرح انجام نہیں دے رہے تھے جس طرح کی ضرورت تھی، یہ ایک ذمہ داری تھی بلکہ ایک فرض تھا، جس کو پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب نے بجا طور پر محسوس کیا اور اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی، ان کی تیار کردہ کتابوں میں برصغیر کی مایۂ ناز اور حالات پر اثر انداز ہونے والی شخصیتوں کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ صرف ایک علمی کارنامہ ہی نہیں ہے بلکہ اس علمی فریضہ کی ادائیگی کا ایک بیش قیمت نمونہ ہے جو برصغیر کے اہل علم کے ذمہ چلی آرہی تھی۔

پروفیسر صاحب نے برصغیر کے مسلم دور میں کام کرنے والی عبقری شخصیتوں کے فکر انگیز پہلوؤں اور انقلاب انگیز کارناموں کو اُجاگر کیا جن میں سے کئی شخصیتوں کے بعض پہلو بڑی حد تک پہلی بار سامنے لائے ہیں، ان میں ممتاز خصوصیات کے سلاطین بھی ہیں،

اور جنگ آزادی کے اہم مسلم زعماء بھی۔

پروفیسر صاحب علمی وتحقیقی مزاج کے ساتھ دردمند دل بھی رکھتے تھے انھوں نے مسلم تاریخ سے ایسی شخصیتوں کو خاص طور پر چُنا جنھوں نے مسلمانوں کی سیرت واخلاق پر گہرا اثر ڈالا، یہ صوفیائے کرام تھے جن کی دلنواز پر اثر شخصیتوں اور نرم ومحبت بھرے کردار نے برصغیر کے انسانی چہرے کے خدوخال بدل دیئے اور آج مسلم امت کی دین ومذہب سے جو وابستگی ہے اس میں ان صوفیہ حضرات کی کوششوں کا اثر سب سے زیادہ ہے، پروفیسر صاحب نے اپنی تصنیفات میں اپنی اختیار کردہ شخصیات کے اُن پُر اثر کارناموں کو نمایاں کیا جو عام نظروں میں نہیں آئے تھے، اس موضوع پر ان کی کتاب ''تاریخ مشائخ چشت'' انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ''نگاہ فقر'' کے عنوان سے اپنے فریدی خاندان کی تاریخ بھی مرتب کی جو انساب سے متعلق کتابوں میں ہی گرانقدر اضافہ نہیں ہے بلکہ تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری میں بھی اہم اضافہ ہے ان کے تصنیفی منصوبوں میں مشائخ نقشبندیہ کے حالات وتاریخ اور ان کے اثرات پر تحقیقی کام پیش کرتا تھا اور غالباً انہوں نے اس کام کا آغاز کر بھی دیا تھا کہ وقت موعود آپہونچا اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

پروفیسر صاحب نے مسلم ہندوستان کی تاریخ پر ایک کتب خانہ تیار کر دیا جو ایک تحقیق مصنف کے قلم سے ہونے کے لحاظ سے عظیم اور بلند علمی معیار کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر ہے۔ وہ ندوۃ المصنفین دہلی کے اعزازی رفیق ہوگئے تھے اور ان کی اہم کتابیں اس ادارے نے شائع کیں جن میں ایک اہم اور منفرد کتاب حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہے انہوں نے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور تحریک آزادی کو بھی موضوع بنایا اور اس سلسلہ میں اپنی تحریر وتحقیق سے لوگوں کو متاثر کیا۔

پروفیسر صاحب اپنے علمی مزاج کے ساتھ اخلاق، دوست نوازی، اصحاب علم سے الفت، طالبانِ علم کے ساتھ شفقت میں بھی ممتاز تھے، اپنی ان صفات سے بھی انھوں نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، دراصل وہ جس ماحول کے تربیت یافتہ تھے اس میں بڑائی

کے ساتھ تواضع اور علم کے ساتھ دین سے تعلق کا مزاج بنتا تھا اور یہ مزاج پروفیسر صاحب میں نمایاں محسوس کیا گیا، ان کو اس دنیاوی وجاہت اور بڑائی کا حصہ وافر ملا تھا وہ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبہ سے وائس چانسلر کے عہدہ تک پہنچے ان کو ان کی عالمی کاوشوں پر اعلیٰ انعامات ملے، وہ عرب دنیا میں اپنے ملک کی سفارت پر بھی رہے، یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد دنیائے علم کی پُر وقار مجلسوں میں ممتاز حیثیت سے شریک ہوئے، ان کے علمی مقام کو احترام کے ساتھ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اس سب کے باوجود ان سے کوئی بھی علم کا جویا ملتا، تو ہمدردی اور مدد کا رویہ محسوس کرتا وہ اس کو مشورہ دیتے اور فائدہ پہنچاتے، وہ کہیں بھی علم سے دلچسپی کی فضا دیکھتے تو دلچسپی لیتے اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے اپنے اس علمی مزاج اور دینی رجحان کی بنیاد پر ان کو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بھی خصوصی تعلق تھا اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بھی ان سے خصوصی ربط رکھتے تھے، دونوں ایک دوسرے کی بڑی قدر کرتے، ملاقات پر مسرت وتعلق خاطر کا بڑا اظہار ہوتا، ایسا محسوس ہوتا کہ عرصہ سے دونوں ایک دوسرے سے ملاقات کے متمنی رہے ہوں اور بڑے انتظار کے بعد ملاقات ہوئی ہو، دونوں جمع ہو جانے پر علمی گفتگو ایسے شوق وذوق سے کرتے کہ سننے والے کو لطف حاصل ہوتا، اور قیمتی فائدہ پہنچتا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب ہی کی خواہش پر مولانا نے آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹیڈیز کی رکنیت اور صدارت قبول کی اور اس کے ٹرسٹی بورڈ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کا سبب زیادہ پروفیسر صاحب کا پاس خاطر ہوتا، بلکہ بعض موقعوں پر مولانا فرماتے کہ وہاں کئی روز پروفیسر خلیق صاحب کے ساتھ گذارنے کا موقع ملے گا، پروفیسر خلیق صاحب کا مولانا نے ربط وتعلق غالباً دو وجوہ سے تھا، ایک تو تاریخ کے موضوع سے دلچسپی میں اشتراک کہ مولانا بھی تاریخ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور یہ دلچسپی ان کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی ہے جو کہ برصغیر کی اسلامی تاریخ کے عظیم افراد اور برصغیر کی ثقافتی وعلمی تاریخ پر عربی میں بڑی مفید جامع اور وسیع کتابیں لکھ چکے ہیں، پروفیسر خلیق صاحب نے

کئی بار اس کارنامہ اور کارنامہ والے کو سراہا ہے۔

دوسری وجہ مولانا کا برصغیر کی عظیم تاریخ اصلاح و جہاد کے زعیم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے خاندانی تعلق تھا، جس کا وہ پاس ولحاظ کرتے، حضرت شہیدؒ سے پروفیسر صاحب کا تعلق ان کے دینی احساس ومزاج اور اسلامی ودینی ذوق کی بنا پر تھا، اور اس لیے بھی تھا کہ ان کے خاندانی بزرگوں پر حضرت سید صاحب کی تحریک کے اثرات پڑے تھے، انھوں نے ان کی شخصیت پر باقاعدہ سیمینار میں توسیعی خطبہ بھی دیا، جو رسالے کی شکل حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد کے نام سے دارعرفات رائے بریلی سے شائع ہوا۔

پروفیسر صاحب کا خاندان علم ودین دونوں سے وابستگی رکھنے والا خاندان تھا، ان کے ماموں جن کی صحبت سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا تھا، ایک پارسا اور سادہ زندگی کے حامل عالم دین تھے، پروفیسر صاحب نے یقیناً ان سے بھی اپنے تاریخی ذوق کا کچھ حصہ حاصل کیا ہوگا، وہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی رحمۃ اللہ علیہ تھے جنھوں نے ہندوستان کے کئی مایۂ ناز بزرگوں اور بلند پایہ علمی ودینی شخصیتوں کی سوانح نگاری اور ملفوظات ومکتوبات کا ترجمہ کرنے اور جمع کرنے کا کام کیا تھا۔

اس خاندان کا تعلق اصلاً امروہہ سے ہے اور پورا گھرانہ علمی فضا رکھتا رہا ہے، خود پروفیسر صاحب کے صاحبزادگان نے بھی علمی راہوں کو ہی اختیار کیا ہے اور ان کے ایک صاحبزادے ڈاکٹر فرحان احمد نظامی تو آکسفورڈ یورپ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ وہیں ایک اسلامی سنٹر قائم کرنے کا ذریعہ بنے جو آکسفورڈ یونیورسٹی جیسی خالص اعلیٰ مغربی مرکز علمی قائم کرنے کا مرادف ہے اور یہ کام انھوں نے دراصل اپنے عظیم والد کی مدد سے کیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے تھے، اور جن کی قدر ومنزلت ہندوستان میں کی جانے کے ساتھ باہر کی یونیورسٹیوں میں بھی کی جاتی تھی، آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کے متعدد علمی منصوبوں کی تجویز پھر اس کے کاموں کی انجام دہی اور فکر میں پروفیسر خلیق احمد صاحب کا اولین حصہ رہا، خاص

طور پر اسلام سے تعلق رکھنے والے منصوبے جو ایک وسیع اسلامی تاریخ اور اس کے ایک اعلیٰ معیار کے وسیع اٹلس کی تیاری پر مشتمل ہیں۔

پروفیسر صاحبؒ سے میرا تعارف دراصل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تعلق سے ہوا، پھر اسی تعلق کی بنا پر مجھے آکسفورڈ کے متعدد سفروں میں شرفِ رفاقت حاصل ہوا، نیز بعض ان علمی اداروں کی مجلس عاملہ میں مجھے بھی رکنیت کی سرفرازی حاصل ہے جس میں پروفیسر صاحب رکن رکین تھے، خاص طور پر دارالمصنفین اعظم گڑھ اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور آکسفورڈ کا اسلامی سنٹر چنانچہ پروفیسر صاحب کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان سے مانوس ہونے اور ان کی شفقت سے متمتع ہونے کا موقع ملا، میں نے اس طرح ان کو قریب سے دیکھا اور انھوں نے میرے ساتھ خصوصیت کا معاملہ کیا جو میرے لیے مسرت کے ساتھ شرف کی بھی بات ہے، پروفیسر صاحب کی وفات برصغیر کی امت اسلامیہ کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے اور ایک بڑا علمی خسارہ ہے، یہ خسارہ اس لیے بھی بڑا خسارہ ہے کہ ایسے عظیم افراد آہستہ آہستہ جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے والے اس تعداد میں نہیں بن پارہے ہیں جس تعداد میں وہ اٹھتے جارہے ہیں۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر صاحب مرحوم کو سعادت مند صاحبزادگان عطا ہوئے، جو علم اور دین سے تعلق رکھتے ہیں، اور تصنیفی ذوق وصلاحیت کے بھی حامل ہیں خاص طور سے پروفیسر فرحان احمد نظامی جو آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر کے ڈائرکٹر ہیں، اور پروفیسر احتشام احمد نظامی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اور دعوت وتبلیغ کے کام سے بھی جڑے ہوئے ہیں اور صالح شخص ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پروفیسر صاحب کو ان کی ان کوششوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور ان کی علمی کاوشوں کو امت اسلامیہ کے لیے استفادہ کا قیمتی ذریعہ بنائے ہیں۔

میر مقصود علی خاں بنگلوریؒ

بنگلور سے عزیز گرامی مولوی سید مصطفیٰ رفاعی ندوی صاحب کا فون آیا کہ روزنامہ ''سالار'' کے چیف ایڈیٹر اور بنگلور کے متعدد رفاہی وملی اداروں کے ذمہ دار جناب میر مقصود علی خاں صاحب ۳۰/ اگست ۱۹۹۹ء کو راہی بقا ہوئے، متعدد اہل تعلق کے پے در پے حادثات کے بعد اس خبر نے طبیعت کو بڑا متاثر کیا، ان کا سانحۂ وفات صرف ان کے اہل خاندان کے لیے سانحہ کی بات نہیں ہے بلکہ ایک ملی سانحہ ہے، وہ عصر حاضر کی دینی واجتماعی ثقافت کا نمونہ تھے، عثمانیہ یونیورسٹی میں حضرت مولانا عبدالباری ندوی اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی سے شرف تلمذ حاصل کیے ہوئے تھے، علم دوست، حق شناس، خدا ترس، محبّ ومحبوب شخصیت کے مالک تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دست گرفتہ تھے اور اپنے مرشد سے وہ تعلق رکھتے تھے جس تعلق کے تذکرے کتابوں میں ملتے ہیں، واقعاتی دنیا میں اس کی مثال کم ملے گی۔ حضرت مولانا بھی ان کا بڑا خیال فرماتے تھے، اور ان کی آمد پر مسرور ہوتے تھے، اور وہ آخر میں اپنی علالتوں کے باوجود ندوۃ العلماء سال میں جب موقع ہوتا تو ضرور تشریف لاتے اور بہت انشراح ومسرت کے ساتھ کچھ وقت گزارتے اور حضرت مولانا ان سے مانوس رہتے۔ حضرت مولانا کے وطن رائے بریلی بھی آتے اور یہ پسند کرتے کہ تکیہ میں کچھ وقت حضرت مولانا کے ساتھ یکسوئی سے گزاریں۔

انہیں حضرت مولانا کتابوں سے بھی عشق تھا اور جب حضرت مولانا طبیعت زیادہ ناساز ہوئی تو عیادت کے لئے انہوں نے لکھنؤ کا سفر کیا اور مزید یہ اہتمام کیا کہ روزنامہ سالار بنگلور میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے لکھنؤ کے احوال وکوائف پر ہفتہ واری کالم جاری کریں اور اس کی ذمہ داری لکھنؤ کے حضرت مولانا سے تعلق ومحبت رکھنے والے صحافی حسین امین

صاحب کو دی تا کہ جنوبی ہندوستان میں حضرت مولانا کے متعلقین ومحبین کو صحیح اطلاعات پہونچتی رہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ انہوں نے خود داعی اجل کو لبیک کہا۔

میر مقصود علی خاں صاحب اپنی دنیوی مصروفیات کے ساتھ دینی کتابوں کے مطالعہ کا اہتمام اوراوراد ومعمولات کی پابندی کرتے تھے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر قرآن کریم سے بڑے متأثر تھے خاص طور پر وہ اس میں افادات حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی افادیت کے بڑے قائل اور معترف تھے اور وہ اس بات کے خواہاں تھے کہ ان کو تفسیر ماجدی سے منتخب کر کے مستقل کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے کہ اس سے لوگوں کو بڑا نفع پہنچے گا اور ایک جگہ اتنا اہم مواد بہ آسانی فراہم ہو جائے گا۔

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے سالانہ جلسوں میں پابندی سے شرکت فرمایا کرتے تھے، ان کی رائے صائب اور پختہ تجربات کا نتیجہ ہوا کرتی تھی، حیدرآباد کی مجلسوں، امراء ورؤساء کی محفلوں، ربانی اور اہل دل بزرگوں کے حالات وواقعات جوان کے سامنے گزرے دلچسپی سے بیان کرتے تھے۔ صوبہ کرناٹک میں اردو کے فروغ میں انھوں نے اپنے اخبار روزنامہ ''سالار'' کے ذریعے اچھا کردار ادا کیا، اور اسی کے ذریعے دینی معلومات اور صالح اقدار لوگوں تک منتقل کرنے کا کام کیا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور مغفرت فرمائے۔

مولانا سید وصی مظہر ندویؒ

افسوس اسی ماہ جنوری کے آغاز پر مورخہ ۲/ جنوری (۲۰۰۶ء) کو ندوۃ العلماء کے لائق فرزند مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب نے بھی انتقال کیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا سید وصی مظہر ندوی ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے اسی گروپ کے اہم فرد تھے جو تقسیم ہند سے پہلے ندوۃ العلماء سے فارغ ہوا، جس کے شہرت یافتہ افراد میں مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ سابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ ومعتمدِ تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا قاضی معین اللہ ندویؒ سابق نائب ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا عبدالغفار ندویؒ سابق امیر جماعت اسلامی اتر پردیش، مولانا ابوالعرفان خاں ندویؒ سابق صدر کلیۃ الشریعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، ہمارے برادرِ معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ بانی مدیر مجلّہ ''رضوان'' لکھنؤ وناظم وبانی مدرسہ فلاح المسلمین تیندوا، رائے بریلی، پروفیسر عبدالحلیم ندویؒ سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، اور مولانا مجیب اللہ ندوی ناظم وبانی جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، اور دیگر کئی حضرات کے نام لیے جاسکتے ہیں کہ جن کو ملک گیر شہرت اور بعض کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، اور انھوں نے علم اور دین کی خدمت کے میدان کو اپنایا، اور مدارس اور دعوتی کام کے ذریعے اس فریضے کو انجام دیا جو ندوۃ العلماء کے مقصد کے مطابق تھا۔ ان میں مولانا مجیب اللہ ندوی ہی بقید حیات ہیں، اللہ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، ان کے علاوہ یہ سبھی لوگ وفات پاچکے ہیں۔ اللہ سبھی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور راضی ہو۔

مولانا سید وصی مظہر صاحب اصلاً لکھنؤ کے باشندے تھے، اور اس خاندان کے فرد

تھے جس کے نمایاں حضرات میں ان کے چچا قاری سید ودود الحی صاحب ندوی بھی گزرے ہیں۔ ان کے والد مولانا حبیب اصغر صاحب ندوی جو اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، وہ اور ان کے دونوں بھائی مولانا سید علی اصغر ندوی صاحب اور قاری سید ودود الحی صاحب ندوے کے ہی تعلیم یافتہ تھے۔ ان حضرات نے طب کی بھی تعلیم حاصل کی تھی، اور ان حضرات کا امین آباد لکھنؤ میں "صادق الأدویہ" کے نام سے مشہور یونانی دواخانہ بھی تھا، جو ابھی کچھ عرصہ پہلے تک قائم تھا، ان حضرات کے والد سید صادق علی صاحب تھے۔

مولانا سید وصی مظہر صاحب ۲۶/ اگست ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، وہ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، ان کے چچازاد بھائی حکیم سید انور حفیظ صاحب یونانی میڈیکل آفیسر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے، وہ لکھنؤ میں ہی مقیم ہیں۔

ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہونے والے اس گروپ کو جس کے ایک لائق فرد مولانا زسید وصی مظہر ندوی تھے، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کی تعلیمی اور تربیتی توجہ حاصل ہوئی، اس وقت کے اہم اساتذہ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے علاوہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ اور مفتی محمد سعید ندویؒ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کا طریقۂ تدریس، تربیتی اور علمی انداز کا اور ذہن کو دینی لحاظ سے وقت کی ضرورت کے مطابق تشکیل دینے کا تھا، چنانچہ وہ طلبہ جنھوں نے ان سے ذرا بھی توجہ کے ساتھ تعلیم حاصل کی انھوں نے اپنے اپنے عہد میں کسی نہ کسی ملّی تقاضے کے مطابق بہتر خدمت انجام دی، اور کسی نہ کسی اہم مقصد کے لیے کام کیا، یا علمی لحاظ سے کسی بلند سطح پر پہنچے۔ مولانا وصی مظہر ندوی تعلیمی مرحلے کی تکمیل کے بعد ایک سال ادارۂ تعلیمات اسلامی لکھنؤ سے بھی وابستہ رہے۔

مولانا سید وصی مظہر ندوی تقسیم ہند کے چند سال بعد پاکستان منتقل ہو گئے تھے،

اور حیدرآباد سندھ کو انھوں نے اپنا وطن بنایا تھا، وہاں انھوں نے تین میدانوں میں نمایاں کردار انجام دیا، ایک تو تعلیمی میدان میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ایک عصری درسگاہ ''شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج'' حیدرآباد سندھ میں قائم کی، جو ایک اسلامی کالج کی حیثیت سے کام کرتی تھی، جس کے وہ سربراہ تھے، اور اس طریقے سے علمی راہ میں خصوصی خدمت انجام دی۔ ان کی کئی اہم تصانیف اور ان کے مقالات کے مجموعے بھی ہیں، پاکستان میں ان کے فکر انگیز مضامین ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہوتے تھے، جو علمی اور تاریخی طور پر وقیع ہوتے تھے۔ اپنی نوعمری میں انھوں نے عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے "منتخبات من الأدب العربی" مرتب کی، جو سندھ (پاکستان) کے ہائی اسکولوں میں داخلِ نصاب ہوئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "حجة الله البالغة" سے متعلق بھی ایک کتاب لکھی جو ان کی علمی وسعت اور دقتِ نظر کا پتا دیتی ہے، یہ کتاب ''افادات شاہ ولی اللہؒ'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

دوسرا میدان ان کا دعوتی تھا، اس کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی دعوتی کوششوں میں شرکت کی، اور دعوتی کام کو اپنی صلاحیت کے مطابق انجام دیا۔ وہ جماعت اسلامی سے فکری ہم آہنگی رکھتے تھے، لیکن ان کا خصوصی انداز اور اپنا رجحان تھا، اور بعد میں جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی قائم نہ رہ سکی تھی۔ تیسرا میدان ان کا سماجی یا سیاسی تھا کہ ان کی شخصیت کو حیدرآباد سندھ میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ وہاں کی کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے، اور ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۳ء تک تقریباً پانچ سال کے عرصے تک میئر کا عہدہ ان کے پاس رہا۔ پھر مزید ترقی یہ ہوئی کہ وہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہو گئے، اور بعد میں ان کی صلاحیتوں کا اور اعتراف کیا گیا، اور ان کو یہ ترقی بھی ملی کہ جنرل ضیاء الحق کی حکومت میں ان کو امور مذہبی واقلیات کی وزارت سپرد کی گئی اور اس طرح وہ وزیر بھی رہے۔ لیکن انھوں نے سیاسی میدان میں زیادہ طالع آزمائی نہیں کی، بلکہ اپنے مثبت کاموں سے ہی زیادہ تعلق رکھا، اور عمر کے آخری دور میں پاکستان کے سیاسی اور

سماجی تغیرات سے بددل ہوکر انھوں نے کناڈا منتقلی اختیار کی، اور وہاں رہتے ہوئے جو خدمت علم ودین وہ کرسکتے تھے کرتے رہے۔

وہ گزشتہ آٹھ (۸) برسوں سے اپنے بڑے صاحبزادے کے ساتھ کناڈا میں مقیم تھے، جہاں وہ عربی زبان کی خدمت اور دعوت دین کے اعلیٰ مقاصد کے لیے اپنی توانائیاں صرف کررہے تھے۔ وہ اپنے محاضرات، خطابات اور مضامین کے ذریعے وہاں کے عام اور خاص دونوں طبقوں کو متاثر کرتے تھے، اس طرح انھوں نے اپنا ایک وسیع حلقہ بنالیا تھا۔ انھوں نے ٹورنٹو کو اپنے دعوتی کاموں کے لیے مرکز بنالیا تھا۔ کناڈا کے اسی قیام کے دوران ان کا لکھنؤ آنا ہوا اور ندوۃ العلماء میں طلباء کے سامنے ان کا خطاب ہوا، اس میں انھوں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ میں کناڈا میں ہوں، وہاں کی سماجی اور معاشرتی حالت یورپ اور امریکہ کے دیگر ملکوں کی طرح اسلام کے طور وطریق سے بہت مختلف بلکہ متضاد ہے، اور مسلمان نوخیز نسل کے لیے نقصان رساں ہے۔ مسلمانوں کے جن افراد نے اپنے مشرقی ملکوں میں تربیت وتعلیم کا زمانہ گزارا وہ تو بڑی حد تک محفوظ ہیں، اور ان میں کچھ اصلاح وتربیتِ دینی کا جذبہ بھی رکھتے ہیں، لیکن نئی نسل بے حد خطرے میں ہے، جو افراد اپنی نئی نسل کے دین وثقافت کو بچانے کا نظم نہیں کرسکتے ان کے لیے میرے نزدیک ایسے ملکوں میں رہنا ناجائز ہے۔ اس لیے جو بھی وہاں رہے وہ اپنا یہ فرض سمجھے کہ اپنی نئی نسل کے لیے ایسا انتظام ضرور کرنا ہے کہ وہاں کے حیاسوز اور مذہب بیزار طور وطریق سے بچ سکے۔

ان کی اس بات سے ہم لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کا اسلامی ذہن اور دعوت واصلاح کا جذبہ کس قدر صحیح اور حالات کے مطابق نہ صرف یہ کہ قائم ہے، بلکہ اس سے وہ برابر دوسروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان کا کناڈا جانا صرف اپنی سہولت اور آرام کے لیے نہیں بلکہ بگاڑ کے حالات کو سمجھنے اور اس کی اصلاح کے لیے مناسب تدبیر کی فکر کرنے کے ساتھ ہے۔ ندوۃ العلماء کے لیے یہ بات خوشی اور مسرت کی تھی کہ اس کے فرزندوں نے ندوۃ العلماء کی تعلیم وتربیت سے جو ذہن ومزاج اخذ کیا، وہ

الحمدللہ برسرِعمل اور کامیاب ہے۔ مولانا کا انتقال ٹورنٹو کے متصل شہر کچنر (کناڈا) میں ۲/جنوری ۲۰۰۶ء کو دوشنبہ کے دن ہوا، جہاں ان کی صاحبزادی رہتی ہیں، اور واٹرلو (WATERLOO) میں تدفین ہوئی۔ ان کی نماز جنازہ مولوی سید عبدالمنان ندوی حیدرآبادی (فرزند انجینئر سید غلام محمد صاحب مرحوم) نے پڑھائی، جو وہاں مقیم ہیں۔ تدفین وجنازے میں مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد نے شرکت کی جن میں ان کے حلقۂ اثر کی ایک تعداد ٹورنٹو سے بھی آئی تھی۔

مولانا کی وفات کے ایک ہی دن پہلے یکم/جنوری کو ان کے رفیقِ درس مولانا عبداللہ عباس ندوی نے وفات پائی تھی، جو ان کے ہم عمر بھی تھے، اور پھر رفیقِ درس بھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دونوں کو اپنی رحمتِ عظیمہ اور کرمِ عظیم سے نوازے۔

ہم ان دونوں کے انتقال کو ملت اسلامیہ کے فرزند ارجمند کا انتقال سمجھتے ہیں، اور اس سے جو خسارہ ہوا، اس کے بدل کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

ادھر کچھ عرصے میں ہندوستان کی متعدد بڑی شخصیتوں نے اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا۔ کوئی بھی بڑی شخصیت جب دنیا سے رخصت ہوتی ہے تو اپنے پیچھے ایک قابل ذکر ماضی چھوڑ جاتی ہے، یہ ماضی اس کی یاد دلاتا ہے اور نئی نسل کو رہنمائی دیتا ہے۔ قریبی دنوں میں ایسے جانے والوں میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا بھی نام نامی ہے، جنھوں نے دارالمصنفین میں تحقیق وتصنیف کا ایک اہم دور گزارا، اور دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی نعمانی اور ان کے شاگردوں نے تحقیق وتصنیف کی جو بنیادیں قائم کی تھیں ان پر کام کو جاری رکھا، اس طریقے سے یہ اہم تحقیقی وعلمی ادارہ اپنا علمی وتحقیقی سفر جاری رکھتا رہا۔

مولانا مرحوم مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر، اعظم گڑھ) کے تعلیم یافتہ تھے، اور فراغت کے بعد دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے، اور اپنے علمی وتحقیقی کاموں کی اہمیت کی بنا پر دارالمصنفین کی نظامت کا عہدہ خالی ہونے پر اس کے ناظم ہوئے، اور پھر انھوں نے تاحیات اس نظامت کی ذمہ داری کو پُر وقار طریقے سے جاری رکھا۔ اس ادارے کے ترجمان ''معارف'' کے مدیر رہے، اور اس کے اداریوں کے ذریعے سے اپنی تحقیقات نیز حالات حاضرہ سے اپنی واقفیت اور ان کا مؤثر جائزہ اپنے تبصرے کے ساتھ پیش کرتے رہے، جس سے ان کی علمی اور تحقیقی خصوصیت کے ساتھ قومی اور سماجی حالات وواقعات سے واقفیت بھی ظاہر ہوتی رہی۔

مولانا مرحوم نے متعدد علمی وتحقیقی کتابیں تصنیف کیں، اور وہ اپنی علمی خصوصیات کی بنا پر ملک کے معروف علماء ودانشوروں میں شمار کیے جانے لگے جو ملک کی علمی مجالس میں قدردانی کے ساتھ شریک کیے جاتے تھے۔ وہ اپنے اسی امتیاز کی بنا پر مدرسۃ الاصلاح کے

ناظم اور ملک کی متعدد علمی و تعلیمی مجالس کے رکن منتخب ہوئے۔ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن رہے، اور ندوے سے رابطہ ادب اسلامی (عالمی) اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) کے رکن رہے۔ کسی ادارے میں علمی وادبی موضوع پر کوئی سیمینار ہوتا تو اس میں شریک ہوتے، اردو اکیڈمی اور دیگر ایسی انجمنوں میں بھی ان کی شرکت ہوتی تھی۔

طبیعت کے لحاظ سے سنجیدہ، با اخلاق اور ہمدردانہ شخصیت کے مالک تھے، اور ان کے ذریعے علم دوستی اور تحقیق پسندی کا انداز سامعین اور شرکائے مجلس کو دیکھنے کو ملتا، اور مشورے اور مذاکرے میں اچھی مدد ملتی۔ ان کی انہی خصوصیات کی بنا پر ان کے انتقال کا صدمہ تمام علمی حلقوں میں بہت محسوس کیا گیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی کی بات تھی کہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر لوٹے، افسوس ہے کہ چند ہی دن گزرے تھے کہ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

مجھے شخصی طور پر بھی ان سے ملاقات اور مشترکہ مجالس میں ان کو سننے اور بات کرنے کا موقع ملتا تھا، اور ان کی گفتگو سے مسائل میں مناسب رائے قائم کرنے میں مدد ملتی تھی۔ وہ دارالمصنفین کے ناظم تھے، میں بھی اس کا ایک رکن تھا، اس طریقے سے اس کی مجلس منتظمہ میں شرکت ہوتی، اور ان کے کام سے واقفیت کا موقع ملتا، اور گفتگو رہتی۔

اسی طوح ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں وہ پابندی سے آتے، وہاں بھی اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی کمیٹی میں بھی ان کی شرکت ہوتی تھی، اور یوں بھی لکھنؤ جو کہ اتر پردیش کا صدر مقام ہے، اس کے کئی علمی وادبی اداروں میں شرکت کے لیے ان کا آنا ہوتا تھا، اور ان سے ملاقات کا موقع ملتا تھا۔

وہ معروف تعلیمی ادارہ مدرسۃ الاصلاح کے ناظم بھی تھے، وہاں کا نظام وکام ان کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا، ان کی وفات سے اس ہم ادارے کا بھی خسارہ ہوا۔ ان سے ملاقات اور ان کی شخصیت سے قریبی تعلق قائم ہو جانے کی بنا پر ان کے انتقال کی خبر سے ایسا محسوس ہوا کہ خاندان ہی کا کوئی اہم فرد ہم سے جدا ہوا۔ مجھے ان کے اسی تعلق کے احساس

نے اس بات پر آمادہ کیا کہ اس روز ایک اہم پروگرام کے انعقاد کے موقع پر اس میں شرکت ضروری ہونے کے باوجود میں نے اعظم گڑھ کا سفر کیا، اس طرح مجھ کو ان کے جنازے میں شرکت کا موقع ملا، وہاں اس موقع پر ان کے قدردانوں اور مداحوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی، ان کی وفات کے واقعے سے جو دراصل ایک سڑک حادثے کے نتیجے میں جنوری ۲۰۰۸ء میں ہوا تھا، سب ہی غمزدہ تھے، مجھے اس وقت اس بات کا بھی موقع ملا کہ میں ان حضرات کے سامنے ان کے بارے میں کچھ احساسات کا اظہار کروں۔ میں نے ان کے جدا ہونے سے جو خلا پیدا ہوا اس کی طرف اشارہ کیا، ان کا انتقال چونکہ حادثے کی صورت میں ہوا، اس وجہ سے وہ شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ ان کے لئے مزید سعادت وشرف کی بات تھی کہ وہ تازہ تازہ سفر حج بیت اللہ سے آئے تھے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے قلم سے متعدد اہم موضوعات پر تحقیقی کتابیں سامنے آئیں جن میں تذکرۃ المحدثین جو ایک سے زائد جلدوں پر مشتمل ہے خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے، اور اس سے ان کی علمی حلقوں میں زیادہ پہچان ہوئی اور یہ ان کی قدر ومنزلت کا بڑا سبب بنی، اس کے علاوہ ان کے مقالات ومضامین کا ایک سلسلہ ہے جس میں تحقیق وادب دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اور یہ ایک مشکل کام ہے، انہوں نے دارالمصنفین اور اس کے علمی ترجمان معارف دونوں میں اپنے نامور اسلاف کی جانشینی کا حق ادا کیا، اور اس معیار کو باقی رکھنے کی کوشش رکھی جو علامہ شبلیؒ اور ان کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندویؒ قائم کیا تھا، اللہ تعالیٰ ان پر رحمتوں کی بارش کرے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

مولانا ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب جن سے ملاقات کا مجھے کئی مرتبہ موقع حاصل ہوا اور غیر ملکی سفروں میں اور ابھی گزشتہ سفر حرمین شریفین کے موقع پر ان سے ملاقات ہوئی تھی اور جب ملاقات ہوتی تو مسرت ہوتی تھی، اور امت مسلمہ کے مسائل میں ان کی کوششوں کی قدر محسوس ہوتی تھی، وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن ان کے علم وفضل کی وجہ سے میں ان کی بڑی قدر کرتا تھا، افسوس ہے کہ وہ دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے، اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور اس طرح وہ ہم سب سے جدا ہو گئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، للّٰہ ما اعطی ولہ ما أخذ وکل شیئ عندہ إلی أجل مسمی۔

انھوں نے قلبی دورہ پڑنے کے نتیجے میں اسلام آباد (پاکستان) میں جہاں رہ کر وہ علمی ملی اور دینی خدمات انجام دے رہے تھے، اور حالیہ دنوں میں وہ سپریم کورٹ میں شرعی بنچ میں جج بنا دیے گئے تھے، اور کچھ مدت انھوں نے مذہبی امور کے وزیر کی حیثیت بھی گزاری تھی، ملت کو اپنے علم وصلاحیت سے فیض یاب کر کے اتوار ۱۶/شوال المکرّم ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۶/ستمبر ۲۰۱۰ء کو وفات پائی اور وہیں تدفین عمل میں آئی، ان کی عمر زیادہ نہیں ہوئی، ساٹھ سال کی عمر تھی، اس طرح وہ ان باکمال شخصیتوں کی فہرست میں شامل ہوئے جنھوں نے زیادہ عمر نہیں پائی لیکن عظیم کارنامے انجام دے گئے۔

ان کے خاندان کے متعدد افراد سے انس وتعلق کی وجہ سے ان سے پہلی ملاقات میں انس محسوس ہوا، اور ان کی لیاقت وصلاحیت کو دیکھ کر ان سے بڑی توقعات وابستہ ہوئیں، الجزائر کے ملتقی میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور تبادلۂ خیال کا موقع ملا تھا، پھر مدینہ منورہ میں انٹرنیشنل سیرت کانفرنس کے موقع پر دوسری ملاقات ہوئی، جس کا انعقاد سعودی عرب کے

وزیر داخلہ امیر نائف نے کرایا تھا اور ابھی ڈیڑھ ماہ قبل مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے منعقد کردہ بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی جو اس نے اپنے پچاس سال پورے ہونے پر کی تھی، اور یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی، انھوں نے ازراہ عنایت ملنے کے لیے وقت نکالا اور کمرے آئے، برادر عزیز محمد واضح سلمہٗ جن سے ان کی بڑی ملاقاتیں رہی تھیں دیر تک ملی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے، بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کا خاندانی تعلق کاندھلہ سے گہرا ہے اور وہیں ان کا ننہال ہے، اس طرح ان کو اپنے اس ننہالی خاندان کے گہرے دینی اثرات سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا، اور وہاں کی علم وفضل میں ممتاز شخصیتوں سے علمی استفادہ بھی کیا، اور محنت کر کے انھوں نے بڑا علمی مقام بنالیا، اور عالم اسلام میں شہرت حاصل کی، وہ ایک اچھے خطیب اور ممتاز نامور مصنف بھی تھے۔ ان کو خدمت دین کے ملک وبیرون ملک میں خوب مواقع ملے، اور ان مواقع کی انہوں نے خوب قدر کی، ابھی ان کو کچھ وقت قطر میں گزارنے کو ملا تھا اور سال دوسال کے اس عرصہ میں وہاں رہ کر علمی وفکری دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہونچایا تھا ان کو عربی، اردو، انگریزی اور بعض دوسری زبانوں پر بھی اچھی قدرت تھی اور دین وشریعت کا بڑا اچھا اور گہرا مطالعہ تھا قرآن وحدیث سیرت نبویؐ، وفقہ اور دوسرے موضوعات پر ان کے محاضرات کا بھی سلسلہ رہا تھا جن کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اسلام آباد اسلامک یونیورسٹی کے وہ چیرمین بھی رہے اور اس طرح اس کے متعلق اداروں دعوہ اکاڈمی، شریعہ اکاڈمی، ادارہ تحقیقات اسلامی وغیرہ کی سرپرستی بھی کی اور سابق صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کے دور میں کچھ عرصہ مذہبی امور کے وزیر بھی رہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور اپنے قرب خاص میں جگہ عطا کرے، اور ان کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفۃً بدلہ عطا فرمائے، ملت اسلامیہ کی خدمت کرنے والوں میں ان کے نہ رہنے سے جو کمی پیش آئی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت کی مدد فرمائے اور اس خلا کو پُر فرمائے۔

(۴) چند اساتذہ

(۱) مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ
(۲) ماسٹر عبدالسمیع صدیقیؒ
(۳) مولانا سید نورالحسنؒ
(۴) مولانا محمد عمران خان ندویؒ
(۵) مولانا اسحاق سندیلویؒ
(۶) مولانا محمد ناظم ندویؒ

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ کی شخصیت گوناگوں قسم کے اوصاف کی حامل رہی ہے وہ علمی وادبی میدان میں نمایاں شخصیت رکھنے کے ساتھ ساتھ اچھے استاد، اچھے مصنف اور اچھے ماہر تعلیم تھے، ان کو بیک وقت علوم دینیہ میں بھی نمایاں دستگاہ حاصل تھی اور علوم حاضرہ میں بھی ضروری واقفیت حاصل تھی، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیم گاہ سے جس نے علوم دینیہ اور علوم حاضرہ کو جمع کرنے کا ایک انقلابی تجربہ کرنے کی کوشش کی تھی پورا استفادہ کیا تھا۔ وہ ایک طرف قرآن وسنت کے علوم سے آگاہ تھے، دوسری طرف انھوں نے علم کلام اور تاریخ وادب میں بھی مقام پیدا کیا تھا، عصر جدید کی ضرورتوں کو سمجھنے کے لیے انگریزی زبان کی ضروری صلاحیت بھی حاصل کر لی تھی، چنانچہ وہ مراکز دینیہ کے علمی وتعلیمی ماحول میں ممتاز شخصیتوں میں شمار کئے گئے اور انھوں نے عصری تعلیم کے ماحول میں بھی قدر ومنزلت حاصل کی۔ ان کو ندوۃ العلماء میں تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد جامعہ ملیہ میں بھی فائدہ پہنچانے کا موقع ملا، پھر وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ایک طرف ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم رہ کر ندوۃ العلماء کے مقاصد وتعلیمی نظریات کو مفید طریقہ سے بروئے کار لانے میں اپنے مشوروں اور رہنمائیوں سے فائدہ پہنچایا دوسری طرف دارالمصنفین جیسے وقیع تحقیقی وتصنیفی ادارہ کی سرپرستی بھی کی، انھوں نے ان تمام جگہوں اور منصبوں میں اپنے قیمتی تعاون ورہنمائی کے ایسے آثار چھوڑے جن کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اہل علم وتعلیم کی اس منتخب ندوی جماعت کے فرد تھے جس نے ملت اسلامیہ کو فکری وعلمی لحاظ سے بہت فیض پہنچایا اور اپنی زیر تربیت نسل کو علم وعمل کی روشن راہ دکھائی، اس جماعت کے اہم حضرت میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ،

مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ ندوی، اور مولانا محمد عمران خاں ندویؒ جیسے اصحاب علم اور مربی حضرات تھے۔ ان سب حضرات کو کم وبیش طریقے سے اپنے عہد کے مایہ ناز عالم ومحقق حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے فکری اور علمی وعملی رہنمائی ملی تھی۔ سید صاحب کا طریقہ اپنے مستفیضین کے ساتھ صرف تدریسی طریقہ نہ تھا، بلکہ ان میں عملی لیاقت وگہری صلاحیت پیدا کرنے کا تھا۔ علمی پختگی، تحقیق کا ذوق اور اپنے عصر وماحول کے تقاضوں کے مطابق اپنے علم وقابلیت سے کام لینا اس جماعت کا طرۂ امتیاز تھا، چنانچہ اس مجموعے نے جو علمی وتدریسی کام کیا اس سے امت کو مفید نتائج فکر حاصل ہوئے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ اسی مجموعۂ علماء کے معروف فرد تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ کی شخصیت میں دو خوبیاں بڑی ممتاز تھیں: ایک تو ان کا خاکسارانہ اور متواضع انداز کہ اپنے طلباء میں ایسے گھل مل جاتے کہ ان کو نہ پہچاننے والا آدمی ان کو ان طلباء ہی میں کا ایک فرد سمجھتا، اور وہ طلباء سے اس طرح بات کرتے جیسا کہ دو برابر کے طالبانِ علم آپس میں کسی قابل غور مسئلہ پر مذاکرۂ علمی کررہے ہوں، نشست اور تخاطب دونوں میں ایسا ہی انداز ہوتا تھا۔

دوسری خوبی مولانا کی یہ تھی کہ طلباء کی خیرخواہی اور ان کی ترقی وکامیابی کی طرف ان کی توجہ رہتی اور طلباء کے مفادات کو وہ اپنے ذاتی مفادات کی طرح سمجھتے، طلباء بھی ان کی اس خیرخواہانہ طبیعت سے فائدہ اٹھاتے، اس طرح جن طلباء نے ان سے زیادہ قریبی ربط رکھا ان کو اپنی پسندیدہ راہوں پر چلنے اور ترقی کرنے میں بڑی مدد ملی۔

مولاناؒ کا علمی مزاج وطرز عمل ندوی خصوصیات کا حامل تھا، اور اس خصوصیت میں دراصل حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی وتربیت کا خاصا دخل تھا، وہ ان خوش قسمت طلباء میں تھے جن کو ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران حضرت سید صاحب کی سرپرستی ورہنمائی حاصل ہوئی۔

اس مذکورہ بالا خصوصیت اور طرز کے تین پہلو ہیں: ایک تو تحقیقی انداز۔ دوسرے

علمی مزاج اور تیسرے شستہ وسلیس زبان۔ اور یہ سب دینی روح اور اسلامی فکر کی پابندی کے ساتھ ہے، یہ خصوصیت ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تحریروں میں بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اور اب یہ صرف ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے والوں ہی میں نہیں، بلکہ ان غیر ندوی حضرات کی تحریروں میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے جو ندوی اہل علم کا لٹریچر پڑھتے رہے ہوں اور ان کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوں۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کا اسلوب تحریر علمی لیکن سلیس اور عام فہم تھا، اور انھوں نے اسی اسلوب میں متعدد وقیع کتابیں لکھی ہیں، لیکن چونکہ ان کی زندگی زیادہ تر ایک معلم کی زندگی رہی ہے، اس لیے ان کے تحریری افادات اور علمی رہنمائی ان کی تعلیمی مشغولیت کے ساتھ ساتھ رہی ہے۔

مولاناؒ ندوۃ العلماء سے فراغت تعلیم کے بعد ندوۃ العلماء میں استاد رہے، اور اسی کے ساتھ نگرانی طلباء کی ذمہ داری بھی سنبھالی، ان کی نگرانی طلباء، رہنمائی طلبہ کی صورت میں ظاہر ہوئی اور طلباء کو ان کے آراء ومشوروں سے فائدے حاصل ہوئے۔

مولاناؒ نے ندوے سے تدریسی تعلق کے بعد تدریس ہی کے سلسلے میں ایک نئے طریقۂ تعلیم کو جاری کرنے کی غرض سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی رفاقت میں عربی زبان کو سہل انداز میں اور فہم قرآن کے لیے ایک وسیلے کے طور پر پڑھانے کے لیے ادارہ قائم کیا جو لکھنؤ ہی کے محلہ امین آباد میں ''ادارہ تعلیمات اسلام'' کے نام سے قائم ہوا۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اور برسرکار حضرات کو ترجمۂ قرآن کا درس دیا جاتا تھا، اور نوخیز نسل جو جدید تعلیم کی ابتدائی منزل گزار چکی ہو اس کو عربی کی ایک سالہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس ایک سال کی مدت میں طالب علم براہِ راست قرآن مجید کے سادہ معانی کو سمجھنے لگتا۔ چنانچہ ایسے طلبہ کو یہ فائدہ بھی حاصل ہوجاتا تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ابتدائی مرحلے سے مستغنی ہوکر متوسط مرحلے میں حصولِ تعلیم کے قابل ہوجاتے تھے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہ کر مزید ترقی کرتے اور عربی علوم میں مطلوبہ صلاحیت حاصل کرلیتے تھے۔

ادارہ تعلیمات اسلام نے ایک مدت تک مذکورہ بالا دونوں لائنوں میں بڑا قابل قدر کام انجام دیا۔ وہاں ایک طرف تو سکریٹریٹ اور دفاتر حکومت کے متعدد مسلم عہدہ داران ترجمۂ قرآن سے استفادے کے لیے آنے لگے اور دوسری طرف اسکولی تعلیم کے بعد کے مرحلے کے لیے جدید تعلیم کے متعدد طالب علم ادارے کے راستے سے دارالعلوم پہنچے اور عربی زبان کی علمی راہیں طے کیں، ان میں پروفیسر مشیرالحق بحری آبادی سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی سری نگر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی، ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی علی گڑھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور نوخیز نسل کے لیے اور عام فہم صلاحیت رکھنے والے حضرات کے لیے متعدد اسلامی شخصیتوں پر خاصی تعداد میں کتابچے شائع کیے، اور ادارہ تعلیمات اسلام میں جاری طریقۂ تعلیم کے لیے عربی زبان کا نصاب بھی تیار کر کے شائع کیا۔

اس ادارے کے اصل روح رواں اور ذمہ دار مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ دونوں تھے۔ اول الذکر اپنی دیگر مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ادارے کو دیتے تھے، اور ثانی الذکر نے اپنے کو اسی سے وابستہ کر لیا تھا اور اپنا بیشتر عملی وقت ادارے کی سرپرستی اور معاونت میں صرف کرتے تھے۔ بعد میں حالات اور دیگر ذمہ داروں کے اثر سے دونوں حضرات کو ادارے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو گیا تو ادارہ ان کے خورد حضرات کے تحت کچھ عرصہ چلا، اور ان حضرات کے بھی لکھنؤ سے منتقل ہو جانے پر وہ قائم نہیں رہ سکا، لیکن عربی و قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلے میں اس نے ایک مختصر اور مفید راہ کی نشان دہی کر دی۔

ادارے کے تحت اس کے عملی دور میں وہاں کے طریقۂ تعلیم کے تحت کئی درسی کتابیں تیار ہوئیں، جن سے اس ادارے کے نقطۂ نظر کے ماتحت ایسی تعلیم کا پورا نصاب تیار ہو گیا جس سے تا حال مختلف جگہوں پر فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ اس میں خود مولانا عبدالسلام ندوی صاحب کی کتاب ''عربی زبان کے دس سبق'' بڑی مفید ثابت ہوئی۔

اس ادارے کو مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ نے چونکہ اپنے اوقات کا بڑا حصہ دیا

تھا، اس لیے ان کا ادارے سے تعلق سب سے زیادہ رہا، اور اس کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ بعد میں مولانا موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ناظم شعبۂ دینیات مقرر ہوجانے پر دہلی رہنے لگے، اور لکھنؤ سے ان کا انقطاع ہوگیا، لیکن یہ انقطاع صرف جسمانی تھا، ذہنی اور علمی ربط لکھنؤ کے احباب سے برابر قائم رہا۔ بعد میں ان کا وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ہونے کی وجہ سے ندوۃ العلماء میں وقتاً فوقتاً برابر آنا ہوتا رہتا تھا۔ وہ اس دوران علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہما اللہ کے قائم کردہ ادارہ دارالمصنفین کے شریک ناظم بھی منتخب ہوئے اور ان کو دارالمصنفین کے مسائل کو بھی دیکھنا پڑتا تھا۔

بہرحال مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ کی شخصیت ملت کی ایک قدآور شخصیت تھی، علمی و تعلیمی لحاظ سے انھوں نے اپنے بعد والی نسل کو خاصا فائدہ پہنچایا، اور آئندہ کے لیے بھی مفید علمی اثرات چھوڑ گئے۔ ان کی وفات پر مختلف لوگوں نے اپنے بلند تأثرات ظاہر کیے۔ اللہ تعالیٰ اپنے یہاں بھی ان کو مقام بلند عطا فرمائے۔

مولانا مرحوم اپنی نرم خوئی کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے، غصہ تو گویا ان کو آتا ہی نہیں تھا۔ نرم بات کرتے اور اسلوب خیر خواہانہ ہوتا، اور دل میں اللہ کے لیے اپنی بندگی کا احساس رہتا تھا، فرماتے کہ میں تو چھوٹی چیز ہو یا بڑی چیز ہو، اللہ سے مانگتا ہوں، کیوں کہ چھوٹی چیز بھی وہی دیتا ہے جیسا کہ وہ بڑی چیز دیتا ہے۔ یہ بات اس لیے کہی کہ عام طور پر رواج اللہ تعالیٰ سے صرف بڑی چیز مانگنے کا ہے، چھوٹی چیز کو آدمی اپنی بے توجہی کی وجہ سے ایسا سمجھتا ہے کہ اس کو اللہ سے مانگنا گویا اللہ تعالیٰ کی عظمت کے منافی ہے، حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس خیال میں یہ رنگ پوشیدہ ہوسکتا ہے کہ چھوٹی تو ہم خود حاصل کر لیتے ہیں، ان میں اللہ سے مانگنے کی ضرورت نہیں، حالانکہ ہر چیز خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو، اللہ کی اجازت اور حکم سے باہر ہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر کسی کو کچھ کرنے یا دینے کا اختیار ہی نہیں۔

مولاناؒ دین و تقویٰ کے حامل تھے، اور ان کی شخصیت دلنواز تھی، ان سے ملنے والا خوش ہوتا تھا، اور ان سے ان کے شاگردوں اور خوشہ چینوں نے بڑا فائدہ اٹھایا، وہ اپنی سادگی، بے

تکلفی اور خلوص کی وجہ سے جہاں رہے محترم ومحبوب رہے ان کی سرپرستی میں لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ ان کے افراد خاندان کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی تعلیم وتربیت پائی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل بن کر وہ لوگ ابھرے اور اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو نفع پہونچایا۔

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی ۷؍مارچ ۱۹۰۷ء کو تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے اس اعتبار سے انھوں نے ۷۲ سال سے زیادہ عمر پائی، ان کا انتقال ایک بڑا ملی سانحہ ہے اور ندوۃ العلماء کے لیے خاص طور پر ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، ان کا واقعہ انتقال اس طرح غم کو ہلکا کرتا ہے کہ ۳۰؍رمضان المبارک ۱۳۹۹ء کو جمعہ کے دن اذان کے وقت ان کی روح پرواز ہوئی اور عید کی دوگانہ ادا کرنے کے بعد ان کی نماز جنازہ تھلینڈی میں ان کے دوست اور ساتھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اہل تعلق کے بڑے مجمع کو پڑھائی اور باغ میں تدفین عمل میں آئی، ان کی وفات کا اثر مسلمانوں اور غیر مسلموں سب پر تھا یہ ان کے بلند اخلاق وکردار اور انسانیت نوازی وشرافت نفسی کی بات تھی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو خوب بلند فرمائے اور ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے، پسماندگان میں ان کی اہلیہ صاحبزادگان اور صاحبزادیاں ہیں، آمین۔

ماسٹر محمد سمیع صدیقیؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک پرانے اور مقتدر استاذ جناب ماسٹر محمد سمیع صدیقی صاحب نے ۱۹/اکتوبر ۱۹۸۲ء کو دس بجے شب میں اس دارفانی سے باقی کو رحلت کی۔ انّا للّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

ماسٹر صاحب ندوۃ العلماء میں ۵۶ سال قبل انگریزی زبان کے استاد کی حیثیت سے آئے اور اس وقت سے اب تک اپنی علمی و تعلیمی صلاحیت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو فائدہ پہنچاتے رہے، اس مدت میں دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی تین چار نسلوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، اور ان کو یہاں طلبہ اور اسٹاف میں بڑی قربت و مقبولیت حاصل رہی۔

ماسٹر صاحب کی یہ مقبولیت محض بڑی تعداد کے استاد ہونے کی وجہ سے ہی نہ تھی بلکہ اس میں ماسٹر صاحب مرحوم کا وہ اخلاق اور ان کی وہ شفقت ایک بڑا سبب تھی جو ان کی طرف سے اپنے اہل تعلق اور شاگردوں کے ساتھ رہتا تھا، وہ طلباء کو بڑی محبت اور دل سوزی سے پڑھاتے اور جب تک پڑھانے کا وقت اور موقع رہتا یکساں توجہ و جذبہ سے افادہ و تعلیم میں منہمک رہتے، وہ اپنے شاگردوں کو بھی متوجہ رہنے پر مجبور کرتے، نہ خود بے توجہی کرتے اور نہ شاگردوں کی بے توجہی برداشت کرتے، طلباء کے ساتھ ان کی مزید عنایات یہ رہتیں کی جو طلباء راستہ چلتے ان سے استفادہ کے طالب ہوتے یا ان کی قیام گاہ پر وقت ناوقت پہنچ جاتے، ان کے ساتھ بھی بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ان کی مطلوبہ غرض پوری فرماتے۔

ماسٹر صاحب کا تدریسی زمانہ نوعمری ہی سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں گزرا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کے متصل مغربی پہلو میں ان کو شروع سے ایک قطعہ زمین حاصل ہوگیا تھا جس میں ایک متوسط سطح کا مکان بھی ماسٹر صاحب نے تعمیر کرلیا تھا، اس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان کو رہائشی قرب بھی حاصل رہا، اس کی بنا پر ندوہ نہ صرف ان کی مشغولیت کا مرکز تھا

بلکہ محلّہ اور وطن بھی بن گیا تھا، اس قرب کا یہ اثر پڑا کہ دارلعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول سے ماسٹر صاحب کو والہانہ تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے دارالعلوم ندوۃ العلماء یاد آتا، اور اس طرح واپس آتے جیسے اپنے گھر آئیں، تقسیم ہند کے بعد ان کے اعزہ نے بہت چاہا کہ کہ وہ پاکستان منتقل ہوجائیں لیکن ماسٹر صاحب نے ندوہ کی مسجد اور اس کے ماحول کا بہانہ کیا، ندوہ سے ماسٹر صاحب کے اس والہانہ تعلق کا اثر ان کے صاحبزادگان پر بھی پڑا، وہ بھی ندوہ سے وطنی تعلق محسوس کرنے لگے، چنانچہ ماسٹر صاحب کے ایک صاحبزادہ ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی نے جو نیویارک میں پریکٹس کرتے ہیں، وہاں نیویارک میں اپنے خرید کردہ مکان کا نام ندوہ رکھا ہے اور وہاں کے محکمۂ ڈاک میں بھی یہ نام رجسٹرڈ کرادیا ہے۔

ندوے سے ماسٹر صاحب کا یہ تعلق ان کی دین داری اور دین سے جذباتی تعلق کی بنا پر تھا، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا عہد پایا تھا اور ان کے فیض صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا، سابق ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب حسنیؒ سے قریبی تعلق وربط رہا، انھوں نے اسلامی کتابوں کا اچھا مطالعہ کیا اور اس کا اثر ان کی علمی دلچسپیوں اور خیالات میں نمایاں تھا۔ نماز باجماعت کے بڑے پابند اور مشرقی واسلامی آداب پر ثابت قدم تھے۔

ماسٹر صاحب کا مضمون اگرچہ انگریزی تھا، اسی کو پڑھا اسی کو پڑھایا اور اس میں کمال پیدا کیا اور اس سے ان کی وابستگی ایسے زمانے میں شروع ہوئی تھی جس زمانے میں کمتر لوگ انگریزی فکر وثقافت سے متأثر ہونے سے بچتے تھے، لیکن ماسٹر صاحب کو دیکھ کر ان کے اسلامی خیالات کی پختگی جان کر یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ ماسٹر صاحب انگریزی کے آدمی ہیں۔

یوں انگریزی زبان میں ان کی مہارت تسلیم شدہ تھی، وہ انگریزی زبان وادب سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس میں مضمون نگاری اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب ندوہ سے تعلق کے دوران چند سال کے لیے لکھنؤ کے مسلم کالج ممتاز انٹر کالج کے پرنسپل بھی مقرر ہوئے، جس کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا، اس وقت سے ندوہ سے ان کا تدریسی تعلق رضا کارانہ ہوگیا تھا جس کو انھوں نے ممتاز انٹر کالج سے جو کہ بعد میں ڈگری کالج ہوا ریٹائرڈ ہونے کے بعد برابر جاری رہا اور اپنی عمر کے آخری دنوں تک ماسٹر صاحب نے اسے انجام دیا، اور ندوہ کے بیشمار

فرزندوں کے استاد بنے۔ایک طرف ان کے ابتدائی زمانہ تدریس کے شاگردوں میں ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا محب اللہ لاری ندوی اور ان کے ہم درس ساتھی ہیں تو دوسری طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ طلبہ میں سے درجہ ہفتم عربی تک کے طلبہ ہیں۔

ماسٹر صاحب نے اپنے صاحب زادہ ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی کی دعوت پر ۱۹۷۷ء میں امریکہ کا سفر کیا تھا، وہاں ایک سال تک قیام کے بعد یورپ اور مشرق وسطی ہوتے ہوئے ہندوستان مراجعت کی، وہ بہت مسرت کے ساتھ کہتے تھے کہ دنیا کے جن ملکوں میں میں گیا مجھے میرے شاگرد ملے اور بڑی خاطر واحترام سے پیش آئے۔

ماسٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز ہوئی لیکن مرض الوفات کے تین دن کے علاوہ زندگی کے آخری دن تک وہ کام کرتے اور پڑھاتے رہے، ماسٹر صاحب بڑھاپے کی کمزوری کے قائل نہ تھے آخر تک چست اور منہمک کار رہے، وہ اپنے جوان یا ادھیڑ عمر شاگردوں سے ملتے تو یہ ضرور کہتے کہ دیکھو میں ۸۰ سال کا ہو چکا ہوں، لیکن بالکل کمزور نہیں ہوں، کام میں سست نہیں ہوں، یہ کہہ کر جوانوں ہی میں نہیں بلکہ ادھیڑ عمر کے لوگوں میں زندگی اور عمل کی روح پھونکتے۔

ماسٹر صاحب کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کی بنا پر ان کی رحلت پر بیشمار آنکھیں اشکبار ہوئیں اور ان کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے میں ان کے شاگردوں اور محبین کا ایک عظیم مجمع تھا۔

ماسٹر صاحب انگریزی، فارسی، اردو تینوں میں ایم۔اے تھے، انھوں نے فن تعلیم بھی حاصل کیا تھا اور اس کی ڈگری بھی رکھتے تھے، اس مضمون پر ان کے مضامین بھی شائع ہوئے ہیں ،اور انگریزی میں انھوں نے تصنیفات بھی کی ہیں جو ان کے مضامین اور اشعار کے علاوہ ہیں۔

ماسٹر صاحب کا تحریری کام عموماً اسلامی موضوعات پر ہوتا تھا، اور ان کو اسلامی تاریخ اور اسلامی تعلیمات وافکار سے گہرا تعلق تھا انھیں ان میں دلچسپی لینے اور ان کو تقویت پہنچانے سے دلچسپی تھی۔

اسی کے ساتھ ساتھ طلباء کی علمی وثقافتی ترقی سے خصوصی دلچسپی تھی، چنانچہ طلبہ کی انجمن الاصلاح کے جلسوں اور علمی مقابلوں میں بحیثیت صدر یا حکم یا صرف عام شریک کے برابر شرکت کرتے اور طلباء کی علمی دلچسپیوں سے اپنی توجہ کا مظاہرہ کرتے تھے، طلباء بھی اپنے تمام علمی جلسوں میں اہتمام کے ساتھ ان کو مدعو کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے۔ ماسٹر صاحب بڑے اچھے انسان تھے، سب تعلق والوں کی مسرتوں سے مسرور اور تکلیفوں سے ملول ہوتے، اور سب اہل تعلق سے بڑے انس وتعلق کا معاملہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی رحلت سے ان کے محبین نے ایک ایسا خلاء محسوس کیا جس کو عرصہ تک یاد رکھا جائے گا۔

ماسٹر صاحب کے پسماندگان میں چار صاحبزادے ہیں۔ پروفیسر وصی احمد صدیقی شاہجہاں پور، (۱) ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر مطیع احمد صدیقی نیویارک ڈاکٹر رضی احمد صدیقی مقیم لیبیا، ان میں سے ڈاکٹر مطیع سرجن ہیں، باقی صاحبزدگان پی۔ ایچ۔ ڈی اور یونیورسٹیوں میں ریڈر و پروفیسر ہیں۔ ماسٹر صاحب کی اہلیہ ہیں جو پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اور ماسٹر نیاز احمد صدیقی (۲) کی ہمشیرہ ہیں۔

ہم بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہیں کہ ماسٹر صاحبؒ کو اپنے یہاں عفو ومغفرت اور رفع درجات کے انعامات سے بیش از بیش نوازے اور ان کے محبین کو ان کے اچھے کاموں کی تقلید کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔

---

(۱) پروفیسر وصی احمد صدیقی شاہجہان پور میں ایک کالج میں پرنسپل تھے، وہاں سے ریٹائرڈ ہو کر اپنے والد کے مکان واقع احاطہ دار العلوم ندوۃ العلماء آ گئے، اور ندوۃ سے انتظامی طور پر بھی وابستہ ہو گئے اور پھر معتمد مال ہوئے اور نائب ناظم بھی منتخب ہوئے وہ اس کتاب کے مقدمہ نگار ہیں اور اب اپنے رب کے جوار رحمت میں ہیں (م)

(۲) پروفیسر رشید احمد صدیقی کو اردو ادب کے ذریعہ بڑی شہرت ملی اور اس کے ممتاز صاحب اسلوب ادیب شمار کئے گئے ماسٹر نیاز احمد صدیقی دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک عرصہ انگریزی کے استاذ رہے، رحمہم اللہ تعالی۔ (م)

مولانا سید نورالحسنؒ

مولانا سید نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک نرم خو، ملنسار اور انضباط ونظم کا مزاج رکھنے والی شخصیت تھی، وہ عرصے تک حیدرآباد میں رہے تھے، اس طرح ان میں حیدرآباد کی تہذیبی قدروں کا اثر محسوس کیا جاسکتا تھا، جس میں لکھنوی تہذیب کی آمیزش تھی۔ انھوں نے مذہبی تعلیم حاصل کرکے علمائے دین اور مدرسین علوم دینیہ کی صف میں اپنا مقام بنایا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ دینی تعلیم کی تکمیل دارالعلوم دیوبند میں کی تھی، اور تدریس کا مشغلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اختیار کیا تھا، اس طرح وہ دونوں اداروں کے انداز وخصوصیات سے واقف اوران کے جامع تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں وہ جس زمانے میں دورۂ حدیث میں تھے، ندوۃ العلماء سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ناظم ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث شریف میں استفادے کے لیے گئے تھے۔ وہاں ان کے استفادے کے دوران مولانا سید نورالحسن رحمۃ اللہ علیہ سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ استفادے میں بھی ساتھ ہوا۔ پھر یہ ربط وتعلق برابر قائم رہا اور مولانا نورالحسن صاحبؒ کے ندوہ میں فرائض تعلیم کے دوران مضبوط ہوا۔ جس کا اظہار دونوں حضرات نے اپنے شاگردوں سے مختلف موقعوں پر کیا۔

مولانا نورالحسن صاحب کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کی ہے، وہاں سے آنے کے بعد انھوں نے مطلع العلوم بنارس سے استفادہ کیا اور دورۂ حدیث دیوبند میں کیا۔ ۸/ جون ۱۹۰۶ء کو حیدرآباد میں وہ پیدا ہوئے اور یکم اگست ۱۹۸۴ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا، اس طرح انھوں نے ۷۶ سال اور قمری اعتبار سے ۷۸ سال کی عمر پائی۔

مولانا نورالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میرا تعلق ان کے درس میں زانوئے

ادب تہہ کرنے سے ہوا، اس کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجۂ دوم عربی میں میری طالب علمی سے ہوا، پھر بعض دوسرے درجات میں بھی یہ تعلق قائم رہا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شہر کے ایک تعلیم قرآن کے ادارے کے ذمے دار کی حیثیت سے وہاں منتقل ہوگئے اور وہاں کئی سال رہے، اس کے علاوہ مدھیہ پردیش کے ایک تعلیمی ادارے میں بھی کچھ مدت رہے، پھر دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لے آئے۔ میں اس دوران طالب علمی کے دور سے نکل کر مدرسی کے دور میں داخل ہو چکا تھا اور تعلیمی اسٹاف میں شامل ہوکر مدرسین کے زمرے میں آ گیا تھا، لیکن مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہرحال میرے استاد تھے، استاد ہونے کے ساتھ ساتھ میرے خال معظم مولانا علی میاں صاحب کے ہم درس ہونے کی بنا پر میرے چچا کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ مجھے اس کا خیال برابر رہا اور خوشی کی بات ہے کہ مولاناؒ نے میرے اس پاس ولحاظ کی بڑی قدر فرمائی، یہ بھی ان کی بڑائی تھی اور شفقت تھی۔

مولاناؒ کے اس احساس قدر میں شاید اس بات کا بھی دخل رہا ہوگا کہ بعض دیگر مدارس میں ان کے دورانِ تدریس کسی ایک مدرس سے جو سابق میں ان کے شاگرد رہے تھے ایک موقع پر مولانا کے ساتھ بحیثیت مدرس ہمسری کا رویہ اپنایا تھا، جو بے ضرورت تھا اور محسوس ہونے کا تھا۔ مولانا علیہ الرحمہ کو اس کا احساس تھا، جس کی وجہ سے ایسا نہ کرنے والے کی قدر فرماتے تھے۔

مولانا بہت ہی شریف النفس انسان تھے، اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی ایسی محبت اور لحاظ سے ملتے اور برتاؤ رکھتے کہ شاگرد بعض اوقات مجوب ہوتا۔ ایک ہی ادارے میں روزانہ ملنے اور ساتھ رہنے سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے محبت اور ان کی عظمت میرے دل میں بڑھتی رہی، میں ان کی قیام گاہ پر بھی بار بار حاضر ہوا، وہ برابر شفقت فرماتے تھے۔

مولاناؒ کو طلبہ کی تربیت کا بھی اچھا تجربہ تھا، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دارالاقامہ کے کچھ عرصہ نگراں بھی رہے اور ان کی نگرانی سے طلباء کو نفع پہنچا، مولاناؒ اپنی خوش

اخلاقی اور حکمت سے معاملات کو اچھی طرح انجام دیتے جو عموماً اچھے اثرات کا حامل ہوتا تھا۔ مولانا کے تعلق ندوۃ العلماء کا بیشتر زمانہ آزادیِ ہند سے پہلے کا رہا، آزادی کے وقت پاکستان کے بننے سے مسلمانوں کے ذہین و پڑھے لکھے طبقے کے بکثرت افراد نے پاکستان کا رخ کیا، خاص طور پر وہ لوگ جو مسلم لیگ کے نظریے سے زیادہ وابستہ تھے۔ مولاناؒ کا تعلق دیوبند اور علمائے ہند کے طبقے سے ہونے کی بنا پر مولانا نے اپنے طبقۂ علماء کے ہی طریقے کو اختیار کیا اور ہندوستان میں قیام رکھا، یہ دور مسلمانوں کے لیے ایک آزمائشی دور تھا، جس میں ثبات قدمی مشکل نظر آتی تھی۔ لیکن اصحابِ ہمت نے ہمت کا ثبوت دیا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی انھیں اصحابِ ہمت میں تھے، انھوں نے خود بھی ہندوستان کو وطن بنائے رکھا اور حالات کی تبدیلی کی تلخیوں اور طعنوں کو برداشت کیا اور اپنے صاحبزادگان کو بھی ایسے حالات کا عادی بنایا، چنانچہ انھوں نے بھی اپنی راہیں خود متعین کیں، ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے اور بڑے ہو کر اسی ملک میں اپنی جگہ بنائی اور مطمئن رہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم بھی ہوا کہ اس کے نتیجے میں ان کو قابل اطمینان زندگی حاصل ہوئی اور وہ اپنے اپنے ذوق و دلچسپی کے کاموں میں لگے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سید گھرانے کے فرد تھے، ایسے گھرانے کی کچھ خوبیاں ہوتی ہیں، وہ ان میں بخوبی محسوس کی جاسکتی تھیں، ان کے ایک رفیقِ کار مولانا سید عبدالغفار نگرامیؒ سے بھی ان کا اچھا ربط و تعلق رہا۔ پھر اس ربط نے ایک رشتے کی راہ ہموار کردی، جس سے دونوں کے اہل و عیال میں قربت ہوگئی، دین اور علمِ دین کی خدمت کے مقصد میں دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کے رفیق و ہمنوا تھے، اس رشتے نے دونوں کے مابین قربت اور بڑھادی۔

مولانا سید نورالحسن صاحبؒ کے دو صاحبزادگان میں ایک امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ کے لکچرر منتخب ہوئے، وہ مولوی سید ضیاء الحسن ہیں جو اس وقت وہاں تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے باہر خلیج میں ایک طویل مدت تک

رہنے کے بعد وہاں سے فارغ ہوکر دہلی آئے اور وہیں ہمدرد فاؤنڈیشن میں ایک جگہ حاصل کرلی، وہ اس کے ذریعے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مولانا کی ایک صاحبزادی عبدالقیوم فاروقی سے منسوب ہیں، جب کہ دوسری صاحبزادی مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندویؒ کے بیٹے مولوی غیاث الدین ندوی کی اہلیہ ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی عمر کے آخری حصے میں بعض شکایات ایسی ہوگئیں تھیں جن کے علاج کے لیے آپریشن کروانا پڑا، بڑی عمر کی کمزوری اس کو جھیل نہ سکی اور اسی میں ''کوما'' ہوا اور بالآخر اس جہانِ فانی سے جہانِ باقی کو رحلت فرمائی۔ رحمہ اللّٰہ رحمۃً واسعۃً وأسکنہ فسیح جناتہ وللہ ماأعطی ولہ ما أخذ، وکل شیئ عندہ لأجل مسمی۔ مولاناؒ نے ایک شائستہ اور خیر وصلاح کی زندگی گزاری اور اپنے بعد والوں کے لیے اچھی مثال چھوڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو نعمتِ اجر سے نوازے۔ (آمین)

مولانا محمد عمران خان ندویؒ

ندوۃ العلماء کے نامور فرزند وسابق مہتمم، مجلس انتظامی ومجلس نظامت کے رکن اور ہندوستان کے مشہور عالم وداعی مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ نے ۱۸/اکتوبر ۱۹۸۶ء کو طویل علالت کے بعد وفات پائی اور اس طرح علمائے دین کی صف میں اور داعیوں کی جماعت میں وہ اہم جگہ خالی ہوگئی جو مولانا موصوف نے پر کر رکھی تھی اور جس کے مفید تر نتائج سے ملت اسلامیہ ہند اور خاص طور پر بھوپال کے مسلمان اپنے دینی، علمی اور دعوتی میدان میں فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کل نفس ذائقة الموت۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے موقع کے لیے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کہنے کو کہا ہے جس میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ آدمی کی جان اس کی ملک نہیں تھی بلکہ اس کے پروردگار کی ملک تھی جو مستعار دی گئی تھی اس نے جب چاہا واپس لے لیا اور اگر آدمی کو مانوس چیز کے جدا ہونے کا رنج ہے تو اس کی تسکین کے لیے یہ امر سامنے رہے کہ ہر ایک کو وہیں واپس جانا ہے۔

مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ صرف ایک فرد ملت ہی نہ تھے بلکہ اپنے کارناموں اور محنت وعمل سے بھرپور زندگی کے باعث اپنے عہد کے مایہ ناز فرزند اور ایک مؤثر شخصیت تھے، انھوں نے اپنے ماحول اور اپنے میدان عمل میں جو بڑا اثر ڈالا، ان کا میدان عمل تین شعبوں میں تقسیم تھا، ایک تعلیمی نظم ونسق وانتظام، دوسرے دعوت وتبلیغ کی رہنمائی وسرپرستی، تیسرے ایک عظیم مسجد کی تعمیر وتکمیل۔ تینوں شعبہائے عمل میں انھوں نے عظیم خدمات انجام دیں۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، وہ ندوۃ العلماء کی ایک مؤثر شخصیت تھے، تعلیم سے فراغت ہوتے ہی ان کو اپنے اسی مادر علمی کے اہتمام کے سنبھالنے کی

ذمہ داری ملی، جس کو انھوں نے ملک کے ناسازگار حالات میں ایک عرصہ تک انجام دیا۔ اور اسی دوران دعوت وتبلیغ کے کام سے دلچسپی لینا شروع کی اور خاص طور پر اپنے شہر بھوپال میں اس کو جمایا اور ترقی دی۔ پھر بھوپال کی ضرورت کے خاطر لکھنؤ سے بھوپال منتقل ہوگئے وہاں دعوت وتبلیغ کے کام کے ساتھ اپنی تعلیم گاہ کی خدمت کو بھی جاری رکھا۔ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلق سے دارالعلوم بھوپال قائم کیا، جس کے لیے مناسب جگہ تاریخی مسجد تاج المساجد کا انتخاب کیا اور یہ تعلیمی ادارہ دارلعلوم تاج المساجد کے نام سے مشہور ہوا۔ تاج المساجد باوجود تاریخی اور عظیم مسجد ہونے کے نامکمل اور متروک حالت میں تھی، انھوں نے اس کی تعمیر او رتکمیل کا بیڑا اٹھالیا، یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی اور ایک فرد کی طاقت سے بہت زیادہ تھی، چنانچہ اس کے لیے ان کو اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لانا پڑا اور انھوں نے بہت جلد اس کے لائق جدوجہد کا طریقہ کار اور معاونین تیار کر لیے، اور چند برسوں میں وہ کام انجا م دیا جو سابق عہد میں باہمت مسلم حکمران انجام دیا کرتے تھے۔ تاج المساجد جیسی عظیم مسجد جو اپنی شان اور وسعت کے لحاظ سے جامع مسجد دہلی کے طرح ہے، نہ صرف تعمیری لحاظ سے مکمل ہوئی بلکہ وہ آباد ہوئی اور اسی کے ساتھ ساتھ تعلیم دین اور دعوت وتبلیغ کا مرکز بھی بن گئی۔

مولانا حافظ محمد عمران خاں ؒ نے اپنی تعلیم ابتدا سے تکمیل تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد دو سال جامع ازہر میں دعوت وارشاد میں تخصص کیا اور واپس آکر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھالی جو تقریباً ۴۰-۳۹ کا عہد تھا، جنگ عظیم شروع ہوگئی تھی۔ مولانا مرحوم نے اپنے زمانۂ اہتمام میں نہ صرف تنظیمی کام کو انجام دیا بلکہ تدریس ودعوت کے کام میں بھی حصہ لیا، وہ زبان اور علوم قرآنی کا ایک ایک درس بھی دیتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ دعوت وارشاد کے عمل کو بھی انجام دیتے تھے وہ اپنے زمانے کے مؤثر اور وسیع دعوتی وتبلیغی کام کو جس کو مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے شروع کیا اور پھیلایا تھا، اپنایا۔ پھر اس کام کو بھوپال میں اتنا وسیع کیا اور ترقی

دی کہ تاج المساجد میں اس کا منعقد ہونے والا سالانہ اجتماع ایک مشہور اور غیر معمولی اجتماع بن گیا، جس میں عالمی پیمانہ پر لوگوں کی شرکت ہوتی ہے اور جو اپنے پورے علاقہ کے لیے مرکز اصلاح وتربیت بن گیا، مولانا حافظ محمد عمران خان صاحب ندویؒ نے بھوپال کی مشہور بزرگ شخصیت حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی سے جو ''پیر ننھے میاں'' کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے بیعت وارشاد کا تعلق بھی قائم کیا اور ان کا اعتماد حاصل کیا اور بیعت وتربیت کی اجازت حاصل کی۔

مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ کا ندوۃ العلماء سے گہرا اور قریبی تعلق اور لگاؤ رہا، وہ جب تک لکھنؤ رہے ندوے کو اپنی براہِ راست خدمت سے فائدہ پہنچاتے رہے، بھوپال جانے کے بعد ندوۃ العلماء مشاورتی جلسوں اور اوپر کی سطح کے مشوروں میں برابر شریک رہے، اور باعث تقویت بنتے رہے۔

مولانا محمد عمران خاں ایک بلند پایہ مقرر بھی تھے، البتہ ان کی تقریروں کا اصل میدان تبلیغی جدوجہد تھی، بھوپال کی جماعت تبلیغ کے وہ روح رواں اور دارالعلوم تاج المساجد کے وہ امیر تھے، ملت اسلامیہ ہند کے متعدد کاموں میں وہ برابر کے شریک رہے، مسلمانوں کی متعدد ملی مجالس کے رکن تھے، دارالمصنفین سے ان کا گہرا اور قریبی تعلق تھا۔

مولاناؒ کو اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ سے خصوصی تعلق تھا اور دونوں کا اصلاحی وتربیتی تعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے، اور اسی کے ساتھ یہ دونوں علامہ شبلی نعمانیؒ کے خاص شاگردوں میں سے بھی تھے، اسی طرح مولانا حافظ محمد عمران خاں ندویؒ نے ان دونوں کے واسطے سے وقت کی دو عظیم شخصیتوں کے اثرات بھی لیے تھے، جو ان فکر وعمل کے دائرے میں دیکھے جاسکتے ہیں، اور ان دونوں کا مولانا کو اعتماد حاصل تھا، جہاں تک مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تعلق ہے تو ان کے بھوپال میں قاضی القضاۃ ہوکر تشریف لانے سے یہ تعلق اور بڑھا، اور سید صاحبؒ کی سرپرستی مولانا نے حاصل کی، اور ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا، سید صاحب کا حق سمجھتے ہوئے مولانا نے ابھی قریبی عرصے میں ایک اہم سمینار کا انعقاد

کرایا، جس میں ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں نے شرکت کی۔

مولانا محمد عمران خان ندویؒ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، انھوں نے اپنے بھائیوں اور صاحبزادگان کی تعلیم وتربیت جس توجہ اور فکر سے کی اس کے بہتر نتائج دیکھے جارہے ہیں، ان کے بڑے بیٹے مولوی حبیب ریحان خان ندوی نے ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پھر لیبیا میں تدریسی شغل رکھا، اور وہ وہاں اسلامیات کے استاد رہے، اور وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ مولانا کے دوسرے صاحبزادگان مولوی صفوان صاحب ندوی مدینہ منورہ میں مقیم ہیں اور تدریسی شغل رکھتے ہیں، اور مولوی رضوان صاحب، مولوی ڈاکٹر حسان صاحب بھوپال یونی ورسٹی سے تعلق رکھتے ہیں، اور مولانا کے ایک فاضل بھتیجے جوان کے داماد بھی ہیں، ڈاکٹر مسعود عرفان خان ندوی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔

مولانا محمد عمران خاں ندویؒ کے سبھی بھائیوں نے ندوے میں تعلیم حاصل کی اور مولانا اور ان کے بھائیوں نے اس کا بھی التزام رکھا کہ ان کی اولادیں ندوے میں ہی تعلیم حاصل کریں۔ مولانا کے یہ سب بھائی مولانا محمد نعمان خان ندوی، مولانا سلمان خان ندوی، مولانا عرفان خان ندوی، مولانا لقمان خان ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے اور ان سب نے اس کا بھی التزام رکھا کہ ان کی اولادیں بھی ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کریں۔

مولانا کا سانحۂ وفات ایک اہم ملّی خسارہ ہے اور ہم لوگوں کے لیے ذاتی نقصان کا باعث بھی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات ومساعی کو قبول فرمائے اور درجات عالیہ سے نوازے، آمین۔

مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ

برصغیر ہند و پاک کے معروف ومشہور عالم دین، مصنف استاذ اور داعی دین وصلاح مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی صدیقی نے گزشتہ دنوں پاکستان میں رحلت کی "إنا لله وإنا اليه راجعون"۔

ان کی وفات کی خبر ندوہ میں عرب ممالک کے ایک ذریعہ سے تاخیر سے پہنچی، جس نے تمام اہل تعلق وقدردانوں کو ملول ورنجیدہ بنایا، یہ سانحہ علم ودین کا خسارہ ہے اس خبر سے ہم سب کے دلوں میں ان دونوں کی یادیں گھوم گئیں جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ ندوہ میں تھے اور درس وافادہ سے مستفید کررہے تھے مولاناؒ نے دارلعلوم ندوۃ العلماء میں دو دہائیوں سے زیادہ تعلیم وتدریس میں وقت گزارا ہے اس طرح سینکڑوں طلبہ نے ان سے فائدہ اٹھایا، مولانا مرحوم لکھنؤ سے ۵۴ کلومیٹر مغرب میں واقع شہر سندیلہ کے رہنے والے تھے یہ قصبہ متعدد دانشوروں، اہل علم واہل قلم کا وطن ہونے کی وجہ سے معروف ہے، اہل علم کے درمیان اور عام لوگوں میں اس کی شہرت لڈوؤں کی وجہ سے رہی ہے جواب کم ہوگیا ہے ،مولانا مرحوم کے والد ماجد سندیلہ کے ایک معزز صدیقی خاندان کے فرد تھے اور پولیس کے ایک بڑے عہدے پر فائز رہے تھے، دینی جذبہ رکھتے تھے، اپنے بڑے صاحبزادہ کو دینی تعلیم کی طرف لگایا، مولانا مرحوم نے کچھ مدت مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں اور ندوہ میں پھر پرائیوٹ طریقہ سے تعلیم حاصل کی، ندوہ میں ایک مدت تک استاذ رہے وہیں مولانا مرحوم سے مجھ کو بھی شرف تلمذ حاصل ہوا، مولانا مرحوم سے میری باقاعدہ ملاقات اور شرف تلمذ کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک درجہ میں قرآن مجید کے درس میں ہوا، میں درجہ میں مولانا کے درس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں ایسا کرتا پہنے تھا جس کی آستینیں ہاف

تھیں یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگ عظیم کے بعد گرانی اور اشیاء کی قلت کی وجہ سے کپڑا بھی کنٹرول سے ملتا تھا، آدمی کے پاس جو بھی کپڑا ہوتا اس کی حفاظت کرتا تھا خواہ وہ کچھ ناقص ہی ہو بہر حال مولانا نے سبق کے بعد مجھے ٹوکا کہ تم کیسے ایسا کرتا پہنے ہو یہ تمہارے لیے مناسب نہیں، مجھے اس نصیحت سے فائدہ ہوا اور پھر اس کے بعد ہاف آستین کا کرتا استعمال نہیں کیا اس واقعہ سے میرے دل میں مولانا کی عزت بڑھی اور میں ان کو قریب سے پہچاننے لگا چند برسوں کے بعد تعلیم سے فراغت کر کے ندوہ میں مدرسی کی سعادت حاصل ہوئی تو ضابطہ میں اگر چہ میں اس دائرہ میں داخل ہوا تھا جو ان کا دائرہ عمل تھا لیکن مولانا میرے استاذ تھے اور میں ان کے اس منصب و مقام کو سمجھتا اور لحاظ کرتا رہا اور مولانا کی شفقت بھی اسی طرح قائم رہی، میں برابر ان سے مانوس رہا اور وہ بھی اپنے دینی و علمی افادات سے وقتاً فوقتاً نوازتے تھے، وہ ایک طرف عالم دین تھے اور دوسری طرف دین کے جوشیلے حامی و مدافع تھے انھوں نے دینی جذبہ سے بھوپال میں رہ کر وہاں کے فوجی اسکول سے فوجی ٹریننگ لی تھی اور اس کے لیے وقت صرف کیا تھا، چنانچہ وہ اسکول میں رائج طریقہ سے جسمانی ٹریننگ لینے پر زور دیتے اور کبھی کبھی اس کی نگرانی بھی کرتے، وہ دین کی خاطر جان تک کی قربانی دینے کے جذبہ کا اظہار بھی کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کا اصل موضوع اصلاً دینی مضامین کا تھا، لیکن اس کے ساتھ انگریزی جاننے کی وجہ سے جدید فلسفہ اور نفسیات کا بھی مطالعہ کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے ''اسلامی سیاست وحکومت'' پر ایک کتاب بھی تیار کی تھی جس میں علامہ سید سلیمان ندوی کی رہنمائی اور مولانا ابوالاعلی مودودی کے مشورے بھی شامل تھے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم نے ایک کتاب قرآن مجید کے مضامین میں آئی ہوئی نفسیاتی جھلکیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی تھی، مولانا مرحوم نے شفقت کی بنا پر مجھ کو اس کا مسودہ برائے مطالعہ عنایت فرمایا تھا، مجھے وہ کتاب بہت اچھی اور قیمتی معلوم ہوئی لیکن میں نے پھر وہ کتاب نہیں دیکھی، غالباً وہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قادیانیت پر بھی ایک مختصر کتاب تصنیف کی تھی جو ان کے ندوۃ العلماء میں رہنے کے دوران ان کے بعض شاگردوں نے طبع کرائی تھی۔

مولانا تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ برابر قائم رکھتے تھے اور اس میں ان کا طرز تحقیقی تھا۔ اپنی تحقیق سے وہ بعض ایسے گوشے ابھارتے تھے جو عموماً نظروں سے مخفی رہ گئے ہوتے یا جدید تحقیقات کے رو سے صحیح اور ضروری معلومات میں وہ قیمتی اضافہ کا باعث ہوتے اس بحث وغور وفکر میں ان کا ذہن اس بات کی طرف ذرا غلو کے ساتھ چلا گیا کہ تاریخ اسلام میں متعدد ایسے حوادث پیش آئے جن میں بعض شیعہ افراد کی طرف سے امت مسلمہ کی بدخواہی نمایاں تھی اور اس بدخواہی کے سبب سے بعض سنگین واقعات پیش آئے مولانا کا یہ احساس بتدریج بڑھا اور اس کو انھوں نے ذرا زیادہ وسعت کے ساتھ استعمال کیا۔

اس سلسلے میں مولانا مرحوم کی حس اتنی بڑھ گئی کہ وہ تاریخ کے متعدد واقعات کی بنیاد پر بعض ایسی شخصیتوں پر بھی شیعی ذہن کا اثر دکھانے کی کوشش کرتے جن کے بارے میں اکثر کا اتفاق ہے کہ وہ شیعی ذہن کے نہیں ہیں۔ مولانا مرحوم کا یہ غلو ان کی دینی حمیت کی بنا پر تھا اور یہ خصوصاً ان کے پاکستان منتقل ہونے کے بعد زیادہ بڑھا تھا، اندازہ یہ ہے کہ پاکستان کے اس وقت کے حالات نے اس میں مہمیز کا کام کیا تھا اور اس ذہن میں غلو پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے ان کی خوبیوں اور کمالات سے بھی فائدہ نہ اٹھایا جا سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

مولانا مرحوم ۱۹۷۱ء میں پاکستان منتقل ہوئے ان کے منتقل ہونے سے قبل ان کے سب اعزہ منتقل ہو چکے تھے، پھر ان کے دینی رجحانات اور امت مسلمہ کی خدمت کے جذبہ نے ان کے اندر مسلم ملک میں منتقل ہونے کا تقاضا پیدا کیا، لیکن وہاں رہنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ وہ جس توقع سے وہاں گئے تھے وہ پوری نہیں ہوئی، درمیان درمیان میں وہ ہندوستان آتے اور اپنے رفقاء وشاگردوں سے ملتے اور اس طرح پرانی یادیں تازہ ہو جاتی تھیں۔ مولانا مرحوم خوش اخلاق اور بے تکلف مزاج کے تھے اس لیے ان کے تعلقات بھی وسیع تھے۔

ندوۃ العلماء میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دینیات کے مضامین کے ساتھ علوم اجتماعیہ کے بھی بعض مضامین تھے مثلاً معاشیات کا مضمون اور سیاسیات کے اسباق کے مضامین، ترجمہ وتفسیر قرآن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اس کے علاوہ حدیث شریف کے بھی

اسباق تھے کئی سال تک انھوں نے بخاری شریف کا بھی درس دیا، ان پر آخر میں مہتمم کے منصب کی ذمہ داری ڈالی گئی، جس سے انھوں نے ۱۹۶۹ء میں علیحدگی اختیار کر لی اور اس کے تقریباً دوسال کے بعد پاکستان تشریف لے گئے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کئی برس تک بڑے طلباء کی بورڈنگ کے نگراں بھی رہے وہ دینی جلسوں میں بھی جاتے اور تقریر و وعظ بھی کہتے تھے، وہ حضرت تھانویؒ کے خلفاء کے مسترشدین میں تھے، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی سے اس سلسلہ میں خصوصیت سے میں استفادہ کیا اور ان کے مجاز بھی ہوئے، انھوں نے اپنی عملی زندگی میں دینی اثر و کیفیت اس راہ سے پیدا کی تھی اور اپنے طلباء کو اسی اصلاح و تدین کی طرف راغب کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے طبابت کا علم بھی حاصل کیا تھا، ممکن ہے کہ انھوں نے شروع میں مطب بھی کیا ہو کیونکہ ان کے نام کے شروع میں حکیم کا لفظ بھی وابستہ کیا جاتا تھا جو انھوں نے بعد میں باقی نہیں رکھا، وہ نبض بھی دیکھتے تھے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے ان کو نبض پہچاننے کی کافی حد تک مشق تھی جو صرف حاذق اطباء کو ہوا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے انقلابی حالات کے اثر سے مسلمان رہنمایان ملت کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس ملک میں اسلام کی بقاء کے لیے جو مسلمان کے لیے ضروری ہے دعوت و تبلیغ کا کام علمی انداز میں غیر مسلموں میں بھی کرنا چاہئے اس کے سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی نے ایک مجلس اشاعت اسلام کے نام سے قائم کی تھی، جس میں مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ معاون تھے بلکہ وہ کچھ مدت کے لیے اس مجلس کے ناظم بنے اور اس کے لیے کام انجام دیئے، ان کی نظامت میں مجلس نے ہندی و انگریزی میں متعدد مؤثر خطبات شائع کئے یہ کام ایک مدت تک ہوتا رہا اور اس سے فائدہ پہنچا۔

مولانا نے اپنے پیچھے بہت سی یادیں چھوڑیں جو ان کے محبین و تلامذہ کا یہ احساس بڑھاتی ہیں کہ ان کی وفات ملت اسلامیہ ہند کے لیے ایک خسارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور لغزشوں کو معاف کرے اور اپنے قرب میں جگہ دے۔ (آمین)

مولانا محمد ناظم ندویؒ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کو ابھی پورے چھ مہینہ بھی نہیں گزرے کہ ان کے رفقاء ندوہ اور ہم مذاق ساتھیوں کی صف میں جو آخری شخص رہ گئے تھے ان کی وفات کی بھی خبر مورخہ ۹ رجون ۲۰۰۰ء کو ندوہ پہنچی، ہماری مراد مولانا محمد ناظم صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے کہ جن کی علمی اور تعلیمی رفاقت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ایسی قریبی اور برادرانہ تھی کہ وہ دونوں جب ملتے تو آپس کے انس اور مسرت سے ملتے اور دو دوستوں اور رفیقان کار کی حیثیت سے کاموں میں شریک ہوتے تھے، دونوں تقریباً ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۲ء تک طالب علمانہ حیثیت کے ساتھ رہے، پھر مولانا محمد ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں عربی زبان وادب کے استاد کی حیثیت سے چار سال ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۷ء رہے، وہاں اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسے حضرات استاد تھے، مولانا ناظم صاحبؒ کو وہاں ان کے ساتھ رفاقت رہی، پھر مولاناؒ ندوہ میں بھی استاد کی حیثیت سے آگئے، اور یہاں رہے، سابق رفقاء مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ اور مولانا مسعود عالم ندوی صاحب اور مولانا عبدالسلام ندوی صاحب قدوائی کی رفاقت رہی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء کی تھی، جوان کے رفیق علمی وتعلیمی مولانا علی میاں صاحبؒ کی تھی۔

مولانا محمد ناظم صاحبؒ مشہور صوفی اور صاحب سلسلہ بزرگ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے نسبی تعلق رکھتے تھے، والد صاحب کا نام اشفاق احمد تھا، اور علی نگر ضلع مونگیر بہار میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر متوسط تعلیم شمس الہدی، پٹنہ بورڈ میں ہوئی اور وہاں نمایاں کامیابی حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے ندوہ آئے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے

ندوۃ العلماء میں دس سال تدریس میں ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۹ء تک گزارے تھے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص موضوعات میں سے ادب عربی کو خصوصی مقام حاصل تھا، اور اس میں ندوہ کو شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی آمد سے بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی، علامہ شیخ تقی الدین ہلالی تین سال ندوہ میں رہے، ان کے خاص شاگردوں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ مدیر عربی ماہنامہ ''الضیاء'' اور مولانا محمد ناظم ندوی کو ان کی خصوصی توجہ حاصل ہوئی، یوں ان کے دیگر رفقاء میں مولانا عبدالسلام ندوی قدوائی، مولانا عمران خاں ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، اور کچھ دوسرے حضرات بھی تھے، لیکن ادب عربی کے استفادہ کے لحاظ سے تین آدمیوں کو خصوصیت حاصل ہوئی، اور مراکش کے عربی زبان وادب کے بڑے عالم شیخ تقی الدین ہلالی سے استفادہ سے ہوئی، مصر وشام کے اہم ترین فضلاء میں زبان وادب کے کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا تو شیخ تقی الدین ہلالی سے رائے لیتے، ندوہ کو ان کی آمد سے بہت فائدہ پہنچا، اور وہ فائدہ حقیقت میں ان تین اشخاص کو عربی ادب میں امتیاز حاصل کرنے کی صورت میں حاصل ہوا، مولانا مسعود عالم ندویؒ نے عربی صحافت میں اپنی ممتاز صلاحیت کا ثبوت دیا، ندوہ کا عربی ترجمان ماہنامہ ''الضیاء'' ان ہی کی ادارت میں کئی سال نکلا اور اس نے عالم عربی میں داد تحسین حاصل کی، اس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا محمد ناظم ندویؒ پوری طرح سے معاونت اور شرکت کرتے تھے، مولانا محمد ناظم ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصیت زبان اور لغت کے پہلو میں امتیاز تھا، اور انھوں نے عربی کے الفاظ اور نحو کی صحت کے سمجھنے میں خصوصی امتیاز پیدا کیا تھا، اس کا اعتراف خود ان کے رفقاء کرتے تھے، مولانا محمد ناظم ندویؒ نے ندوۃ العلماء میں تدریس کا کام دس سال تک کیا، تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے اور ریاست بہاولپور کی اسلامی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے، وہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۶۳ء بارہ سال اس منصب پر رہنے کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں استاد کی حیثیت سے کام کیا، پھر پاکستان واپس آکر کراچی میں مقیم ہوگئے، تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول رہے، کئی

کتابیں انھوں نے تصنیف کیں، عربی شاعری میں بھی انھوں نے حصہ لیا، اس طرح مختلف موضوعات پر ان کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار ہوا جو شائع ہوا، عربی انشاء وادب کی تعلیم پر "المنهج الحديد لدراسة اللغة العربية" کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب بھی لکھی، اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت نبوی پر بے نظیر کتاب ''خطبات مدراس'' کا عربی میں "رسالۂ المحمد" کے نام سے ترجمہ کیا شائع ہو چکا ہے اور مقبول ہے اس کے علاوہ ان کی ایک دوسری معرکہ آراء تصنیف سیرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا بھی عربی میں ترجمہ کیا تھا، لیکن وہ طبع ہونے سے رہ گیا۔ ان کا عربی ادب کے ساتھ ساتھ دیگر علمی موضوعات سے بھی اچھا ربط تھا، چنانچہ ندوۃ العلماء میں عربی ادب کے بڑے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور بعض دیگر فنون کی کتابوں کا بھی درس دیا اور جامعہ عباسیہ بھاولپور میں بخاری شریف کا بھی درس دیا، حدیث شریف میں وہ ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں صاحب ٹونکی کے شاگرد رہے تھے اور ان سے استفادہ کیا تھا۔

مولانا محمد ناظم ندوی ندوۃ العلماء کے ان فرزندوں میں تھے جن پر ندوۃ العلماء کو فخر تھا، وہ ندوۃ العلماء سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، پاکستان جانے کے بعد بھی ندوۃ العلماء سے برابر تعلق محسوس کرتے رہے اور ان کو دو یا تین بار ان کو ندوۃ العلماء آنے کا موقع ملا اور ندوۃ العلماء آکر انھوں نے بڑی مسرت محسوس کی، ندوۃ العلماء میں ان کو سب سے زیادہ تعلق مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے تھا، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو ان سے بڑا انس وتعلق تھا، دونوں بڑے مخلص دوست اور رفیق کی حیثیت سے ملتے تھے اور وہ دور رہنے کی صورت میں ایک دوسرے کو یاد کرتے تھے۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل کے بعد جس کے صدر مولانا علی میاںؒ منتخب ہوئے، پاکستان کے حصہ کی ذمہ داری مولانا محمد ناظم ندویؒ پر ڈالی گئی تھی، جو گذشتہ چند سال قبل تک رہی، گزشتہ کئی سالوں کے دوران مولانا محمد ناظم صاحب ندویؒ کو صحت کی مختلف کمزوریوں سے سابقہ پڑا

خاص طور سے ان کے پیروں کی کمزوری بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، نیز بعض ایسی شکایات ہوگئی تھیں، جن سے معذوری بڑھ گئی تھی، بالآخر وقت آخر آ گیا، اور عربی زبان وادب کا یہ ممتاز دانشور وماہر اپنے مالک حقیقی سے جاملا، ان کی وفات حضرت مولاناؒ کی وفات کے تقریباً چھ ماہ بعد ہوئی، اگر حضرت مولاناؒ کی حیات میں ہوئی ہوتی تو مولاناؒ اس کا بڑا صدمہ محسوس کرتے، جس کو ہم سب اہل ندوہ محسوس کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دامن عفو ومغفرت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے۔

راقم الحروف کو ان کی خاصی شفقتوں کا فائدہ حاصل رہا ہے، شاگرد ہونے کے تعلق سے بھی، اور ان کے عزیز ودوست ورفیق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجہ ہونے کے تعلق سے بھی، اس لیے میں اس واقعہ کو خاندانی واقعہ تصور کرتا ہوں اور میں ہی صرف نہیں بلکہ ان کے تمام شاگرد جو ان کی محبت اور ان کے حسن اخلاق اور شفقت سے مستفید ہوئے ہیں، ان کی وفات کو بڑے صدمہ کا باعث سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے (آمین)

(۶) رفقاء ومعاصرین

(۱) مولانا عبدالماجد ندویؒ
(۲) مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ
(۳) مشیرالحق بحری آبادیؒ
(۴) ڈاکٹر ارشد حسین ندویؒ
(۵) ڈاکٹر حبیب الحق ندویؒ
(۶) مولانا معین اللہ ندویؒ
(۷) مولانا شہباز اصلاحی ندویؒ
(۸) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشیؒ
(۹) پروفیسر عبدالحلیم ندویؒ
(۱۰) مولانا عبداللہ عباس ندویؒ
(۱۱) مولانا مجیب اللہ ندویؒ
(۱۲) مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوریؒ
(۱۳) مولانا عبدالکریم پاریکھؒ
(۱۴) مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ

مولانا عبدالماجد ندویؒ

ہمارے عزیز دوست اور طویل رفاقت کے ساتھی مولانا عبدالماجد ندوی نے ۱۹ررجب کو جدہ میں انتقال کیا۔ وہ اگرچہ ایک عرصے سے لکھنؤ اور ندوے میں نہ تھے، لیکن قدیمی تعلق ومحبت اور بذریعہ نصف ملاقات ندوے سے ان کا ربط قائم تھا، وہ ہمارے ندوی خاندان علم وادب کے ایک عزیز رکن، ہم ذوق رفیق اور راہ علم وتعلیم کے ساتھی تھے، کتنی یادیں ہیں جو اس قدیمی رفاقت کے ساتھ وابستہ ہیں، تقریباً چالیس سال جو ہم لوگوں کے قرب وتعلق میں گزرے، اب یادیں ماضی بن گئیں اور یہ عزیز دوست بھی ان اہل تعلق میں شامل ہوگئے، جنھوں نے اس دار فانی سے دار باقی کو کوچ کیا۔

مولانا عبدالماجد بن عبداللطیف ندوی ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں سگوڑی کے رہنے والے تھے، ندوہ میں تقریباً ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء میں آئے تھے اور پھر ندوہ سے قریب ودور برابر وابستہ رہے، اور ہم کو بھی ان کی رفاقت کی مسرت حاصل ہوئی۔

مولانا عبدالماجد ندوی ۱۹۴۸ء میں ندوے سے فارغ ہوئے اور اس کے بعد ہی ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کا موقع ملا، جو تقریباً ۲۰ سال جاری رہا، اس کے بعد وہ حجاز چلے گئے، جہاں سعودی عرب ریڈیو کے مشرقی شعبے میں ایک رکن کی حیثیت سے انھوں نے ۱۶/۱۷ سال گزارے اور ساٹھ سال سے کچھ کم عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مولانا عبدالماجد ندوی سے مجھ کو طالب علمی میں رفاقت حاصل ہوئی اور پھر تدریس کے زمانے میں بھی یہ رفاقت حاصل رہی اور حسن اتفاق ہے کہ تدریس کے ایک ہی شعبہ یعنی عربی زبان وادب کے شعبے میں ہم دونوں رہے، چنانچہ مسائل پر غور وفکر کرنے میں آپس کا ربط رہا اور الحمدللہ بڑی حد تک یکسانیت رہی، اس بات نے قرب کو بڑھا کر

دوستی کا ایک رشتہ پیدا کر دیا تھا، نیز قریب سے دیکھنے اور زیادہ واسطہ پڑنے کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ربط کے بڑھنے میں بڑی مدد ملی۔

مولانا عبدالماجد ندویؒ ایک پُرخلوص، بااخلاق اور ملنسار آدمی تھے، ان سے ملنے جلنے والے ان کے ان اخلاق وصفات سے واقف اور مداح رہے اور ساتھیوں کے لیے تو وہ ایک انجمن تھے، نشستیں ہوتیں اور علمی واجتماعی ودعوتی مسائل پر گفتگو دونوں فائدے حاصل ہوئے۔

مولانا عبدالماجد صاحب کو تدریس کے فرائض کے ساتھ طلباء کے ایک دارالاقامہ کی نگرانی بھی سپرد کی گئی تھی، اس ذمہ داری کو وہ ایسی توجہ اور جذبے سے پورا کرتے جو خاندان میں شفیق بڑوں کا اپنے عزیز چھوٹوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ان کو خاصا وقت لگانا پڑتا اور ذہن وجذبے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑتا، اس طرح انھوں نے نگرانی وتربیت کے ذریعے بھی طلباء کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اتفاق سے ان کو متوسط العمر اور اس سے کچھ عمر کے طلباء دیے گئے تھے اور عمر کا یہ مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے اور اس عمر میں اگر توجہ صرف کی جائے تو تربیت ونگرانی کا فائدہ بہت دوررس ہوتا ہے، اس لیے بھی مولانا عبدالماجد صاحب نے جو خدمات اس سلسلے میں انجام دیں، وہ خاصی قیمتی خدمات تھیں، جو طلباء اس دور میں ان کی نگرانی میں رہے، ان کی بعد کی زندگیوں میں اس کے اچھے اثرات یقیناً نمایاں ہوئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اسی زمانے میں اپنے عربی صرف ونحو کے نصاب میں متعدد خلاؤں کو پُر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جو کتابیں کسی سابقہ یا مقامی حالات رکھ کر مرتب کی گئی تھیں اور ہمارے نصاب میں اس لیے شامل کی گئیں کہ ان کا اب تک کوئی بدل نہیں مل سکا ہے، ان کی جگہ مناسب حال اور حسب ضرورت کتابیں تیار کرائی جائیں، چنانچہ اس کام کا ایک حصہ مولانا عبدالماجد ندویؒ کے سپرد کیا گیا اور کچھ حصہ دیگر رفقاء کے سپرد کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے جس خوبی اور خوش اسلوبی سے اس

کام کوانجام دیا، وہ بڑا لائق ستائش تھا، انھوں نے نحو میں ''تمرین النحو'' کے نام سے اور انشاء اور ترجمے میں ''معلم الانشاء'' کے نام سے کتابیں تیار کیں جو نہ صرف ندوۃ العلماء میں بلکہ بکثرت مدارس میں داخل نصاب ہیں اور ان کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں، خاص طور پر معلم الانشاء نہ صرف ترجمہ وانشاء کی مشق کے لیے مفید ہے بلکہ صرف ونحو کی مشق میں بھی معاون ہے۔ معلم الانشاء کا یہ سلسلہ تین اجزا پر مشتمل ہے، اس کا تیسرا حصہ میرے سپرد کیا گیا جو اس سلسلے کا جز بنا، وہ مجموعی طور پر مضمون نگاری کی مشق اور ترجمے کے سلسلے میں بعض ضروری پہلوؤں کی وضاحت پر مشتمل ہے۔

مولانا عبدالماجد ندویؒ کو نوخیز عمر کے طلباء کی نفسیات واستعداد کو سمجھنے کی اچھی صلاحیت حاصل تھی، انھوں نے تعلیم وتصنیف کتب نصاب اور نگرانی طلباء کے کاموں میں مدد دی، ان میں یہ جذبہ بھی بھرپور تھا اور طلباء کو فائدہ پہنچانے اور ان کی رہنمائی کرنے کی بڑی فکر تھی، یہ فکر بعض وقت غلو کی حد تک پہنچ جاتی، جس پر ہم لوگ کبھی کبھی اختلاف بھی کرتے، لیکن جذبہ وتوجہ کی یہ زیادتی بہرحال فائدے سے خالی نہ تھی۔

وہ ایک حساس دل رکھتے تھے، اس لیے اپنی محنت وفکرمندی اور کارکردگی کی کسی وقت ناقدری دیکھ کر محسوس کرنے لگتے اور شکایت ہوتی کہ ان کی محنت کی ناقدری ہوئی، لیکن یہ ایک محدود نوعیت کی بات ہوتی۔

تعلیمی وتربیتی میدان میں توجہ ومحنت صرف کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ملت کی دشواریوں کا بھی پورا خیال تھا، اسی لیے وہ اخبارات ورسائل کے مطالعے سے دلچسپی رکھتے اور کبھی ترجمہ ومضمون کی صورت میں لکھتے بھی تھے، چونکہ اردو وعربی دونوں کی صلاحیت کے حامل تھے، اس لیے ان دونوں زبانوں کی حد تک وہ حسب گنجائش دلچسپی رکھتے تھے۔

وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، جو اردو کے مراکز میں ایک مرکز شمار کیا جاتا رہا ہے، اس لیے اردو سے ان کی مناسبت قدرتی بات تھی۔ جہاں تک عربی کا تعلق ہے تو ندوۃ العلماء میں تحصیل کی صورت میں نیز ایک مدت تک ندوے کے سابق شفیق استاد

وادیب مولانا مسعود عالم ندویؒ کے ساتھ ان کے ادارے دارالعروبۃ الإسلامیہ میں بھی رہے۔ وہاں مولانا مسعود عالم ندویؒ نے ان کی رہنمائی وتربیت کی اور عربی سے ان کی مناسبت وصلاحیت میں اضافہ کیا۔ ہندوستان میں روز بروز ہونے والے فسادات سے اور خاص طور پر بہار کے بعض علاقوں کے فسادات سے جو تقریباً اسی زمانے میں پیش آئے جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی مذکورہ بالا دلچسپیوں میں مصروف تھے، بہت متاثر ہوئے، ان فسادات کا ان کے دل پر اثر پڑا، اور تقریباً یہی ان کی اعصابی وقلبی تکلیف کے آغاز کی علامت بنا، یہ تکلیف وقت کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہی، لیکن بصورت اختلاج واعصابی تکلیف کے علی العموم جاری رہی۔ انھوں نے اس سلسلے میں مختلف رائج الوقت طرق علاج اختیار کیے، لیکن خاطر خواہ نفع نہ ہوسکا، ان تکالیف واحساسات کا اثر غذا پر بھی پڑا، چنانچہ ان کی صحت چند سال میں خاصی گرگئی، خاص طور پر رات کے آخری حصے میں زیادہ تر بے چینی اور بے خوابی سے سابقہ پڑتا۔

ان کے کاموں پر اور علمی وادبی دلچسپیوں پر اس کا اثر پڑا اور ان کی یہ خواہش ہوئی کہ کسی پُرسکون حالات کے ملک میں وہ کچھ مدت گزاریں، تاکہ صحت پر ان کا خوشگوار اثر پڑے، وہ ندوے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے کہ ان دنوں ندوے کا ماحول ان کے ذوق واطمینان کا تھا، لیکن صحت کی مجبوری سے وہ کچھ عرصے زیادہ اطمینان بخش جگہ پر گزارنا چاہتے تھے، جدہ میں سعودی ریڈیو میں لکھنؤ میں ایک ندوی نصار رفیع صاحب اچھے عہدے پر تھے اور مولانا مرحوم سے ان کا ندوی رشتے سے اخوی تعلق بھی تھا۔ انھوں نے توجہ کی اور مولانا مرحوم کو اس بہانے حجاز میں وقت گزارنے کا موقع مل گیا، مولانا اس سے قبل حجاز اور مصر کا سفر کرچکے تھے، اس لیے اس نئے ماحول میں ان کے لیے اجنبیت بھی نہ تھی۔

مولانا مرحوم حجاز میں اپنی نئی مشغولیت میں منتقل تو ہوئے، لیکن ان کی صحت میں بنیادی تبدیلی نہ ہوسکی، بہرحال بہتر سے بہتر علاج جو حاصل ہوسکا انھوں نے اختیار کیا، جس سے ان کو خاصا فائدہ ہوا۔ نیز معاشی لحاظ سے بھی بے فکری بڑھی، ان دونوں باتوں

کے اثر سے ان کی زندگی میں نسبتاً سکون میں اضافہ ہوا، البتہ اپنی نئی ملازمت کی مشغولیات کے باعث وہ آزادانہ طریقے سے تصنیفی یا تربیتی کام نہ کر سکے، لیکن ان کا مطالعہ اور ملت کے خیر وشر کے معاملات سے واقفیت اور ان سے نجی دل چسپی برقرار رہی۔

حجاز میں ان کے قیام کو اندازاً ۱۶ سال گزرے اور بظاہر مرض کی کوئی ایسی نوعیت نہ تھی کہ اس سے اہل تعلق خطرہ محسوس کرتے، لیکن وقت موعود آچکا تھا، شب جمعرات مورخہ ۱۹/ رجب ۱۴۰۵ھ کو انھوں نے سینے میں ایسا درد محسوس کیا جو علاج کے قابو میں نہ آسکا اور انھوں نے شب ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا اور دوسرے دن شب جمعہ کے آغاز پر مکہ مکرمہ کے عالی مرتبت مقبرے جنۃ المعلیٰ میں دوستوں اور شاگردوں کی بڑی تعداد کے ہاتھوں سپرد خاک کیے گئے، اللّٰھم اغفرله وارفع منزلته وتقبل صالح أعماله۔

پس ماندگان میں مولانا مرحوم نے اہلیہ اور لڑکے اور لڑکیاں چھوڑیں، ابھی ان کے لڑکے زیر تعلیم ہی ہیں۔ دونوں بڑے لڑکے حجاز سے ہائی اسکول کر چکے تھے، کالج کی تعلیم جامعہ ازہر قاہرہ میں حاصل کر رہے تھے، خبر رنج اثر سن کر جدہ آئے اور جنازے میں شریک ہوئے۔

مولانا عبدالماجد ندویؒ سادہ مزاج، صاحب ذوق اور ملنسار طبیعت کے آدمی تھے، حجاز میں بھی انھوں نے اپنا ایک باذوق اہل علم حلقہ بنالیا تھا، ان کے شاگردوں کا بھی ایک حلقہ تھا، جو بحیثیت طالب علم کے سعودی تعلیم گاہوں میں یا بعض ملازمتوں میں تھا۔

ان کے علاوہ مکہ مکرمہ میں مولانا ڈاکٹر عبداللہ بن عباس ندوی ان کے ہم وطن اور ندوے کے دور کے ان کے بعض ساتھی موجود تھے، جدہ میں نصار رفیع صاحب تھے، اس طرح ہر تعلق والے افراد کی کمی نہیں محسوس ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود مولانا مرحوم کو برابر ندوے کی زندگی یاد آتی تھی اور ندوے سے تاحال وابستگان سے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار بھی کرتے تھے کہ ان کی خواہش ندوے میں لوٹنے کی ہے، اور ذوق کی مطابقت اسی سے ہے، لیکن مشکل یہ تھی کہ جدہ میں اتنے دنوں سے برسر کار رہنے کی وجہ سے جو معیار اور ضروریات

زندگی بن گئی تھیں ان کو یکسر ختم کرنا آسان نہ تھا، لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی چل رہا تھا، اس لیے مولانا مرحوم کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

مولانا مرحوم کی بچپنے کی وابستگی یوں تو پٹنہ سے تھی، لیکن ابتدائے شباب سے عمر کی پختگی تک ربع صدی کا زمانہ لکھنؤ میں گزارنے کی وجہ سے ان کو مناسبت وواقفیت خاص ہوگئی تھی، پٹنہ اور لکھنؤ دونوں سے اہل ادب وذوق کی جگہیں ہیں، اس لیے دونوں سے استفادہ کیا تھا، اور پھر ان کے اولین احباب کا حلقہ لکھنؤ میں ہی بنا تھا، شاگردوں کا حلقہ بھی لکھنؤ سے ہی بنا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بحیثیت شاگرد اور قدر شناس خصوصی تعلق رکھتے تھے اور اپنے اہم معاملات میں اُن کے مشورے کے طالب ہوتے۔ حجاز کا سفر بھی ان کی اجازت حاصل کرکے اور ان کے تعاون سے کیا تھا، اس کا تب سطور کو بھی ان سے قریبی تعلق تھا، حصول تعلیم کے زمانے میں درجے کے ساتھی، تدریس کے زمانے میں شعبے اور موضوع کے ساتھی، اور بے تکلف دوست بلکہ ساتھیوں اور دوستوں میں نوعیت کے لحاظ سے منفرد۔

لہٰذا ان کے انتقال کی خبر ندوے میں اور میرے لیے خاص طور پر ایک طرح سے ذاتی سانحہ ہے، جس کا اثر عرصے تک دل کو محسوس ہوتا رہے گا۔

ان کے انتقال کی خبر جس روز ندوے میں پہنچی، ادب اسلامی پر ایک سمینار منعقد ہورہا تھا۔ ادب اسلامی کے ساتھ ان کی دیرینہ دل چسپی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اس موضوع کے دائرے سے تعلق کی بنا پر سمینار نے اس واقعے کو اہمیت دی، اور تجویز تعزیت پاس کی۔

اللہ تعالیٰ مولانا عبدالماجد صاحب ندوی کو غریق رحمت کرے اور ان کے انتقال سے جو خلا ہوا ہے اس کا بہتر سے بہتر شکل میں مداوا فرمائے، اور پس ماندگان کی اس سانحے میں پوری مدد فرمائے، آمین۔

مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ

مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ ندوۃ العلماء کے ایک بڑے مقبول ومحترم استاد تھے۔انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور فراغت کی، پھر وہیں تدریسی خدمت میں چالیس سال سے زیادہ مدت گزاری۔اور اپنی علمی وانتظامی صلاحیتوں سے بہت فائدہ پہنچایا قلب کی بظاہر معمولی شکایت میں تقریباً دو ماہ مریض رہ کر ۶۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا انتقال سے ایک ہفتہ قبل قلب کی بعض کمزوریوں کی تحقیق کے سلسلے میں اسپتال میں داخل ہوئے تھے جو کہ ایک صرف رواروی کا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔خود مولانا مرحوم اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کررہے تھے، اور جانچ کی رپورٹ کوئی زیادہ فکرمندی کی بھی نہ تھی۔لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔اور وقت موعود آچکا تھا مولانا مرحوم حسب معمول مشغولیت اور انشراح کے حال میں تھے کہ رات میں دورہ پڑا اور کئی گھنٹے کے تسلسل کے بعد انتقال کیا۔میں ان دنوں بیرونی سفر پر تھا، وہاں ایک ٹیلی فونی اطلاع سے واقعہ کا علم ہوا، اس اچانک خبر سے بہت اثر ورنج ہوا۔اور واقعہ ایک طرح سے اچانک پیش آنے والا محسوس ہوا۔مجھے تقریباً چالیس سال سے مولانا موصوف کو دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا، بلکہ مجھے ان کو قریب سے دیکھنے کا اور ساتھ رہنے کا بھی موقع ملا۔مولانا ابوالعرفان خاں ندویؒ نے تقریباً پینتالیس سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں علمی وانتظامی کاموں میں گذارے۔ جن سے ندوہ کے بام ودر بسے ہوئے ہیں، مولانا موصوف کے ساتھ تقریباً ۳۷ سال سے میرا تدریسی کام میں رفاقت کا تعلق رہا، طالب علمانہ زندگی میں مولانا مرحوم مجھ سے تقریباً چھ سال آگے تھے، اس فرق سے وہ میرے استاد بھی ہوسکتے تھے۔اور میرے بعض رفقاء

کے وہ استاد تھے۔ لیکن مجھ کو ان کی شاگردی حاصل نہیں ہوئی، اس کی وجہ سے تدریسی خدمت میں رفاقت کے دوران ان سے میری قدرے بے تکلفی رہی اور ان کی مرنجامرنج طبیعت کی وجہ سے ان سے قریبی ربط وضبط وانس وتعلق رہا۔ مولانا مرحوم کا یہ ربط وضبط وانس ندوۃ العلماء کے تدریسی اسٹاف کے علاوہ طلباء سے بھی خاصی حد تک تھا وہ سب سے بے تکلف اور سب کے ہمدرد تھے۔ اپنی علمی صلاحیت سے ہی نہیں بلکہ اپنی انتظامی تجربہ کاری سے بھی وہ فائدہ پہنچاتے تھے، دس بارہ سال دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بھی رہے۔ پھر انھوں نے اپنے خاص حالات کی وجہ سے مہتمم کے عہدہ کو ترک کر کے صرف تدریسی منصب پر ہی اکتفا کیا۔ جس پر وہ آخر تک فائز رہے۔ مجلس نظامت ندوۃ العلماء کے بھی رکن تھے۔ اور شعبۂ دینیات کے صدر بھی۔ اور ندوۃ العلماء کے موجودہ تدریسی اسٹاف میں سب سے قدیم بھی۔

مولانا علمی لحاظ سے ندوۃ العلماء کے تخیل کے مطابق نمایاں مقام کے حامل تھے علوم عقلیہ و بلاغت کے علاوہ تفسیر وتاریخ، ادب اور علوم اجتماعیہ پر بھی اچھی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب کے پاس گھر پر اور متوسط تعلیم دارالعلوم دیوبند اور جونپور میں اور اعلیٰ تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی۔ پھر کچھ مدت کے لیے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فیض صحبت وتربیت سے فائدہ اٹھایا۔ مرحوم مطالعہ کے بڑے خوگر تھے۔ اور مطالعہ کے سلسلے میں ان کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ تاریخ، فلسفہ، ادب، علوم اجتماعیہ، علوم دینیہ سب کا مطالعہ وہ بہت شغف وشوق سے کرتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حافظہ کی دولت بھی فراوانی سے ملی تھی۔ اس لیے وہ سب ان کو بڑی حد تک یاد و متحضر رہتا تھا۔ چنانچہ ان کی مجلسیں بڑی باغ وبہار ہوتیں۔ ان کی تدریس سے طلبہ کو بڑا فائدہ پہنچتا، مجالس مذاکرہ نیز علمی محافل میں بھی ان کا حصہ مؤثر اور مفید رہتا۔ چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے وہ بہت قیمتی متاع تھے جس سے ندوۃ العلماء محروم ہوگیا۔ اور اب اس قحط الرجال زمانہ میں جب کوئی ایسی شخصیت جدا ہوتی ہے تو وہ اپنا بڑا خلا چھوڑ جاتی ہے۔ جس کے پر

ہونے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہوتی۔

مولانا مرحوم جونپور کے ایک معروف علمی گھرانے کے فرد تھے۔ان کے والد مولانا دین محمد ایک معروف اہل علم واستاد تھے۔جن کو مولانا ابوبکر شیث جونپوری سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا تلمذ حاصل تھا۔چنانچہ مولانا مرحوم کو مولانا ابوبکر کے گھرانے سے خصوصی ربط تھا،اور چونکہ مولانا ابوبکر کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے گھرانے سے روحانی ربط تھا،اس کی وجہ سے مولانا مرحوم بھی اس گھرانے سے ایک ربط محسوس کرتے تھے۔اسی ربط کے تعلق سے ہی مولانا مرحوم کو حضرت مولانا علی میاں سے خصوصی ربط وتعلق تھا۔

مولانا مرحوم کی طبیعت میں خوش اخلاقی وہمدردی خاصی نمایاں تھی۔جس کی وجہ سے اساتذہ وطلباء سب ان سے مانوس رہتے،چنانچہ ان کے انتقال پر بے حد تاثر محسوس کیا گیا۔جس کا اظہار ان کے جنازہ کے وقت صاف طور پر دیکھا گیا،مولانا مرحوم نے خطابت وتصنیف کو اپنی علمی زندگی کا اصل مشغلہ نہیں بنایا۔انھوں نے علمی مطالعہ اور تدریسی افادہ پر ہی اصل زور رکھا۔اس لیے وہ کوئی خاص صاحب تصنیف یا خطیب نہیں ہوئے۔لیکن پھر بھی اس دائرہ میں بھی ان کا تھوڑا بہت حصہ ہے۔انھوں نے بعض اہم کتابوں کے ترجمے کئے۔متعدد اہم مضامین لکھے،جن میں سے بعض نے مختصر کتابوں کی صورت بھی اختیار کرلی ہے۔

مولانا کے تبحر علمی کا اصل مظاہرہ علمی محافل میں ہوتا تھا جب کسی علمی موضوع پر اہل علم میں تبادلۂ خیال ہوتا وہاں مولانا کے وزنی تبصروں اور رایوں سے حاضرین کو رہنمائی ملتی اور فائدہ پہنچتا۔

مولانا ابوالعرفان خاں ندویؒ کے ندوہ کے زمانۂ طالب علمی کے قریبی رفقاء میں مولانا عبداللہ عباس ندویؒ پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ،مولانا سید وصی مظہر ندوی سابق وزیر امور مذہبی پاکستان،مولانا مجیب اللہ ندوی ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ،مولانا محمد معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء،پروفیسر عبدالحلیم ندوی استاد جواہر لال یونیورسٹی دہلی اور مولانا عبدالغفار ندوی ناظم جماعت اسلامی یوپی،خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے جو ندوۃ العلماء کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کے استاد بھی رہے ہیں۔ اس واقعہ سے بڑا رنج و ملال محسوس فرمایا۔ خاص طور پر مولانا ابوالعرفان ندویؒ کی وسیع علمی واقفیت کو سراہتے ہوئے ان کے اس پہلو سے بھی اس حادثہ کو بڑا حادثہ قرار دیا۔

مولانا موصوف اپنے علمی مقام کے احساس سے مغلوب نہیں رہتے تھے۔ وہ جب عمومی باتیں کرتے تھے، تو ان کی علمی حیثیت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بے تکلف رفقاء میں بے تکلف عمومی انداز کی باتیں کرتے اور جب علمی موقع ہوتا اور بات مولانا کے بولنے کی آجاتی تو ان کی علمی وسعت و پختگی کا اندازہ ہوتا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے ساتھ بعض اہم انتظامی معاملات کی ذمہ داری بھی وہ انجام دیتے رہے، لیکن اکثر مدت تدریس میں گزاری، سابق مہتمم دارلعلوم ندوۃ العلماء مولانا محمد عمران خان ندوی امیر ''دارالعلوم تاج المساجد'' بھوپالؒ نے ان کی انتظامی خصوصیت کو سب سے پہلے محسوس کیا تھا۔ اور اس پہلو سے ان کی بڑی قدردانی کی تھی۔ پھر مولانا نے اس سلسلے میں بھی دارالعلوم کی بڑی خدمت انجام دی۔ شروع میں مولانا نے تقریر وخطابت سے بہت کم دلچسپی لی۔ لیکن عمر کے آخری حصہ میں اس خدمت کو بھی انجام دینے لگے تھے۔ خاص طور پر جب موضوع علمی ہو۔ چنانچہ انتقال سے چند روز قبل ہی انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی دعوت پر یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں سیرت پر تقریر کی۔ مولانا کی صحت اس موقع پر اچھی نہ تھی، لیکن اپنی صحت کے سلسلے میں بے فکری کا طرز رکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے انھوں نے اس موقع سے گریز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ان کی بلند ہمتی کی بات تھی، مولانا کے اوصاف میں تحمل نمایاں وصف تھا۔ وہ پریشانی اور برہمی کے موقعوں بھی اپنے تحمل کو قائم رکھتے تھے۔ اور برہم نہیں ہوتے تھے۔ البتہ انتظامی مصلحت سے ان کو کسی موقع پر مصنوعی غصہ اختیار کرنا پڑتا تھا، جو صرف اسی دائرہ کے اندر ہوتا تھا، جو ضرورت کے تقاضہ سے محسوس کرتے تھے۔

طلباء کے ساتھ ان کی گفتگو مؤثر اور مطمئن بنانے والی ہوتی تھی۔ وہ علم کلام کے ماہر تھے۔ منطق بھی ان کے دیگر خاص موضوعات میں سے تھی۔ چنانچہ اس کا اثر ان کی اطمینان بخش گفتگو میں جھلکتا تھا۔

وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے والد صاحب کے انتقال کے بعد بھائیوں کی تعلیم عموماً ان کے ذمہ رہی۔ ان کے چچازاد بھائیوں میں کئی حضرات عالم و مدرس ہوئے، ان میں سے دو تین حضرات شاہ گنج میں واقع عربی درس گاہ کے ذمہ دار رہے۔

مولانا کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ کئی صاحبزادگان اور بیٹیاں ہیں، صاحبزادگان میں مولوی محمد عمران خان ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کی تکمیل کے بعد تدریسی مشغلہ اختیار کیا، مہاراشٹر بھیونڈی کے ایک کالج میں وہ اور مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی محمد حسان خان ندوی ازہری معروف اساتذہ میں ہیں، مولانا کے ایک صاحبزادہ محمد فیضان خان جدہ میں ملازم ہیں، اور بھی صاحبزادگان ہیں جو اپنی الگ الگ مشغولیتیں رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا موصوف کو اپنے خاص جوار رحمت میں جگہ دے اور عفو و مغفرت و رفع درجات سے نوازے۔ للّٰہ ما أعطی و له ما آخذ و کل شیئٍ عنده إلی أجل مسمی۔

پروفیسر مشیر الحق بحری آبادیؒ

پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی رمضان المبارک کی ۱۲ر تاریخ (۱۰ر اپریل ۱۹۹۰ء) کو سری نگر شہر کے ایک محلّہ میں یرغمال رہنے کے بعد شہید کر دیئے گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مشیر الحق صاحب یوپی کے ضلع غازی پور کے قصبہ بحری آباد کے رہنے والے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطنی علاقے ہی میں حاصل کی، ثانوی اور اوپر کی تعلیم کے لیے کئی سال ندوۃ العلماء میں طالب علم رہے۔ وہ ندوۃ العلماء کے ایک سنجیدہ محنتی طالب علم تھے، جن کو اپنی علمی زندگی سنوارنے کی فکر تھی۔ انھوں نے عالمیت کے درجات کی ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی ان کے اساتذہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی اور دیگر حضرات تھے تقریباً ۴۳-۴۵ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کے مشترکہ اسلامی تعلیمی منصوبے کے تحت شہر لکھنؤ میں ''ادارہ تعلیمات اسلام'' قائم ہوا جس میں قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانے کا خصوصی انتظام تھا۔ قرآن مجید کے علاوہ حدیث شریف کا درس بھی ہوتا تھا۔ اور اصلاحی کتابوں کی اشاعت بھی اس کے پروگرام میں شامل تھی۔ مشیر الحق صاحب اس ادارہ سے وابستہ ہوئے اور اس کے ذریعہ انھوں نے اپنی علمی اور تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کیا اور ترجمہ و تالیف کے مفید کام انجام دیئے۔ ادارہ سے ایک پندرہ روزہ ''تعمیر'' نکلا تو وہ اس کے انتظامی مدیر بھی بنے اور اس میں اپنی تحریری صلاحیتوں کا بھی انھوں نے ثبوت دیا۔

ان کے استاد مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جامعہ ملیہ میں صدر شعبہ دینیات کے منصب پر جب فائز ہوئے تو مشیر صاحب جامعہ منتقل ہو گئے اور وہاں انھوں نے عصری

تعلیم مکمل کی انھوں نے کناڈا میں ''میک گل'' میں جا کر تقابل ادیان میں ریسرچ کا کام کیا۔ واپسی پر وہ پٹیالہ کی پنجاب یونیورسٹی میں تقابل ادیان کے سنٹر میں استاذ ہوئے، پھر علی گڑھ میں ویسٹ ایشین کلچر سنٹر میں ریڈر ہوئے، وہاں سے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عربی فارسی شعبہ میں پروفیسر کے عہدہ پر آ گئے اور ابھی تین سال ہوئے وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر نامزد ہوئے، وہاں وہ مقررہ تین سالہ مدت اسی ماہ اپریل کے آخر میں نیک نامی کے ساتھ پورا کرنے والے تھے کہ اچانک یرغمال بنا لیے گئے اور چار روز تک قید میں رکھے جانے کے بعد بے گناہی کی حالت میں قتل کر دیئے گئے، ان کو چند اشخاص نے کشمیر کے مسئلہ میں اپنے بعض مطالبات حکومت سے منوانے کے لیے یرغمال بنایا تھا۔ اور حکومت نے جب ان کے مطالبے پورے نہیں کئے تو یہ دکھانے کے لیے کہ مطالبہ پورا نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مشیر الحق صاحب کو ۱۳ ررمضان مطابق ۱۰ر اپریل ۱۹۹۰ء کو قتل کر کے ایرپورٹ کے پاس ڈال دیا گیا۔

اس طرح ایک نرم دل، ہمدرد، علم دوست، سیاسی گروہ بندی سے دور اور شریعت طیبہ، علمی تحقیق و ریسرچ کا کام کرنے والے انسان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا، وہ اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ پر تھے۔ ان کے بچانے کے لیے حکومت پر کیا ذمہ داری تھی، یہ حکومت کے سمجھنے اور اس کے لیے مناسب حکمت عملی اختیار کرنے کی بات تھی، اس کو حکومت نے کتنا نبھایا، اس کے بارے میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ تین روز تک یہ یرغمال رکھے جانے کے بعد بھی رہا نہ کرائے جا سکے، اور چوتھے روز شب کو شہید کر دیئے گئے۔ إنا للّٰہ وإلیہ راجعون۔

وہ جیسا کہ اخباری اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے، چند مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ ایک مسلمان نے ایک مسلمان کو قتل کرتے ہوئے وہ کیا شرعی دلیل سامنے رکھی جو اس کے لیے قتل کا جواز پیدا کرتی تھی، یہ بات ہم دوسروں کے سوچنے سمجھنے سے قبل خود قتل

کرنے والوں کے سوچنے سمجھنے کی تھی اور پھر ایک علم دوست اور غیر سیاسی آدمی کے معاملہ میں؟ باقی جہاں تک مشیر الحق صاحب کا تعلق ہے وہ اپنے مالک سے اس طریقہ سے ملے جس سے ایک مسلمان کو شہادت کا مرتبہ ملتا ہے۔ البتہ ان کے پسماندگان پر جو غم واندوہ کا بارٹوٹا وہ ہر صاحب دل وصاحب عقل انسان کے سمجھنے کا اور ہمدردی ظاہر کرنے کا ہے اس واقعہ سے حکومت جس پر اثر ڈالنا مقصود تھا، اس پر اتنا اثر نہیں پڑا جتنا پسماندگان پر جن میں ایک بے گناہ بیوی اور کئی بے گناہ مسلمان لڑکیاں ہیں اور کتنے ان کے دوست اور محبین ہیں ہم اس واقعہ پر اپنے رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہیں اور سنجیدہ وغیرہ جانبدارانہ انداز سے کام کرنے والوں کے لیے سخت تشویش واذیت کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مشیر الحق صاحب کو اپنے عظیم عفو ومغفرت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو توفیق صبر کے ساتھ تلافی کی صورت عطا فرمائے۔

ڈاکٹر ارشد حسین ندویؒ

ڈاکٹر ارشد حسین ندویؒ رحیم آباد لکھنؤ کے ایک معزز اور زمیندار شیخ خاندان کے فرزند تھے، وہ ایک با اخلاق نرم خو محبت و رواداری کا جذبہ رکھنے والے انسان تھے، انھوں نے ندوۃ العلماء سے عربی تعلیم مکمل کی پھر یونیورسٹی کی عصری تعلیم سے فائدہ اٹھایا اور پی. ایچ. ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔

کچھ دنوں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں تدریسی فرائض بھی انجام دیئے پھر پٹیالہ کی پنجابی یونیورسٹی کے شعبۂ ادیان کے استاد مقرر ہوئے، اس شعبہ میں رہتے ہوئے دیگر ادیان، مسیحیت، یہودیت، ہندومت، جین، بدھ اور سکھ مذاہب سے گہری واقفیت حاصل کی اور اسی موضوع پر یونیورسٹی میں وہ فاضلانہ درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے اور یونیورسٹی میں اپنی صلاحیت علمی اور اخلاقی کے باعث مقبولیت حاصل کر لی اور تدریسی اسٹاف میں بھی اچھا مقام بنالیا۔

ارشد صاحب نے ۱۹۴۸ء میں ندوۃ العلماء میں فضیلت سے فراغت حاصل کی وہ میرے رفیق درجہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تکلف دوست بلکہ عزیز کی طرح تھے۔ اس تعلق کا آغاز میرے ماموں سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کے والد جناب مولانا حکیم شرافت حسینؒ رحیم آبادی کے بہت قریبی اور محبانہ تعلقات سے ہوا۔ اسی کی بنا پر ہم دونوں میں جو قربت شروع ہوئی وہ تعلیم میں رفاقت کے بعد دوستی میں تبدیل ہوگئی مجھے ان سے ان کو مجھ سے انس تھا ہمارے اس دوستانہ حلقہ میں بتدریج دیگر رفقاء و احباب کی شرکت ہوئی جن میں مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب کا نام نمایاں ہے۔

ارشد صاحب کا ربط و تعلق جس سے بھی قائم ہوا، اس کو انھوں نے تا عمر بہت خوش دلی کے ساتھ نبھایا، یہ دراصل ان کی نیک نفسی و مرنجان مرنج طبیعت کی وجہ سے تھا۔

ارشد صاحب نے طالب علمی کے زمانہ میں ملکی سیاست میں دلچسپی لی، وہ ایک زمانے میں صوبہ کی یوتھ کانگریس کے ایک اہم رکن رہے، یہ ملک کی آزادی سے کچھ قبل سے بعد تک کا عہد تھا، اس میں ان کو ملک وملت کے مسائل سے دلچسپی اور خدمت کا موقع ملا، اس میں ارشد صاحب نے اپنے دامن کو اختلافی سیاست سے بچاتے ہوئے مثبت انداز میں حصہ لیا ملک کے قومی لیڈروں سے ان کو تعارف حاصل رہا، انھوں نے اپنا دامن کسی دوسری چیز میں آلودہ ہونے سے بچاتے ہوئے صرف خیر خواہی کے کاموں تک اپنے کو محدود رکھا، انھوں اس میدان میں فائدہ کچھ نہیں اٹھایا، البتہ فائدہ مختلف پہلوؤں سے پہنچایا۔ ارشد صاحب کے والد حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ، ایک بڑے صالح نیک نفس صاحب قلم اور حکیم تھے، ان کے قلم سے بچوں کے لیے تربیتی کتابیں نکلیں، یہ کتابیں انھی کے قائم کردہ دارالاشاعت مکتبہ دین و دانش سے شائع ہوئیں، اور مقبول عام ہوئیں۔ ارشد صاحب اپنے والد کی صحت کی کمزوری کے بعد اس مکتبہ کو بھی دیکھنے لگے اور اس کی ترقی کی فکر میں رہتے تھے۔

خود ارشد صاحب کے قلم سے بچوں کے لیے کئی اصلاحی کتابیں نکلیں یہ سب کتابیں اس وقت ملک میں اردو مذہبی لٹریچر کی حیثیت سے رائج ومقبول ہیں، ارشد صاحب نے ''صبح صادق'' کے نام سے ایک اسلامی اردو ماہنامہ بھی نکالا تھا جو تقریباً دو سال تک جاری رہا اس میں اچھے علمی ومعلوماتی مضامین شائع ہوتے تھے، قرآن نمبر اور حدیث نمبر اس کی دو اہم خصوصی اشاعتیں ہیں۔

ارشد صاحب کے والد حکیم شرافت حسینؒ نے اپنے ماحول میں دینی فضا پیدا کرنے کا بھی اچھا کام انجام دیا۔ انھوں نے اپنے خاندان میں دین اور علم دین کے رجحان کو بڑھاوا دیا اور اصلاحی و دینی کوششیں بھی کیں، جن کے نتیجہ میں ان کے خاندان کے متعدد نوجوان ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے آئے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلے، اس طرح وہ اپنے خاندان کے لیے خاصا خیر کا باعث ہوئے، انھوں نے اسی طرح اپنی اولاد کے لیے بھی یہ کوشش کی وہ اصلاح کے راستہ میں گامزن ہوں اور دعوتی کام کو

فروغ دیں، حکیم صاحب نے عام انداز سے اچھی عمر پائی، عمر کے آخری حصوں میں سخت بیماریوں سے گزرے اور یہ ایک تلخ واقعہ ہے کہ ان کی وفات اپنے بیٹے ارشد صاحب کے انتقال سے صرف تین روز قبل ہوئی۔

ارشد صاحب کی بیماری جو کینسر کی شکل میں چھ سات ماہ جاری رہی، ان کے والد صاحب کو بہت متفکر اور ملول رکھنے لگی تھی، ان کو کیا خبر تھی کہ وہ ان سے تین روز قبل ہی اس دنیا سے چلے جائیں گے۔ اور ہونہار بیٹے کے انتقال کا غم والد کے مرض الموت کے آخری وقت دے جائیں گے۔

یہ سب مقدرات کی باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ دونوں پر اپنی بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور پسماندگان کو جن میں ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان اور اہلیہ اور ایک کم عمر بیٹے ندیم اور ایک بیٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر وقوت اور مستقبل میں کامیابیوں سے نوازے۔ (آمین)

ارشد صاحب کے دو ماموں اسی شہر لکھنؤ میں سربرآوردہ حیثیت کے مالک رہے، ان میں شیخ فیاض علی جو چند سال قبل اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوئے، ایک دیندار اور داعیانہ کردار کے آدمی تھے، دوسرے ماموں خان بہادر شیخ اقبال علی ایڈوکیٹ شہر کے ایک شہرت رکھنے والے فرد ہیں۔

ڈاکٹر ارشد حسین ندویؒ نے طویل عمر نہیں پائی وہ اپنی عمر کی چھٹی دہائی پوری کرنے جا رہے تھے کہ ان کو ان کے مالک نے اپنے یہاں بلا لیا۔

انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں علمی وتحقیقی کام میں زیادہ حصہ لینا شروع کر دیا تھا، تقابل ادیان کے موضوع پر ان کا مطالعہ اور کام اچھا خاصا ہو رہا تھا، اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو وہ اس موضوع پر ایک اچھا مفید تحقیقی کام پیش کر سکتے جو ان کے پروگرام میں بھی تھا اور اس کے لیے تیاری بھی تھی، وہ اپنے اس موضوع پر ملک کے مختلف سیمیناروں میں بھی شرکت کرتے رہے اور ان میں اچھا علمی حصہ لیتے رہے، اس طرح انھوں نے زندگی کو علمی اور مفید طریقہ سے پورا کیا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور اجر ومغفرت سے نوازے۔

ڈاکٹر مولانا سید حبیب الحق ندویؒ

ندوۃ العلماء کے دو صاحب مرتبہ شخصیتوں نے ایک ہی ماہ کے اندر اپنے پروردگار کی دعوت کو لبیک کہا اور اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کیا، ایک نے جنوبی افریقہ کی سرزمین پر اور دوسرے نے ہندوستان بلکہ لکھنؤ ہی کی خاک پر دونوں شخصیتیں اپنی اپنی مخصوص خصوصیات میں امتیاز کی مالک رہیں اور اپنے سفر آخرت سے اپنے سیکڑوں محبین وقدردانوں کو غمزدہ بنایا، ان میں ایک مولانا سید عبدالغفار نگرامی ندوی اور دوسرے مولانا ڈاکٹر سید حبیب الحق ندوی ہیں، دونوں اپنی اپنی علاحدہ خصوصیات وامتیازات کے ساتھ عمر کے لحاظ سے بھی مختلف رہے، ڈاکٹر حبیب الحق صاحب کی عمر ۶۵ سال اور مولانا عبدالغفار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ۹۵ سال ہوئی۔ ان میں سے اول الذکر کا انتقال آغاز ماہ شوال میں اور آخر الذکر کا اختتام ماہ شوال ۱۴۱۸ھ کو ہوا۔

ندوۃ العلماء کے لائق فخر فرزندوں میں شمار کئے جانے والے اور مغربی فکر وادب سے محققانہ واقفیت رکھنے والے اسلامی فکر کی برتری کو عملی سطح پر سمجھنے والے فاضل ڈاکٹر سید حبیب الحق صاحب ندوی پروفیسر السنہ مشرقیہ ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ نے تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی، انھوں نے اپنی عمر کے عملی حصہ کو مشرق ومغرب کے علمی سرمایہ کے مطالعہ اور ان کے مفید پہلوؤں سے فائدہ اٹھانے میں صرف کیا، اور اپنے علمی مطالعہ کو اپنے بے شمار مضامین میں اور متعدد بلند پایہ تصنیفات میں پیش کیا۔

ڈاکٹر صاحب بہار میں ۲۴ر جولائی ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئے اور انھوں نے ندوۃ العلماء میں داخل ہوکر عالمیت کی سند حاصل کی پھر انھوں نے عصری تعلیم کی طرف توجہ کی اور اسی میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے، پھر سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا پھر ہارورڈ یونیورسٹی

امریکہ سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اسی یونیورسٹی میں کچھ مدت لکچرر بھی رہے اور امریکہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹی سطح کی علمی سوسائیٹیوں کے رکن منتخب ہوئے اور یورپ وایشیا کے مختلف ملکوں کے دورے کئے۔

جنوبی افریقہ میں اردو فارسی، عربی کے شعبہ میں استاد اور صدر شعبہ ہوئے جس کا سلسلہ وفات کے دن تک قائم رہا، وہ ذیابیطس کے مریض تھے، مرض نے بتدریج شدت اختیار کی جس سے ان کے گردے بہت زیادہ متاثر ہوئے جس کا اثر کمزوری اور قلب کی شکایت کی صورت میں ظاہر ہوا بالآخر یہ ان کی وفات پر ختم ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے مشرقی اور مغربی فکر وادب کا محققانہ مطالعہ کیا تھا، اور ان پر تقابلی کام بھی کیا، وہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں پیش آنے والے تغیرات واحوال کا جائزہ لیتے اور دنیا کے مختلف ممالک میں ان کی صورت حال پر عالمانہ نظر ڈالتے اور اپنے نتائج فکر کو اپنے مضامین میں بہت اچھے انداز میں پیش کرتے تھے، پندرہ روزہ تعمیر حیات کے اول دور میں جو مولانا سید محمد الحسنی مرحوم ومولانا سعید الرحمٰن صاحب اعظمی کی ادارت میں تھا، ان کے یہ مضامین مسلسل شائع ہوئے، مولانا محمد الحسنی مرحوم سے ان کے قریبی تعلقات تھے، اس تعلق نے بھی ڈاکٹر صاحب کی تعمیر حیات سے وابستگی میں اضافہ کیا تھا پھر یہ ربط وتعلق تعمیر حیات کے بعد کے ادوار میں بھی قائم رہا۔

ڈاکٹر صاحب تقسیم ہند کے بعد ہی پاکستان منتقل ہوگئے تھے اور ان کی شہریت پاکستانی ہوگئی اس کی وجہ سے ہندوستان میں ان کا قیام ختم ہوگیا تھا، آمد بھی بڑے عرصوں کے بعد ہوتی تھی، البتہ تعمیر حیات کے ذریعہ ان کے تعلق کا سلسلہ قائم تھا، نیز ان کا عقیدت کا تعلق ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بھی تھا، ان کے ہندوستان کے سفروں میں جو کم تعداد میں ہوئے حضرت مولانا سے ملاقات اور ان کے پاس کچھ وقت گذارنے کا مقصد بھی ہوتا تھا اس طرح اپنے دوسرے رفقاء تعلیم اور اپنے قدردانِ علم سے ملاقات کا موقع نکلتا۔ وہ اس طرح ندوۃ بھی آئے اور کچھ روز قیام کرتے اپنے وطن مونگیر

بہار بھی جاتے اور اپنے اس سفر میں جو ان کا آخری سفر ثابت ہوا رمضان المبارک میں کیا تھا تا کہ رمضان المبارک کے کچھ دن وہ اپنے شیخ ومرشد روحانی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کی خدمت میں گزاریں اور بڑا اچھا وقت انہوں نے ان کے پاس گزارا، اور اہتمام سے ان کی مجالس میں شرکت کی انہوں نے انگریزی میں اپنی ان محبوب شخصیت اور شیخ ومربی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق اور اپنے مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے متعلق انگریزی میں کتابیں بھی تصنیف کیں، یہ ان کی خوبی کی بات تھی کہ وہ جہاں کہیں گئے ان کو حضرت مولانا اور ندوۃ العلماء سے گہرا تعلق برقرار رہا۔

عالمی رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے بعد وہ اس کے بھی رکن بنے بلکہ جنوبی افریقہ کے حلقہ کے وہ ناظم منتخب کئے گئے، انھوں نے رابطہ کے اپنے حلقہ سے انگریزی بلیٹن کے ایک حصہ کو ادب اسلامی کے مقصد کے لیے مخصوص کرایا جس میں وہ مفید مواد پیش کرتے تھے۔ رابطہ ادب اسلامی کے مختلف مرکزوں سے جو بلیٹن یا رسالے نکل رہے ہیں ان میں تنہا ڈاکٹر حبیب الحق صاحب کا بلیٹن انگریزی زبان میں ہوتا تھا۔

ادب کے موضوع پر ان کے کئی خطبات بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئے جن میں خاص طور پر مغربی ادب کو موضوع سخن بنایا، ان خطبات۔ میں انھوں نے یہ ثابت کیا، مغربی ادب کے متعلق یہ جو خیال ہے کہ وہ نامذہبی وسیکولر ہوتا ہے، غلط ہے، انھوں نے مغربی ادب کے متعدد نمونے بطور دلیل پیش کئے اور یہ ثابت کیا کہ مغربی ادب نگاروں کا ادب عیسائی رجحان سے خالی نہیں اور ان کا معروضیت کا دعویٰ ان کے ادب کے نمونوں سے غلط ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اوقات کو علمی کام میں بہت توجہ کے ساتھ لگایا اور تحقیق علمی کے معیار کو قائم رکھنے کے کا پورا خیال کیا، اس طرح ان کی علمی وتحریری خدمات بڑی قابلِ قدر اور مفید رہیں، اور وہ اپنے شاگردوں اور خورد اہل علم کے لیے ایک مفید نمونہ چھوڑ گئے۔

مولانا معین اللہ ندوی اندوریؒ

سال رواں عالم اسلام کے مختلف حصوں میں ملت اسلامیہ کی متعدد اہم علمی و دینی شخصیتوں نے رحلت کی۔ ان ہی میں ایک رحلت ہندوستان میں مولانا قاضی محمد معین اللہ صاحب ندوی کی ہے۔ جنھوں نے ۱۹۵۲ء سے استاد اور نگرانی طلباء کے منصب سے خدمت علم و دین کا آغاز کیا تھا، پھر ناظر شعبہ تعمیر و ترقی پھر نائب ناظم ندوۃ العلماء ہوئے اور نہایت اخلاص اور جذبہ کے ساتھ دینی تعلیم اور دعوت وارشاد کے مقاصد کو بروئے کار لانے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی لگادی۔

مولانا مرحوم نائب ناظم ہونے کے بعد سے ندوۃ العلماء کے انتظام وانصرام کے بڑے ذمہ دار تھے، اور انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو فعال انداز سے انجام دیا، نیز ندوۃ العلماء کی ترقی اور توسیع کی برابر فکر کرتے رہے اسی کے اثر سے دارالعلوم میں کئی دارالاقاموں کا اضافہ ہوا، مسجد کی توسیع ہوئی، ہر وقتی اسٹاف اور اہم اساتذہ کی رہائش گاہوں کی فکر اور تعمیر اور ندوۃ العلماء کا مالی استحکام ان کی ترجیحی کوششوں میں تھا، اور الحمدللہ انھوں نے اپنی ان کوششوں میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ندوۃ العلماء میں درجہ حفظ کا مضبوط انتظام پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ملحقہ مدارس کے قیام وانضمام کی فکر و کوشش ان کی تعلیمی و دینی کارگزاریوں کا قابل قدر اور اہم حصہ ہے۔

وہ بڑے دینی جذبہ کے آدمی تھے، مرکز نظام الدین دہلی کے ذمہ داروں سے قریبی ربط رکھتے تھے اور ان کے کام کو تقویت دینے اور ابتدائی دینی تعلیم کے مدارس کے قیام کو ملت اسلامیہ ہند کی ایک اہم ترین ضرورت سمجھتے ہوئے اس کے لیے ضروری فکر کی۔ وہ ان کے قیام کی ترغیب دیتے اور خود بھی جو فکر ہوسکتی کرتے تھے، اسی کے ساتھ طلباء علوم دین کے تربیتی پہلو کی طرف توجہ دلاتے اور اس کے لیے ضروری کوشش کی فکر رکھتے تھے۔

دعوتی تبلیغی کام سے ان کو صرف مناسبت ہی نہیں تھی وہ اس کے پُر جوش داعی تھے،

اور بہت سی دینی نقائص اور کمزوریوں کا علاج وہ اس میں کچھ وقت فارغ کر کے نکلنے میں سمجھتے تھے، اس لیے لوگوں کو اس کی طرف راغب کرتے اور اس کے لیے جذبہ پیدا کرتے، ربانی علماء اور بزرگوں میں انھیں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڑھی کی توجہ اور تعلق خصوصیت سے حاصل رہی، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بھی استفادہ اور خدمت کا موقع ملا اور ان کی دعائیں اور توجہات حاصل کیں۔

آج وہ ہم میں نہیں رہے اور اپنے محبین اور قدردانوں کو رنجیدہ چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملے، جہاں ان کو ان کی نیکیوں اور خدمت دین وعلم کی بہترین جزا ملے گی۔ اور وہ اپنے بعد آنے والوں کے لیے اپنی بڑی اچھی یادیں چھوڑ گئے، جو عرصہ دراز تک یاد رکھی جائیں گی۔

مولانا مرحوم کو دو سال قبل کولہے کے قریب کی ہڈی ٹوٹ جانے سے صاحب فراش ہونا پڑ گیا تھا، اسی درمیان ان کی اہلیہ صاحبہ حلق کی ایک تکلیف سے گذر رہی تھیں جو ان کے انتقال کا سبب بنی، مولانا نے ان کی علالت کے زمانہ میں علاج اور تیمارداری کی بڑی فکر کی۔ چنانچہ ان کے انتقال کے واقعہ نے مولانا کی صحت پر مزید اثر ڈالا اور مولانا کی علالت بڑھتی چلی گئی، اسی حالت میں دو سال گزرے اور مولانا کی صحت بہتر نہ ہو سکی۔ بالآخر وقت موعود آ گیا اور ۲۳ راگست ۱۹۹۹ء کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انتقال کے وقت مولانا کی عمر تقریباً ۸۰ سال تھی۔ مولانا نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، پھر اسی سے متعلق ہو گئے اور تاحیات اسی کی خدمت میں مشغول رہے۔

مولانا مرحوم نے ندوۃ العلماء میں ۱۹۴۳ء مین تعلیم سے فراغت حاصل کی، ان کا دارالعلوم میں طالب علمی کے آغاز سے ہی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء سے شاگردی کا عزیزانہ تعلق قائم ہو گیا تھا، جو ان کی دعوت وتبلیغی سرگرمیوں میں ان کی رفاقت کا ذریعہ بنا اور پھر طالب علمی سے فراغت کے بعد بھی جاری رہا۔ اس طرح وہ ان کے تعلیمی ودعوتی کاموں میں تاحیات ان کے دست راست رہے، تعلیم سے آٹھ نو سال بعد ان

کا ندوۃ العلماء میں بحیثیت نگراں طلباء مدارس ۱۹۵۲ء میں تقرر ہوا اس سے کئی سال قبل مولانا علی میاں کے مشورہ سے انھوں نے دعوتی مقصد سے حجاز میں دو سال گزارے تھے اور یہ اس زمانہ میں ہوا تھا جب سفر کے وسائل بھی مشکل سے حاصل ہوتے تھے اور سعودیہ میں دولت کا وہ دور بھی نہیں شروع ہوا تھا جو بعد میں ہوا۔ لہٰذا یہ ایک اخلاص اور جذبہ کا کام تھا۔ انھوں نے اس قیام کے دوران دعوتی کام میں وقت گذارا اور اس درمیان بھی حضرت مولانا مدظلہ سے برابر رابطہ رکھا۔ اس میں مولانا کے ساتھ تقریباً ۷۔۸ ماہ تک مصر اور دیگر عربی ممالک کا دورہ کیا۔ حجاز سے واپسی پر ۱۹۵۲ء وہ ندوۃ العلماء میں استاد و نگراں اور ۱۹۵۷ء میں ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی مقرر ہوئے پھر کئی سال بعد نائب ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے ندوۃ العلماء کی تعلیمی توسیع کی طرف جو خصوصی توجہ دی اس میں مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ ان کے برابر معاون رہے اور مولانا کی سرکردگی میں ندوۃ العلماء کی تعمیری اور مالی ترقیات کے لیے پوری فکرمندی اور منصوبہ بندی سے کام لیا۔ ندوۃ العلماء میں نمایاں توسیع کا سلسلہ قائم ہو گیا، جس میں ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ندوۃ العلماء نے بڑی ترقی کی۔ یہ ترقی احاطۂ ندوۃ العلماء کے اندر اور احاطہ کے باہر دونوں طرف انجام پائی۔ شعبۂ تعمیر و ترقی کے تحت یہ کام انجام پائے، جس میں مولانا معین اللہ مرحوم کی توجہ و کوشش کا بنیادی طور پر دخل رہا۔

انھیں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کو راحت اور سکون پہنچانے کی بڑی فکر رہتی تھی، وہ اس کے لیے جو ندوے میں کر سکتے وہ کرتے تھے، رائے بریلی میں بھی جہاں مولانا کا زیادہ سے زیادہ قیام رہا کرتا تھا فکر کرتے۔ اور وہ مولانا کے منشا اور ان کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان امور کی انجام دہی کرتے، جس کو وہ ضروری محسوس کرتے رائے بریلی میں مولانا کی خدمت میں تربیت و استرشاد کے لیے آنے والوں کا نظم ہو (بالخصوص رمضان کے دنوں میں) اور مدرسوں کے قیام کا مسئلہ ہو اور پھر ان کو ترقی دینے کی فکر، ان سب میں مولانا معین اللہ صاحب اپنے مفید مشوروں اور توجہ سے شریک رہے، مولاناؒ کو ان

سے جو تعلق رہا اس کو اس سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ مولانا نے انھیں عزیزی الاعز اور حبیبی الاحب کے الفاظ سے اپنے بعض خطوط میں یاد کیا ہے۔

مولانا مرحوم اپنی عام صحت میں شروع سے کمزور رہے اور آخری عمر میں پیر کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے بالکل صاحب فراش ہو گئے اور بالآخر اس جہانِ فانی سے جہانِ باقی کی طرف رحلت کی۔ چار فرزند مولوی عبید اللہ (۱)، مولوی محمد یحییٰ ندوی، مولوی عبداللہ ندوی، مولوی عطاء اللہ ندوی اور دو صاحبزادیاں اپنے پیچھے چھوڑیں، مولوی محمد ہارون ندوی اندوری ناظر کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور عرفان ن مولانا البرکات فاروقی ندوی ان کے داماد ہیں، اور متعدد تعلیمی ادارے اور مردانِ کار اپنی یادگار میں چھوڑے، انھی میں ایک یادگار مدرسۃ الفلاح (اندور) ہے جو ان کے وطن میں ہے اور اس کا نظم ونسق ان کے ہی لائق صاحبزادگان دیکھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے اور قبول فرمائے، اور ان کی خدمات پر انھیں اجر جزیل عطا کرے۔

---

(۱) افسوس کہ مولوی حافظ عبید اللہ ندوی اندوری نے بھی علالت کا ایک عرصہ گزار کر اندور میں ہی ماہ رمضان المبارک ۱۴۳۲ھ کو انتقال کیا، وہ بھی کارگزار شخص تھے مدرسۃ الفلاح کے ذمہ دار اور تعلیم ودعوت کے کام سے دلچسپی رکھنے والے تھے اور ہم لوگوں کے لئے گھر کے فرد کی طرح تھے غفر اللہ تعالیٰ ورحمۃ واسعۃ (م)

مولانا شہباز احمد اصلاحیؒ

مولانا شہباز احمد اصلاحی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی عمر کے آخری دور میں حدیث وقرآن کی تدریس کی مشغولیت میں رہنے کے بعد اس دارفانی سے دارباقی کو منتقل ہوئے، اوران کے انتقال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ایک کامیاب استاد کے رخصت ہوجانے کا نقصان اٹھایا۔ مولانا ایک خاموش اور مخلص خادم علم ومدرس کی حیثیت سے طلبہ کو فائدہ پہنچاتے تھے، وہ اپنی تدریس کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ طلبہ میں علمی اور دینی شوق اور جذبہ بھی بڑھانے کی فکر رکھتے تھے، ایک سادہ مزاج، متوازن الفکر عالم دین تھے۔ سادہ انداز زندگی رکھتے تھے، اور طلبہ کی تعلیم وتربیت میں بھی ان کا یہ سادہ انداز عمل ظاہر ہوتا تھا، وہ ان کے فائدے کو پیش نظر رکھتے تھے، ملنے جلنے میں بھی تکلف یا برتری اختیار کرنے کا انداز نہیں تھا۔

ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی تعلیم جماعت اسلامی کی مخصوص درسگاہ ''مدرسۃ الاصلاح'' میں ہوئی تھی، پھر وہاں وہ استاد بھی رہے تھے، اور جماعت اسلامی کے رکن بھی تھے، لیکن یہ بات ان کے لیے مانع نہیں بنی کہ صحیح تصوف وارشاد کے حامل بڑے علماء سے بھی وہ ربط رکھیں، اوران کی خصوصیات وارشاد وتربیت سے بھی فائدہ اٹھائیں، چنانچہ مشہور ربانی عالم اور بزرگ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری رحمۃ اللہ علیہ سے فیض اٹھایا۔ اور بعد میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ربط قائم کیا، اور جب تک صحت اس قابل رہی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں رمضان کے زمانے میں آکر رہیں، اور رمضان کے معمولات میں آکر شریک ہوں، اس کو معمول بنائے رکھا، بلکہ رمضان میں اپنے دورانِ قیام مسجد میں ہونے والی جماعتوں کی امامت بھی کرتے رہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

دوسرے امامت کرنے والوں کی موجودگی میں انھیں کو آگے بڑھاتے تھے۔ رمضان میں ندوۃ العلماء کے طلبہ، اساتذہ اور مولانا علی میاںؒ کے دیگر مسترشدین میں سے جو حضرات آتے علم دین کے پہلو کے لحاظ سے ان کو فائدہ بھی پہنچاتے، اور درس کی ذمہ داری بھی انجام دیتے، اور یہ سلسلہ ان کی معذوری صحت تک جاری رہا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ تدریس میں ان کی وسعت علمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو علوم دینیہ کی مختلف موضوعات کے اسباق سپرد کیے جاتے، اور وہ بہت مناسب سطح سے ان کا حق ادا کرتے، اس طرح ان کی علمی افادیت صرف ایک محدود موضوع سے وابستہ نہیں تھی، وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء آنے سے پہلے جب مدرسۃ الاصلاح میں استاد تھے تو ان کے ذمہ خصوصی طور پر حدیث شریف کا موضوع تھا، وہ وہاں شیخ الحدیث کی حیثیت رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی منشا پا کر وہ اپنے وطن سے بہت دور صوبہ کرناٹک کے علاقہ بھٹکل میں جامعہ اسلامیہ میں تدریسی خدمت انجام دینے کے لئے ممبئی گئے اور وہاں کچھ سال رہ کر تعلیمی و تربیتی فائدہ پہونچایا اور وہاں کے لوگ ان سے خاصے مانوس بھی ہوئے اور ان کی قدر ہوئی اس کا اظہار بعض ان مضامین سے بھی ہوا جو ان کے بعض وہاں کے شاگردوں نے لکھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء آنے پر حدیث کے ساتھ ساتھ علوم حدیث اور قرآن مجید کے تعلق کے اسباق کے علاوہ دیگر موضوعات میں بھی جس کی ضرورت محسوس کی جاتی اس میں ان پر ذمہ داری ڈالی جاتی، اور وہ اس کو بطریقۂ احسن پورا کرتے اور لائق قدردانی کام انجام دیتے۔

ان کی قیام گاہ دارالعلوم کے احاطے میں تھی، لہٰذا غیر تدریسی اوقات میں طلبہ ان سے بے تکلف ملتے اور استفادہ کرتے، اور شام کے اوقات میں جب کہ عام طور پر لوگ ٹہلتے یا بے تکلف مجلسی گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں، مولانا مسجد کے سامنے بالکل رہگزر پر ایک چبوترے پر بیٹھ جایا کرتے تھے، اور لوگ ان سے بے تکلف ملتے تھے، اور ان کی گفتگو سے

فائدہ اٹھاتے تھے، مولانا مرحوم طبیعت کے سادہ اور بے تکلف معاملہ رکھنے والے اور ہمدردی وخیر خواہی کا جذبہ رکھنے والے تھے، چنانچہ ان سے ہمہ جہت فائدہ اٹھایا جاتا تھا، وہ انگریزی زبان اور ہندی سے بھی واقف تھے، اور شاعری پر بھی ان کو دسترس حاصل تھی، اس لیے بھی وہ اپنے دوستوں اور طلبہ میں مقبول رہے، اور شہباز ہندی تخلص رکھتے تھے، ان کا ایک شعر ہے:

ہم نیکی کے جانباز سپاہی نیکی کو پھیلائیں گے
ہم مومن ہیں، ہم مسلم ہیں، ہم نیکی پر مرتے ہیں

اس طریقے سے انھوں نے اپنی زندگی علم کی خدمت اور دینی تعلیم وتربیت کے راستے میں کامیاب طریقے سے گزاری، اور اپنے تعلق والوں اور جاننے والوں میں بہت اچھی یادیں چھوڑ کر اس عالم سے عالم آخرت کو ۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ کو منتقل ہوئے، انھوں نے زندگی کی ۷۷ منزلیں اس دنیا میں گزاریں، اللہ تعالیٰ ان پر اپنے رحم وکرم کی بارش کرے، اور ان کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفہ بدلہ عطا فرمائے، وہ اپنی یادگار ایک فرزند کی صورت میں مولوی صہیب ندوی چھوڑ گئے، جو سعید وصالح ہیں اور دبئی میں مشغولیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشیؒ

محترمی جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے ۲۶/ اگست ۲۰۰۳ء کو اس جہانِ فانی سے جہانِ باقی کو رحلت کی، إنا للّٰہ و إنا إلیہ راجعون، ڈاکٹر صاحب نے سن شعور کو پہنچنے کے وقت سے ہی ملت کے صلاح وفلاح کی فکر کو اپنی فکر بنایا، اور اپنے محدود حلقہ ہی میں اصلاح ودعوت کے کام میں دلچسپی ظاہر کی، پھر یہ سلسلہ برابر قائم رکھا، اور ملت اسلامیہ کی تعمیری واصلاحی تحریکوں میں اپنی صلاحیتوں اور ضرورت عمل کے مطابق نہ صرف یہ کہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور ساری زندگی پوری فکرمندی کے ساتھ اس میں لگے رہے، بلکہ ملت کے متعدد سماجی وتعلیمی پہلوؤں میں قائدانہ کردار انجام دیا، وہ ایک بصیرت رکھنے والے رہبر اور ملت کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے کے لیے ہر وقت مستعد اور کارفرما رہنے والے فرد تھے، طالب علمی کے زمانہ میں اپنے وطن پرتاپ گڑھ میں نوجوانوں اور طلباء میں دینی فضاء بنانے کے لیے کوشاں رہے، اور تعلیم سے فارغ ہوکر ملکی حالات کے نشیب وفراز میں ملت اسلامیہ کے دینی وملی مقام بلند کے تحفظ کے کاموں میں پوری توجہ سے شرکت کرتے رہے تھے، اس سلسلے میں ان کا ربط وتعلق دیگر قائدین ملت سے قائم ہوا، ان میں برگزیدہ دینی شخصیتوں خاص طور پر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہما، اور عصری شخصیتوں میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور اسی سطح کی دیگر مشہور شخصیتیں تھیں، علماء کے طبقہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کا شروع ہی سے قریبی ربط تھا، حضرت مولانا سے اس ربط ہی کا اثر تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ملی اور دینی جدو جہد میں جو میدان اختیار کئے ان سب میں ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے اچھے معاون بنے، حضرت مولاناؒ کو بھی ان سے قریبی انس اور ربط تھا، اور مولانا کو ان پر بڑا اعتماد رہتا تھا، مولاناؒ کے اختیار کردہ ملی ودینی کاموں کے خاص میدان عمل میں ندوۃ العلماء، مجلس تحقیقات

ونشریات اسلام، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اصلاح معاشرہ اور پیام انسانیت کے ادارے رہے، ان سب میں ڈاکٹر صاحب پورے تعلق خاطر اوران کاموں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے حضرت مولاناؒ کے ساتھ شریک رہے، دعوت وتبلیغ کی تحریک سے بھی ڈاکٹر صاحب کو دلچسپی رہی، اوراس میں شرکت کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی عملی زندگی ان کے سماجی و دینی کاموں کے آغاز کے وقت سے وفات کے وقت تک تقریباً پچپن سال پر محیط رہی، ہندوستان میں مسلمانوں کے تعلیمی، دینی اور سماجی میدانوں میں ایسی تحریکوں اور کوششوں کا عمل دخل رہا جن کا تعلق ملت اسلامیہ ہند کی اسلامی خصوصیات کو چیلنج کا سامنا کرنے سے رہا تھا، اس میں تعلیمی میدان میں اکثریتی طبقہ کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کا اسلامی مزاج ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں، اوران کا مقابلہ مسلمانوں کے اہل غیرت لوگوں نے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے کیا، ان میں پیش پیش قاضی محمد عدیل عباسی اور حضرت مولانا اوران کے ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی رہے، جس میں دیگر اہم شخصیتوں کی وفات کے بعد تنہا ڈاکٹر صاحب اس کے اہم ذمہ دار ہوئے، جس کو انھوں نے انتقال کے وقت تک نبھایا، کونسل کے وہ جنرل سکریٹری رہے، اسی طرح سماجی و ثقافتی میدان میں مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی تحفظ کو ختم کرنے کی کوششیں فسادات کے ذریعہ کی گئیں، اس کے مقابلہ کے لیے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا، جس نے اس معاملہ میں اہم کردار انجام دیا، ڈاکٹر صاحب اس کے نمایاں رہبروں میں خاص طور پر مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ نمایاں طریقہ سے شریک رہے، اوراس میں مختلف موقعوں پر انھوں نے مولانا علی میاں صاحب کی نمائندگی بھی کی، اسی طرح اس ملک میں اسلامی شریعت کے تحفظ کو سخت خطرہ لاحق ہوا جس کے مقابلہ کے لیے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا، جس کے مشوروں اور کارگزاریوں میں ڈاکٹر صاحب نے پورا حصہ لیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کا ربط وتعلق چونکہ ابتداء ہی سے ہوگیا تھا اس لیے

وہ بتدریج ان کے لیے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہوگئے تھے، اسی طرح حضرت مولاناؒ کے دیگر معاونین اور اعزہ کے ساتھ بھی ان کا بہت برادرانہ تعلق قائم ہوگیا تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کے برادر اکبر اور شہر کے ممتاز معالج ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحبؒ سے بھی ان کا تعلق قائم ہوا، اور بتدریج بڑھتا گیا، ان سے ان کا یہ تعلق بحیثیت معالج اور بحیثیت تیماردار اور ان کی شخصیت کے قدرداں کی حیثیت سے رہا۔ اور ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر صاحب ہی نے ان کے مطب کو بحیثیت معالج کے سنبھالا، اس طرح ڈاکٹر صاحب کے تعلقات ان کے پورے حلقہ کے لوگوں سے بہت قریبی ہوگئے، اس قرب کی وجہ سے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے برادر اکبر رحمۃ اللہ علیہما کے چھوٹوں سے جن میں خاص طور پر یہ راقم الحروف اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے صاحبزادے مولانا سید محمد الحسنی تھے، ڈاکٹر صاحب کا برادرانہ اور دوستانہ تعلق قائم ہوا، اس میں خاص طور پر ملی معاملات میں ہم مذاقی اور وحدت فکر کا عمل رہا، اسی لیے مولانا سید محمد الحسنیؒ کا جب انتقال ہوا، جو ایک طرح سے کم عمری میں ہوا تھا، کیونکہ ان کی عمر اس وقت صرف ۴۴ سال کی تھی، جس کی بناء پر سب کو ان کے جیسے باصلاحیت نوجوان کے انتقال پر بہت رنج ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس خاص طور سے اپنے ایک دوست اور بھائی کے رخصت ہوجانے کا ہوا، اور انھوں نے اسی طرح کا اظہار اپنے ایک مؤثر مضمون میں ندائے ملت میں کیا۔

لکھنؤ میں ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی اور ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کا امت کے سماجی اور ثقافتی مسائل میں ایک مضبوط ارتباط قائم ہوگیا تھا، اس کے تحت فکری اور اطلاعاتی مقاصد کے لیے پہلے ایک روزنامہ ''قائد'' نکالا گیا، پھر ہفت روزہ ''ندائے ملت'' کا اجراء ہوا، ندائے ملت سے ڈاکٹر صاحب کا بتدریج ایسا گہرا تعلق قائم ہوا کہ انھوں نے اس کو بالکل اپنا ایک بہت عزیز ترجمان بنالیا، جس کو وہ اپنی زندگی کے آخر تک نبھاتے رہے۔

تعلیمی میدان میں دینی تعلیمی کونسل کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے

عصری تعلیم سے بچوں کو آراستہ کرنے کے لیے ایک انگریزی میڈیم اسکول نورالاسلام اسکول کے نام سے قائم کیا، اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کی ضرورت کی تکمیل کے لیے ایک معیاری اقامتی ادارہ جامعہ نورالاسلام کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے لڑکیوں کی دینی تعلیم کے رجحان کو تقویت ملی اور فروغ حاصل ہوا۔ یہ ادارہ وقیع انداز میں کام کررہا ہے، اس میں ڈاکٹر صاحب کو بڑی معاونت ان کی اہلیہ صاحبہ اور بڑی صاحبزادی سے حاصل رہی جو کہ جاری ہے، اور ان دونوں اداروں کے اچھے اثرات اور نتائج ظاہر ہورہے ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندویؒ نے جب یورپ کا پہلا سفر کیا جس میں ان کو جنیوا کے اسلامک سینٹر کے ٹرسٹی بورڈ میں بحیثیت رکن کے شریک ہونا تھا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا رفیق سفر بنایا، اور قابل معاونت موقعوں پر ان کی معاونت سے فائدہ اٹھایا، اس سفر میں حضرت مولاناؒ نے اسپین کا بھی سفر کیا، اور اس سفر سے ایک مسلمان اور ایک مؤرخ کی حیثیت سے فائدہ اٹھایا، اور ایک داعی کی حیثیت سے وہاں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جس کا تذکرہ اور جس کی یاد عرصہ تک اسپین کے حالات سے سابقہ پڑنے والے لوگوں کے یہاں محسوس کی جاتی رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر اپنے تاثراتی مضمون میں جو ''تعمیر حیات'' کے لیے انھوں نے لکھا تھا اپنے اس تاریخی سفر پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ملت اسلامیہ کے فروغ اور اس کے اعلیٰ مقام کے تحفظ کے سلسلے میں بڑے مخلصانہ جذبہ اور نہایت فکرمندی کے ساتھ کام کیا، بلکہ اپنی زندگی کو اس کے لیے وقف کردیا تھا، ان کو بحیثیت معالج کے بڑی شہرت حاصل تھی اور علاج و معالجہ ان کا معاشی ذریعہ تھا، لیکن ملت کی ضرورت کے لیے وہ بے تکلف وقت نکالتے اور سفر کرتے، اور اپنی طبی مشغولیت کو جو ان کی معاشی مشغولیت تھی اس کے لیے قربان کرتے رہتے تھے، وہ ملت کی ضرورتوں پر جہاں تقاضہ ہوتا تھا بڑی فیاضی کے ساتھ خرچ بھی کرتے تھے، ممتاز دینی مقام رکھنے والوں سے عقیدت و محبت کا تعلق رکھتے تھے، اور خود بھی ان کے دیندارانہ طریقۂ حیات کو اختیار کرنے کا اہتمام کرتے تھے، ان کا ظاہری حال علماء کی طرح تھا، اور

باطنی طور پر عبادت اور صلاح وتقوی کے وہ بڑے پابند تھے، تہجد گذار اور خیر وخیرات کا بھی اہتمام تھا، وہ اپنی اجتماعی اور دینی کوششوں میں اخلاص اور رضائے الٰہی کی طلب پر عامل تھے، ملت کی جن ضرورتوں کو اساسی سمجھتے تھے اپنے آپ کو ان میں کھپانے کا رویہ اختیار کرتے تھے، اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں انھوں نے دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کو تو بالکل اوڑھ لیا تھا، اور اپنے کو اس میں پوری طرح مشغول کر دیا تھا۔

بہت سے واقعات ایسے پختہ مقدرات ہوتے ہیں جن میں کسی بھی انسان کو خواہ کتنا ہی ولی اور بزرگ ہو اختیار نہیں ہوتا ہے، اسی میں عمر کا معاملہ بھی ہے، اس لیے اس سانحہ میں بھی صبر اور رضاء بالقضاء ہی اختیار کرنا ہے، اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی کوششوں اور ان کے اعمال صالحہ کا اضعافاً مضاعفہ اجر عطا فرمائے، اور جو لغزشیں ہوں ان کو معاف فرمائے۔

انھوں نے اپنے بیشتر صاحبزادوں کو دینی تعلیم دلائی، اور بنیادی ضروری علوم سے بھی آراستہ کیا، وہ سب سعادت منداور صالح زندگی والے بنے، ان میں خاص طور پر ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد شعیب قریشی انہی کے طریقۂ کار اور ان کے اختیار کردہ راستہ پر ہیں (۱)۔ دیگر صاحبزادوں میں مولوی محمد صہیب قریشی، مولوی محمد جنید قریشی اور مولوی محمد عبید قریشی ہیں، اور تینوں ندوی ہیں، اور اس کے ساتھ تینوں عصری تعلیم سے بھی آراستہ ہیں، اور سعادت مند ہیں، اور یہ سب ڈاکٹر صاحب کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ سب ان کے اچھے جانشیں ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی صاحبزادیوں کے رشتے میں بھی دین کو ملحوظ رکھا، اور اس کی فکر کی، چنانچہ ان کو ندوۃ العلماء کے ایک اچھے فاضل اور علمی شہرت کے حامل صالح نوجوان مولوی ڈاکٹر علی احمد ندوی ان کو بحیثیت داماد کے ملے (۲)۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے سب پسماندگان کو برکتوں اور نعمتوں سے نوازے، اور ان کو اپنے والد رحمہ اللہ کی توقعات کے مطابق بنائے، آمین۔

---

(۱) بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد شعیب قریشی صاحب نے علاج ومعالجہ کی خدمت کے ساتھ ارشاد وتربیت کا میدان بھی اختیار کیا اور وہ شیخ وقت حضرت قاری امیر حسن صاحب کے مجاز ہیں۔ (م)

(۲) مولانا ڈاکٹر علی احمد ندوی صاحب اپنے فقہی خدمات پر انٹرنیشنل فیصل ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں اور ارشاد وتربیت میں شیخ وقت مولانا قاری امیر حسن صاحب مدظلہ کے مجاز بھی ہیں اور جامعہ الملک عبدالعزیز جدہ (سعودی عرب) میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں (م)

پروفیسر عبدالحلیم ندوی گورکھپوریؒ

محترمی ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بڑے ممتاز فرزندوں میں سے تھے، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوران علم وادب میں ترقی کرنے میں کمال پیدا کرنے کا جو جذبہ حاصل کیا، اور علمی وادبی ترقی کا جو آغاز کیا تھا، اس میں وہ بلند معیار تک پہنچے، انھوں نے عربی زبان وادب کو اپنا خصوصی موضوع بنایا، اس میں تدریس وتحقیق وتصنیف کا نہایت قابل قدر کام انجام دیا، آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہے، اس درمیان ایک سال مصر میں قیام کیا۔ انھوں نے ندوۃ العلماء کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ سے ڈگری حاصل کی اور پھر واپسی پر جامعہ ملیہ دہلی میں صدر شعبۂ عربی رہے اور اس کے بعد حیدرآباد میں بیرونی زبانوں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے میں بھی صدر شعبۂ عربی رہے، شام وعلمی حلقوں سے تعلق بھی رہا، اور وہاں کے رجحانات اور افکار کا بھی مطالعہ کیا، اور اپنی بیش قیمت تصنیفات کے ذریعے سے وہاں قدردانی حاصل کی، اور دمشق کے اعلیٰ بین الاقوامی ادارۂ تحقیق اور عربی مجمع علمی دمشق کے ہندوستان کے نمائندہ اور رکن ہوئے، جس پر ان سے قبل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب اور ان سے قبل مولانا سید سلیمان ندوی صاحب فائز ہوئے تھے، یہ ان کے عربی زبان وادب میں باکمال ہونے کی دلیل تھی، انھوں نے اپنے تعلیمی کام کی مدت میں بڑے باصلاحیت شاگرد تیار کیے، اور اپنے سے تعلق رکھنے والوں کو عربی میں استعداد پیدا کرنے میں مفید ترین رہنمائی کی، ان میں اپنے تعلق والوں کو علمی میدان میں آگے بڑھانے کا بڑا جذبہ تھا، انھوں نے ندوۃ العلماء سے جو علمی شوق حاصل کیا تھا، اس کی قدردانی میں ندوۃ العلماء کو برابر یاد رکھا، اور اس سے اپنے رشتے کو برابر قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ندوۃ العلماء

میں ان کے جو رفقاء تھے ان میں سے چند در چند علمی و تحقیقی کام میں ممتاز ہوئے، ان کے رفقاء میں جامعۃ الرشاد کے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی، ندوۃ العلماء کے نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندوی، ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے سابق استاذ اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیمات مولانا عبداللہ عباس صاحب ندوی اور پاکستان میں سابق وزیر امور دینی مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی اور اس طرح ممتاز علمی شخصیتوں کے مالک حضرات ہوئے، جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے تو اس کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی بھی ان کے رفقاء میں تھے، اس تعلق سے وہ مجھ سے بھی محبت فرماتے تھے اور میں ان کو دوہرے تعلق سے دیکھتا تھا، ایک تو ندوے کا فرزند ہونے کا، دوسرے میرے بڑے بھائی کی ان کے ساتھ تعلیمی رفاقت کا، مرحوم کا انتقال اگرچہ بڑی عمر میں ہوا، جس میں انتقال کو کوئی حادثہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ بڑی عمر کا طبعی تقاضا سمجھا جاتا ہے لیکن اس دنیا سے جانے والے کے کمالات اور اس کا لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور زندگی کی ضروری خصوصیات وامتیازات میں نمایاں حصہ ہونے پر اس سے حاصل ہونے والا جو فائدہ ہوتا ہے اس کے انقطاع کو خسارہ محسوس کیا جاتا ہے، اسی بنیاد پر ہم اور ان کے دیگر قدرداں ان کے انتقال کو ایک خسارہ سمجھتے ہیں، یہ خسارہ صرف ایک ممتاز علمی شخصیت کے ہم سے جدا ہوجانے کے احساس کے ساتھ یہ احساس بھی ہے کہ وہ ہمارے ندوۃ العلماء کے حلقے کا بطور خاص خسارہ ہے، ہم ان کے لیے مغفرت اور رحمت کے لیے دعا کرتے ہیں اور یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ ان کے رخصت ہونے سے جو خسارہ ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کا بدل عطا فرمائے۔

مرحوم نے متعدد قیمتی تصنیفات طالبانِ استفادہ علمی کے لیے چھوڑیں جن میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں: (۱) تاریخ ادب عربی (۲) نہایۃ الادب (۳) المراکز العلمیہ وغیرہ جن کی افادیت واہمیت کو ممتاز علمی حلقوں نے بھی سراہا ہے اور جو طالبانِ استفادہ علمی کے لیے بہترین اور معیاری ہیں۔

مرحوم عرصے سے بیمار رہنے لگے تھے اور بیماری کے بڑھنے پر وہ اپنے علمی مشغولیت حسب سابق نہیں رکھ پارہے تھے لیکن دہلی ہی میں جامعہ ملیہ کے علاقے میں رہائش ہونے کی بنا پر جامعہ سے ان کا علمی ربط قائم رہا اور جامعہ کا علمی حلقہ ان سے عربی کے تحقیق وریسرچ سے متعلق کاموں میں طلباء کے لیے رہنمائی ومشورے کا فائدہ اٹھاتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کے چھوڑے ہوئے علمی ورثہ کو علمی کام کرنے والوں کے لیے مفید ذریعہ بنائے۔ آمین۔

پروفیسر عبدالحلیم صاحب ان خوش قیمت لوگوں میں تھے جن کی اسلام کی طرف رہنمائی کی گئی اور وہ پھر اس کے آغوش میں آگئے وہ اگرچہ اس وقت کم سن تھے، لیکن سلامت طبع رکھتے تھے اور اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کو لوگوں کے دلوں میں اسلام کا بیج ڈالنے کی بڑی فکر رہا کرتی تھی اور وہ ایسے لوگوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیتے، اور ان کی پوری فکر کرتے، ان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے یہ خصوصیت برتی، اور ان کی سرپرستی میں رہ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور محنت کر کے ترقیات پائیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے خصوصی رحم وکرم اور عفو ودرگزر کا معاملہ فرمائے اور ان کی خدمات کو قبولیت بخشے۔

مولانا عبداللہ عباس ندویؒ

ندوۃ العلماء کے لائق وممتاز فرزند اور معتمد تعلیم اور علم وادب کی نامور شخصیت حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی افسوس ہے کہ اب ہم میں نہیں رہے، اور اس دینائے فانی سے عالم جاودانی کو منتقل ہوگئے۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھے، یہ علالت آخر میں بڑھتی چلی گئی، بالآخر وہ ہم سب سے جدا ہوگئے، إناللّٰہ و إنا إلیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو اپنی رحمت سے معمور کرے، ان کے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ان کو بلند مرتبہ قبرستان ''جنۃ المعلی'' مکہ مکرمہ میں جگہ ملی، اور ایامِ حج ہونے کی وجہ سے لاکھوں لوگوں نے نمازِ جنازہ ادا کی، نیز انھوں نے انتقال سے قبل باوجود کوما میں ہوجانے کے آخری وقت اللہ اللہ کرتے ہوئے رحلت کی۔

مولانا کی شخصیت اپنے علمی مقام اور بلند علمی مناصب کی بنا پر علمی حلقوں میں مشہور معروف تھی، انھوں نے ندوۃ العلماء میں ماہرین فن اساتذہ سے کسب علم کیا تھا، ان میں سے اکثر علم وادب میں ملک گیر شہرت کے حامل تھے، ان کے اساتذہ میں ایک اہم نام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تھا، جن سے مولانا نے طالب علمی کے بعد بھی ربط رکھا، اور ان کا یہ ربط حضرت مولانا کی زندگی بھر قائم رہا۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تو مولانا ہی ان کے میزبان ہوتے، ان کو آرام پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے اور ان کے لیے پلکیں بچھاتے تھے۔ وہ حضرت مولانا کے ساتھ ان کے کئی اہم سفروں میں ساتھ بھی رہے۔ بزرگوں اور مشائخ میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی توجہات بھی حاصل کیں۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم، رابطہ عالم اسلامی کے مشیر

اور ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے استاد اور ممبر آف لنگوئسٹک سوسائٹی کیمبرج انگلینڈ اور دیگر بہت سے علمی، تحقیقی و تعلیمی اداروں کے رکن اور سرپرست تھے۔ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں کے ماہر اور بڑے مصنف تھے۔ انھوں نے ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد لیڈز یونیورسٹی انگلستان جا کر ندوے کی سند کی بنیاد پر فلسفۂ لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔

تکمیل تعلیم کے بعد ندوۃ العلماء میں ان کو ادب کے شعبہ کا استاد، پھر سربراہ مقرر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں حضرت مولانا علی میاں کی رفاقت میں حجاز مقدس کا ایک اہم دعوتی تبلیغی سفر کیا، ندوے میں ایک عرصہ تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد وہ سعودی عرب منتقل ہوگئے، وہاں جدہ ریڈیو اسٹیشن میں وکیل نشریات شرقیہ کے عہدے رہے، پھر انھیں سعودی شہریت بھی حاصل ہوگئی، لیکن دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا کا رشتہ منقطع نہیں ہوا، اسی تعلق کی بنیاد پر مولانا سال میں کئی بار اپنے خرچ پر ندوہ آ کر کئی کئی ماہ قیام کرتے اور یہاں کی علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے، طلبہ کو درس بھی دیتے اور اساتذہ بھی ان سے استفادہ کرتے۔ مولانا نے ''ذکر و فکر'' کے نام سے نئی دہلی سے ایک مجلّہ بھی نکالا تھا، تعمیر حیات لکھنؤ کے ذمہ داروں میں تھے اور تعمیر حیات میں آپ کے اداریے بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ رابطہ عالم اسلامی کے انگریزی مجلّہ ماہنامہ ''رابطہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی شخصیت کسی بڑے تعارف کی محتاج نہیں، وہ اپنے علمی کاموں اور بلند علمی مناصب کی بنا پر مشہور و معروف تھے، وہ اپنے نمایاں علم و فضل کے ساتھ ایک بڑے صاحب قلم بھی تھے۔ وہ پٹنہ بہار کے مضافاتی قصبہ پھلواری شریف کے ایک موقر دینی و علمی گھرانے کے فرد تھے، اس گھرانے کو وہاں اصلاح و ارشاد کے دائرے میں بلند مرتبہ حاصل رہا ہے، اور اس کا فیض برابر جاری ہے، مولانا کے والد صاحب مفتی محمد عباس صاحب امارت شرعیہ بہار میں مفتی و قاضی تھے، مولانا وہیں ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء) کو پیدا ہوئے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی، پھر لکھنؤ میں

ابتداءً فرنگی محل میں، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی، اور ندوۃ العلماء میں ممتاز طالب علم رہے اور تعلیم کی تکمیل کی۔

مولانائے محترم نے ندوۃ العلماء میں اپنے زمانے کے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان میں سے اکثر علم وادب میں ملک گیر شہرت رکھتے تھے، مزید یہ کہ ندوۃ العلماء علم وادب کے جس امتزاج کو اپنے مستفیدین اور طلباء میں پیدا کرنا چاہتا تھا، اس کی فکر وسرپرستی کا وہ ایک اچھا دور بھی تھا، جو مولانا کو حاصل ہوا۔ مولانا کے اساتذہ میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، جن سے مولانا نے طالب علمی کے بعد بھی ربط رکھا، اور ان کا یہ ربط برابر قائم رہا، بلکہ گہرا ہوتا چلا گیا، اور یہ قریبی تعلق صرف مولانا ہی سے نہیں، بلکہ ان کے متعلقین تک سے ہوگیا، جن کو انھوں نے آخر تک قائم رکھا، اور اس کو حضرت مولانا علی میاں صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے سب اہل تعلق قدر کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا شعبۂ ادب میں استاد مقرر ہوئے اور پھر شعبہ کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ان کے ذمہ ادب کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن کا درس بھی تھا۔ اس طریقے سے مولانا کا ادبی ذوق قرآن مجید کی بلاغت سے استفادہ کردہ ذوق کے ساتھ مل کر دو آتشہ بن گیا تھا، اور اس طرح مولانا کے علم وادب میں دین ودنیا دونوں جمع ہوگئے تھے، اس کو دیکھتے ہوئے ان کی تحریروں میں جو شگفتگی اور افادیت نظر آتی ہے وہ اسی جامعیت کا نتیجہ ہے، اور ان کو اپنی تحریروں پر جو انھوں نے مختلف موقعوں اور مختلف موضوعات پر لکھیں اسلام پسند اور اہل فکر وذوق کی طرف سے برابر داد تحسین ملتی رہی۔

مولانا مرحوم حضرت علی میاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی تجویز ومشورے سے ۱۹۵۰ء میں حجاز میں علمی ودعوتی مقصد سے ایک سال سے زیادہ قیام پذیر رہے، اور اسی وقت سے ان کا وہاں کے اہل علم وادب سے ربط قائم ہوگیا تھا، بعد میں یہی ربط ان کے وہاں مستقل طور پر منتقل ہوجانے کا ذریعہ بنا، اس وقت مجھے بھی ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا تھا، اور میں نے ان کو قریب سے دیکھا اور بہت اچھے اوصاف کا پایا۔

مولانا مذکورہ بالا علمی اسباب کی بنا پر ایک ہمہ داں عالم وادیب اور کامیاب استاد کی حیثیت کے مالک ہوئے۔ مولانا کی تحریر شگفتہ اور علمی فوائد کی حامل ہوتی تھی۔ چنانچہ ان کی تحریریں اور تصنیفات دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں، وہ شروع میں کسی رسالے یا مجلّے کے رئیس التحریر تو نہیں رہے، البتہ اہل تعلق کے مجلّات میں اپنے ذوق علمی وادبی کے نتائج پیش کرتے رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے خود اردو کا ایک مجلّہ نکالنا شروع کیا، جس کا نام ''ذکر وفکر'' رکھا، اور اس کے بند ہوجانے پر متبادل کے طور پر بطور خاص ''تعمیر حیات'' اور دوسرے علمی وادبی رسالوں میں انھوں نے مختلف موقعوں پر مقالے اور اداریے لکھے، یہ اداریئے بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے رہے، اور پسند کیے جاتے رہے۔ مولانا کی تصنیفات میں حسب ذیل کتب قابل ذکر ہیں:

تعلم لغة القرآن الكريم، قاموس ألفاظ القرآن الكريم، ترجمات معاني القرآن وتطور فهمه عند العرب، شرح كتاب النكت في إعجاز القرآن للرماني، شرح المذاهب المنحرفة في التفسير، ردائے رحمت (ترجمہ وتشریح قصیدہ بردہ) عربی میں نعتیہ کلام، پیغمبر اخلاق وانسانیت، قرآن انسانی تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ، تاریخ تدوین سیرت، آسان فقہ، نگارشات، مصائب کا مداوا، امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) کی "الادب المفرد" کا بامحاورہ ترجمہ وتشریح، میر کارواں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شمائل نبوی کا ترجمہ، آداب درود وسلام، آفتاب نبوت کی چند کرنیں اور ابھی ''مشاہدات وواردات'' کے عنوان سے ایک نئی کتاب زیر طبع ہے، ایک دوسری کتاب ''مکررات قرآن'' بھی زیر طبع ہے۔ ایک کتاب سفرنامۂ حیات بھی زیر طبع ہے، اور ایک کتاب تفہیم المنطق ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل ہے۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھی اردو میں کیا، جن میں قابل ذکر "المرتضیٰ" کا ترجمہ اور "روائع من أدب الدعوة" کا ترجمہ ''دعوت وتبلیغ کا معجزانہ اسلوب'' کے نام سے ہے۔

مولانا نے اپنا شروع کا دور ندوۃ العلماء کے استاد اور سربراہِ شعبہ کی حیثیت سے

گزارا تھا، پھر سعودی عرب میں جدہ اور مکہ مکرمہ میں اپنی صلاحیت کے کام انجام دیے، وہ رابطہ عالم اسلامی کے انگریزی مجلّہ کے مدیر بھی رہے، اور ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں زبان وادب کے استاد بھی رہے، اور ریٹائرمنٹ کی عمر ہونے پر وہیں سے ریٹائر ہوئے، اور ریٹائر ہونے کے بعد تصنیفی اور تحریری کاموں میں مشغول ہوگئے، اور متعدد اہم موضوعات پر ان کی تصنیفات سامنے آئیں۔ مولانا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں موقر علمی منصب ''معتمد تعلیم'' کے بڑے منصب پر بھی فائز رہے۔

مولانا کو یوں تو مختلف موضوعات میں دستگاہ حاصل تھی، لیکن زیادہ ان کے خصوصیت رکھنے والے موضوع زبان وادب اور قرآنیات کے موضوع تھے، اور ان ہی دو موضوعات پر انھوں نے زیادہ تر کام کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ کئی تہذیبوں اور کئی ملکوں میں رہنے سے حالات حاضرہ اور مسائل حاضرہ سے بھی ان کو بڑی واقفیت حاصل ہوئی، جس کی جھلک ان کے مضامین میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولانا رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں انتظامیہ کے ایک شعبہ کے ذمہ دار رہے، اور بعد میں رابطہ کے مشیر اور ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں استاد رہے، ان کو وہاں کی وطنیت بھی حاصل ہوگئی تھی، چنانچہ ندوۃ العلماء میں استاد رہنے کے بعد سعودی عرب میں ان کا زیادہ تر قیام مکہ مکرمہ میں رہتا رہا، لیکن اپنے نشو ونما اور تعلیم سے حاصل کردہ ذہن وذوق کے اعتبار سے اور ہندوستان کے اہم گہوارۂ علم وادب یعنی شمالی ہند سے ان کا وطنی تعلق ہونے سے ان کے فکر ونظر میں اس کے اچھے اثرات تھے۔

مولانا نے اپنے صاحبزادگان کو بھی توجہ سے تعلیم دلوائی۔ ان میں سے خاص طور پر دو بیٹوں کو باوجود اس کے کہ مولانا کا باقاعدہ قیام سعودی عرب میں ہوگا تھا، ہندوستان میں رکھ کر ندوۃ العلماء میں تعلیم دلائی، جس کی وجہ سے ان دو بیٹوں کو سعودی وطنیت ملنے میں رکاوٹ پڑ گئی، لیکن مولانا نے اس نقصان کو برداشت کیا۔ یہ دونوں ضیاء عبداللہ اور طٰہٰ عبداللہ ہیں، ان دونوں کے بڑے بھائی سعد عبداللہ اور دونوں سے چھوٹے بھائی حمد اور حمود

نے سعودی عرب ہی میں تعلیم حاصل کی، اور حمد سلمہ نے میڈیکل تعلیم بھی حاصل کی، اور وہیں مقیم بھی ہیں۔

ضیاء عبداللہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعد انگلستان بھی جا کر تعلیم حاصل کی، اور دونوں جگہ کے علمی فائدے حاصل کیے، اور وہ اپنی اس صلاحیت کی بنا پر جو دوہری تعلیم سے ان کو حاصل ہوئی، ترقی کے میدان میں نئے انداز سے بھی آگے بڑھے۔ جدہ میں انھوں نے ایک بڑے درسگاہ بھی قائم کی، جس کو معیاری انداز سے وہ چلاتے ہیں۔ وہ اور ان کے سب بھائی بحیثیت اخلاق وصفات کے بھی ممتاز ہیں، جس کا تجربہ ان کے واقف کاروں کو ہوتا رہتا ہے۔

مولانا اس کاتبِ حروف سے بہت اپنائیت کا رویہ رکھتے تھے، اور ندوۃ العلماء کے کاموں میں بہت تقویت کا ذریعہ تھے، اپنے آخری برسوں میں ندوۃ العلماء برابر آتے اور قیمتی تعاون سے نوازتے تھے، اس کی وجہ سے کاتبِ حروف کے لیے مولانا کی رحلت ایک ذاتی خسارے کا واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنی بیش از بیش مغفرت ورحمت سے نوازے، اور ان کے سب متعلقین کو صبر ورضا بالقضا عطا فرمائے اور ان کی ہر طرح کی مکروہات سے حفاظت فرمائے۔

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

مولانا مجیب اللہ ندوی جن کا نام ایک عرصے سے ملت اسلامیہ ہندیہ کے دینی معاملات کے لیے اہم خدمات انجام دینے والے والوں کی فہرست میں نمایاں دیکھا جارہا تھا اور ان کی تحقیقی اور علم دین کی کوششوں کا فیض ملت کو پہنچ رہا تھا، بالآخر اپنی عمر کی نویں دہائی کے اختتام کے قریب اپنے رفقاء اور محبین سے جدا ہو گئے۔

مولانا مجیب اللہ نے اپنی تعلیم کا اہم اور خصوصی حصہ ندوۃ العلماء میں گزارا، یہ وہ دور تھا کہ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اور سرپرستی میں ان کے منتخب اور ممتاز فیض یافتہ اصحاب علم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیمی فرائض انجام دے رہے تھے، ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت بھی تھی اور ان کے دیگر رفقاء مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا مفتی محمد سعید ندوی و دیگر بڑے اساتذہ تھے، ان حضرات اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا انداز ہ طلبہ میں بحث و تحقیق کا ذوق اور گہری علمی صلاحیت پیدا کرنے کی طرف فکر و توجہ کا تھا، مولانا مجیب اللہ ندویؒ اور ان کے رفقاء دارالمصنفین اعظم گڑھ جاکر حضرت سید صاحب کی سرپرستی میں علمی مطالعہ و تحقیق کے کام سے بھی مستفید ہوئے اور ان کو اس سے اچھی علمی راہ ملی اور وہ اور ان کے کئی رفقاء بتدریج ملک میں اسلام کی علمی اور سماجی خدمت کی راہ میں نمایاں ہوئے۔

مولانا مجیب اللہ ندویؒ میں علم و تحقیق اور تعلیم و تربیت کے میدان میں کام کرنے کا اچھا ذوق تھا، انھوں نے اپنی علمی زندگی کا آغاز دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسے علمی و تحقیقی اسلامی ادارے میں کام کرنے سے کیا، وہاں ان کو علامہ سید سلیمان ندوی کی سربراہی اور رہنمائی ملی، جہاں انھوں علم و تحقیق کے کئی کام انجام دیے، دینی تعلیم کے اداروں کی کمی محسوس کرتے

ہوئے بعد میں انھوں نے اسی اعظم گڑھ شہر میں دینی درسگاہ جامعۃ الرشاد کے نام سے قائم کی، جہاں کا نصاب تعلیم ندوۃ العلماء کی فکر ومنہج کو بنیاد بناتے ہوئے اور وقت کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے مقرر کیا، اور اس کو فکر وتوجہ سے ملک کی تسلیم شدہ درسگاہ کے درجے تک پہنچایا، جو جامعۃ الرشاد کے نام سے نئی نسل کی دینی تعلیم کا فریضہ برابر انجام دے رہی ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کی جو متعدد تحریکیں اور کوششیں ملک میں چل رہی تھیں ان میں بھی نمایاں حصہ لیا، ان میں خاص طور پر کل ہند فقہ اکیڈمی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور ملی کونسل ہے، وہ آل انڈیا ملی کونسل میں ایک بڑے منصب پر فائز بھی رہے، اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پیش نظر جو مسائل تھے ان میں بھی مفید دلچسپی رکھی، اسی طرح تعلیمی، سماجی اور عصری تقاضوں کو انھوں نے سامنے رکھا اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان میں مفید حصہ لیا، اور اپنے امکان کے مطابق مدد پہنچائی۔

مولانا مجیب اللہ ندوی متعدد خوبیوں کے حامل اور اپنے عہد کے نمایاں عالموں اور دینی وملی قائدین میں تھے، ملت کی تقویت اور شریعت کے تحفظ کے لیے جدوجہد کو اپنا فریضہ سمجھا اور جہاں بھی تعاون اور شرکت کا تقاضا دیکھا وہاں اس میں حصہ لیا، وہ صالح اور دیندار شخصیت رکھنے والے اور اپنے علم وفہم کی بنیاد پر رائے قائم کرنے، پُر اعتماد رویہ رکھنے والے تھے، جس رائے سے ان کو اختلاف ہوتا وہ اس اختلاف کے اظہار میں جرأت سے کام لیتے خواہ اس جرأت سے ان کے کسی ہمسر رفیق اور دوست سے اختلاف کا اظہار ہوتا اور خواہ کسی استاد سے بھی اختلاف ظاہر ہوتا، فقہ اسلامی میں ان کو اچھا درک حاصل تھا، قرآن وحدیث کے علوم اور زبان وادب سے اچھی واقفیت تھی جو ان کو ندوۃ العلماء میں اپنی طالب علمی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں اپنی تحقیقی وتصنیفی زندگی سے حاصل ہوئی تھی، جس پر ان کو اعتماد بھی تھا اور اس کی بنیاد پر وہ علمی سمیناروں میں اور دینی اور علمی مجلّات میں اپنی تحقیق وواقفیت کا اظہار کرتے تھے، انھوں نے اپنی علمی اور عملی زندگی میں اپنے سے جونیئر لوگوں کو بھی ان کی تعلیم وتربیت میں اپنی شخصی توجہ سے فائدہ پہنچایا، وہ ندوۃ العلماء میں جب اعلیٰ

. درجات میں تھے تو ان کے ساتھ ان ہی کے ہم وطن ڈاکٹر مشیر الحق بحری آبادی جوان سے بہت خود رتھے، ندوے میں داخل ہوئے تھے، انھوں نے ان کی سرپرستی بھی کی، پھر زندگی بھر ان دونوں کا تعلق رہا، مشیر صاحب نے ترقی کی، .Ph.D ہوئے، کناڈا جاکر مزید تعلیمی ترقی کی، پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بڑے عہدے پر رہے، آخر میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور اس طرح بعد میں ان کی قائم کردہ درسگاہ جامعۃ الرشاد میں تعلیم حاصل کرنے والوں میں متعدد نے ان کی سرپرستی سے فائدہ اٹھایا اور ترقی کی اور اپنا مقام بنایا، جامعۃ الرشاد کا قیام مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی علم پروری اور علوم دین کی تقویت کے جذبے کی بڑی دلیل ہے، اس کو ابتدا سے شروع کر کے عالمی درجے تک پہنچانا اور پھر ملک میں اس کی حیثیت کو تسلیم کرانا یہ مولانا کی فکر ومحنت اور ہمت وبلند حوصلگی کی ایک علامت ہے، ان کی یہ بلند حوصلگی، ملت کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ دینے اور شریعت اسلامی کی نمائندگی، اپنی علمی مہارت اور پختگی کے ذریعے سے کرنے میں انھوں نے نمایاں کردار انجام دیا، جوان کی تصنیفات اور علمی کاوشوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، ملت کے مختلف اداروں میں ان کو شرکت کا موقع ملتا رہا، اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں بھی رہے، اور مسلمانوں کی معروف سماجی انجمن ملی کونسل کے اہم اور ذمہ دار رکن رہے، ملت کے عصری علمی اداروں میں مولانا کا علمی وزن تسلیم کیا جاتا تھا، اور سمیناروں میں مولانا کا قابل قدر حصہ رہتا تھا، انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت وخدمات پر ایک عظیم سمینار بھی منعقد کیا جس میں سید صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر بڑے قیمتی مضامین پیش کیے گئے، مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے اپنے جو تصنیفی وعلمی کام انجام دیے اور وہ طبع ہوئے ان کی ایک قابل ذکر تعداد ہے اور ان کا ایک ذخیرہ جن میں فقہ اسلامی کے موضوع پر تصنیف ''اُسوۂ حسنہ'' کو خاصی مقبولیت ملی، ماہنامہ ''الرشاد'' بھی ان کی یادگار ہے جس کو انھوں نے ''جامعۃ الرشاد'' کے ترجمان کے طور پر نکالا، اداریے کے علاوہ ان کا کوئی نہ کوئی قیمتی مضمون اس کے ہر شمارے کی زینت ہوا کرتا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں سے شاگردی کا تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محبت کا

تعلق بھی تھا، جس کا اثر ان کے خاندان کے افراد تک پہنچا تھا، حضرت مولانا کے بڑے بھانجے اور میرے بھائی مولانا سید محمد ثانی صاحب کا ان سے رفاقت درس کا بھی تعلق تھا، جس کی بنا پر ہم بھائیوں کو بھی ان کی طرف سے برادرانہ ہمدردی اور تعلق کا فائدہ حاصل تھا، جب ملاقات ہوتی یا واسطہ پڑتا تو وہ اس تعلق کا لحاظ فرماتے، حضرت مولانا علی میاں صاحب سے تو شاگرد وخورد کی حیثیت سے ملتے اور ان کو ایک حیثیت سے اپنے مربی کا درجہ دیتے، البتہ مولانا کی ایک خاص صفت یہ تھی کہ وہ اپنی رائے اور فہم کو رواداری کی خاطر دباتے نہیں تھے، بلکہ اظہار کرتے تھے، خواہ وہ کتنے ہی قریبی تعلق والے کی رائے سے اختلاف رکھتی ہو لیکن اس میں تعبیر اور زبان میں اخلاق ورواداری کا لحاظ رکھتے تھے، اس لیے کہ جس بات کو وہ بہتر سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ دوسرے کے علم میں آئے، اس کا اظہار کرتے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ مناسب حدود میں اپنی رائے اور فکر کو ظاہر کرنا حق طلبی میں معاون بنتا ہے، اس لیے وہ بڑی حد تک قابل قدر بات ہوتی ہے، مولانا کی اس خصوصیت سے ان کے بعض دوستوں کو کچھ آزردگی بھی ہوتی تھی، لیکن یہ بات جس انداز میں ہوتی تھی اس میں آپس کے تعلق ومحبت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا، اسی کے ساتھ ساتھ مولانا اپنے اخلاقی رویہ میں بہت خوش طبیعت اور تعلقات وروابط کا پورا لحاظ رکھنے والے تھے، جو ان سے اجتماعی معاملات کے موقع پر اکٹھا ہونے اور ملاقات پر کھلے طریقے سے محسوس کیا جاتا تھا، اپنے خورد اور جونیئر رفقاء اور شاگردوں کے ساتھ محبت وشفقت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کرتے، اور ان کی زندگی کا عام رویہ سنجیدگی اور علمی انداز کا رہتا تھا، جس کے مثبت نتائج سامنے آتے ہیں۔ علمی ترقی کے ساتھ انہوں نے صلاح باطن کی طرف بھی توجہ کی اور اپنے عہد کے قوی النسبت بزرگ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاپگڑھی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور بیعت ہوئے اور ان کی مجالس وملفوظات پر مشتمل ایک کتاب بھی ترتیب دی اور ان کے تعلم کردہ اذکار واشغال کا اہتمام التزام رکھا اور اجازت وخلافت سے بھی ان کی جانب سے سرفراز ہوئے۔

اس طریقے سے انھوں نے مفید اور علمی و دینی خدمات کی حامل زندگی گزاری، ان کی وفات سے ملت کے علمی و دینی دائرے میں بڑا خسارہ ہوا ہے، جس کو ملت کے مختلف حلقوں میں خاصا محسوس کیا گیا، مولانا کے رفقائے تعلیم میں مولانا قاضی معین اللہ صاحب ندویؒ سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء، مولانا عبدالغفار صاحب ندویؒ سابق امیر جماعت اسلامی حلقہ یوپی، پروفیسر عبدالحلیم صاحب ندوی سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ اسلامیہ دہلی، وادارۂ السنہ حیدرآباد، مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندویؒ سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء وسابق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ اور دیگر کئی بلند منصب اہل علم وعلماء تھے جو تقریباً سب ان سے پہلے انتقال کر گئے، وہ اپنے حلقے میں بعد میں جانے والے شخص تھے، ان سب حضرات کی وفات سے ندوۃ العلماء کو جس کے لیے سب فرزند کی حیثیت رکھتے تھے خاص طور پر نقصان اور خسارے سے سابقہ پڑا، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کے اسباب پیدا فرمائے، اور علم دین کی نصرت اور خدمت کی کوشش جن افراد کے ذریعے انجام پا رہی ہے، ان کی قوت اور حفاظت فرمائے۔

اللہ تعالیٰ نے موصوف مرحوم کو ان کے دیگر رفقاء کے مقابلے میں زیادہ مدت خدمت کی سعادت عطا فرمائی تھی، ان کی شمسی لحاظ سے اندازاً ۸۸ سال کی عمر ہوئی، اور ہجری لحاظ سے ۹۰/ سال کی عمر ہوئی، جو انھوں نے فکر اور علمی کوشش میں صرف کی، اور اس طرح ان کو زیادہ کام کرنے کا موقع ملا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفہ بدلہ عطا کرے۔ اور ان کے جانے سے جو خسارہ ہوا ہے اس کی تلافی کے اسباب مہیا فرمائے۔ اور ان کے پسماندگان کو اپنے حفظ وامان میں رکھے، جن میں دو صاحبزادے ڈاکٹر عمار اور مولوی عامر رشادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوریؒ

مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوری نے مورخہ ۲۸/ جولائی ۲۰۰۷ء کو اپنے وطن سلطان پور ہی میں اس دارفانی سے دارباقی کی طرف رحلت کی اور اپنے پیچھے اپنی تعلمی مشغولیت کی یادیں چھوڑ گئے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اوران کی خدمات وحسنات کو قبول فرمائے۔

انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں نصف صدی سے زیادہ مدت تعلیمی خدمت میں گزاری، ان کی خاص صفت یہ رہی کہ وہ تعلیم کا کام پوری یکسوئی کے ساتھ انجام دیتے تھے، اور صرف درس وتدریس سے اشتغال رکھتے تھے، اوراس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھوں نے بہت بہتر انداز میں اپنا فرض انجام دیا، وہ جب دارالعلوم میں بحیثیت مدرس کے آئے تو اپنے استاد خاص مولانا محمد اسباط صاحب کے ساتھ آئے، مولانا محمد اسباط صاحب علمی لحاظ سے بہت ممتاز عالم واستاد تھے، اور اپنے علمی وتدریسی تفوق کی بنا پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بلائے گئے تھے اور انھوں نے تاحیات دارالعلوم میں فقہ ودیگر علوم کی تعلیم دی، فقہ سے ان کا خاص اعتناء تھا، اوران کی مزید خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کو فائدہ پہنچانے کا خاص ذوق رکھتے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوری ان سے اپنے تعلیمی آغاز کے وقت ہی سے وابستہ ہوگئے تھے، اوران کی حیات کے اختتام تک پوری طرح وابستہ رہے، اور اپنی تدریسی خدمت میں جہاں ضرورت پڑی ان سے استفادہ بھی کیا، مولانا محمد اسباط صاحب کی نظر بعد میں بہت کمزور ہوگئی تھی، لیکن ان کا سابقہ علمی اشتغال ایسا رہا تھا کہ ان کو بینائی میں نقص آجانے کے باوجود تدریس کے کام میں دشواری نہ تھی، البتہ اپنی عام مصروفیات کے لیے معاون کی ضرورت پڑتی تھی جس کو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب پورا

کرتے تھے، اور اگر کتابوں کی طرف بعض وقت مراجعت کی ضرورت پڑتی تھی تو اس میں بھی واسطہ ہوتے تھے، علمی لحاظ سے مراجعت کا واسطہ بننے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معروف فرزند مولانا ناصر علی ندوی بھی تھے، دونوں کو مولانا اسباط صاحب سے خاصا فیض پہنچا۔

مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوری تعلیمی مشغولیت کے ساتھ اپنی عام زندگی میں بڑے صفائی پسند اور مرتب زندگی گزارنے والے تھے اور اس میں وہ دوسروں کے مقابلے میں ممتاز نظر آتے تھے، مولانا کا دارالعلوم کے عملہ وانتظام سے تعلق نہیں تھا، البتہ وہ کچھ عرصہ دارالعلوم کے ایک دارالاقامہ کے نگراں بھی رہے اور یہ نگرانی انھوں نے اچھے انداز میں انجام دی، مولانا نے تعلیمی اشتغال میں پابندی اور دلچسپی دونوں کے ہوتے ہوئے معدے کے بعض امراض کی وجہ سے علاج کی فکر واہتمام بھی رکھنے والے تھے اور مناسب علاج کے ذریعے اپنی صحت کو کام کے لائق رکھنے میں کامیاب تھے لیکن صحت کا یہ روگ ان کو برابر رہا، اور یہی روگ بعد میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مدرسی سے ان کے رٹائر ہونے کا باعث بنا، اور اس دوران کچھ مدت اپنے وطن سلطان پور میں اور کچھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندر اپنی قیام گاہ میں رہے جو دارالعلوم کی طرف سے ان کے استعمال میں سے تھی، رٹائر ہونے کے بعد جو حقوق ہوتے ہیں وہ ان کو ادا کیے گئے لیکن یہ مدت جو تدریس کے کام سے ان کے رٹائر ہونے سے شروع ہوئی زیادہ نہیں رہی، صرف ڈیڑھ سال ہی گزرے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کی طرف رحلت کر گئے، رحلت سے صرف ایک مہینہ قبل ان کے علالت میں شدت آجانے کی اطلاع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے کئی حضرات جن میں یہ راقم السطور بھی تھا ان کی عیادت کے لیے سلطان پور گئے تھے، مولانا کو دیکھا اور گفتگو بھی رہی، علالت کی ظاہری کیفیات سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ہم سب سے جدا ہو جائیں گے، لیکن عمروں کا معاملہ خالص اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور وہ پیدائش سے قبل ہی مقرر کردہ ہوتی ہے اور اپنے وقت پر آتی ہے خواہ علالت کوئی خاص نہ ہو، مولانا کی عمر تقریباً اسّی سال کی ہوئی اور وہ ظاہری طور پر ابھی دنیا میں مزید رہنے والے کہے گئے تھے لیکن وقت موعود آ گیا تھا، لہٰذا

علالت کے علاج کی منزل سے وہ آگے بڑھ گئے تھے، انتقال کی خبر ملنے پر دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان کے رفقاء تدریس اور ان سے مستفید ہونے والے شاگردوں کی بھی تعداد سفر کر کے سلطان پور ان کے جنازے میں شریک ہوئی اور ان کو حزن وملال کے ساتھ سپرد خاک کیا، إنا لله و إنا إليه راجعون۔

مولانا حبیب الرحمٰن سلطان پوریؒ نے علم وتعلیم سے وابستگی کی اچھی مثال چھوڑی اور اس کے ساتھ وہ پابند شریعت اور دینی سیرت کا اہتمام رکھنے والے فرد رہے اور تہذیبی قدروں کا بھی اہتمام رکھتے رہے اور اوقات کے پابند شخص کے طور پر بھی انھوں نے اپنے جاننے والوں کے دلوں میں ایک اچھی چھاپ چھوڑی، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا تعلق دیندار خاندان سے تھا ان کے والد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خواص مسترشدین میں تھے اور مولانا کو بھی اپنے بچپن میں حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تھی ان کو حضرت سے بڑی عقیدت ومحبت تھی اور جب بھی حضرت کا تذکرہ آجاتا ان کے آنسو رواں ہوجاتے اپنے عہد کے بزرگوں میں ان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے بڑی محبت وعقیدت تھی اور وہ ان کی خدمت میں اپنا حال دل کہتے اور دعا کی درخواست کرتے، مولانا بھی ان کا خیال کرتے احساس ذمہ داری اور ادئیگی فرائض میں مواظبت کی قدر فرماتے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو جنت الفردوس میں اچھی جگہ عطا فرمائے، مولانا کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، پس ماندگان میں صرف ان کی اہلیہ ہیں اور دوسرے متعلقین بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مولانا عبدالکریم پاریکھؒ

داعی إلی اللہ مولانا عبدالکریم پاریکھ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان میں عہد حاضر میں ایک نہایت مخلص اور امت اسلامیہ کی بہبود کا درد رکھنے والی اور اسلام کی بنیادی کتاب قرآن مجید کے مطالعے کا شغف رکھنے والی اور اس سے حاصل ہونے والے فیض کو اپنے ماحول اور اردگرد کے لوگوں میں عام کرنے والی اور ملت کی حفاظت کے تعلق سے جو مسائل اٹھتے، ان کو حل کرنے کی فکر کرنے والوں میں پیش پیش رہنے والی شخصیت تھی جو ابھی چند دنوں قبل ۲۸/ شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ کو اپنے پروردگار کے جوار میں رحلت کر گئی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا پاریکھ نے اپنی زندگی کا آغاز اپنے خاندان اور زندگی کے عام مشغلے کے لحاظ سے کامیاب کاروباری شخص کی حیثیت سے کیا تھا، وہ لکڑی کے بڑے کاروباری تھے اور یہ کام آخر تک ان کا معاشی ذریعہ رہا، لیکن ان کو قرآن مجید کی تلاوت پھر اس کے مضامین سے شغف ہوا، اور یہ شغف ان کا اتنا بڑھا کہ ان کے ذہن ودماغ پر طاری ہوگیا، چنانچہ وہ قرآن بہت توجہ اور بڑے انہماک سے پڑھتے اور غور کرتے، پھر عامۃ المسلمین کے فائدے کے لیے اس کا درس بھی دینے لگے، جس میں وہ یہ احتیاط رکھتے تھے کہ قرآن مجید کے جو معتبر تراجم ہیں ان سے وہ باہر نہ جائیں، تاکہ قرآن مجید کی ترجمانی میں کوئی بے احتیاطی نہ ہو، قرآن مجید کے اس شغف نے حدیث وقرآن اور دینی مراجع اور دین کے لیے قابل استفادہ ہونے اور اس سب کے نتیجے میں دینی تعلیمات اور اسلامی حقائق کی ترویج کا جذبہ بھی ان پر پوری طرح طاری ہوگیا اور وہ دین وملت کے ایک اہم خادم بن گئے، ان کا قرآن مجید کا درس جونا گپور میں ان کے محلے کی مسجد میں پابندی سے ہوتا تھا، کئی

بار مکمل ہوا، اور پھر کتابی شکل میں آسان زبان کے ترجمۂ قرآن کے طور پر شائع ہوا، اور وہ آسان اسلوب کی وجہ سے بہت مقبول اور عام ہوا۔

قرآن مجید کے ترجمے کی تفہیم وتشریح کا شغل ان کا اتنا زیادہ رہا کہ وہ ان کے ذہن ودماغ پر چھا گیا، وہ اپنی تقریروں میں اور اپنے مختلف خطابات میں قرآن مجید کی آیات کے حوالے سے اپنی اصلاحی باتوں کو تقویت دیتے تھے، اور اس سے مدد لیتے تھے، مولانا پاریکھ صاحب اردو گرامر اور مراٹھی زبانوں سے اپنے ماحول اور علاقے کی بنا پر مادری زبان کی طرح واقف تھے، مراٹھی کی بنیاد پر ہندی زبان سے اور سنسکرت سے بھی واقفیت حاصل تھی، کاروباری ماحول کی بنا پر مسلم اور غیر مسلم دونوں عناصر سے ان کو واسطہ پڑتا تھا، ان کا مزاج نرم اور ہر ایک سے مناسب اور ہمدردانہ گفتگو کرنے کا تھا، اس طرح غیر مسلموں میں اسلام کے تعارف کا کام بھی وہ بہت سلیقے سے انجام دیتے تھے، وہ اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی تحریک پیام انسانیت کے پلیٹ فارم سے بڑے مؤثر وطاقتور خطاب کرتے اور بیانوں کے ذریعے بھی اس مشن کو فروغ دیتے اور اسی طرح وہ ملت کے مسائل میں حکومت کے ذمہ داروں سے بھی اچھی گفتگو کرتے تھے، اور ان کی انھی صلاحیتوں کی بنا پر مسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں اور اصلاحی ودعوتی اداروں کے وہ رکن بنائے جاتے رہے، ان میں سب سے اہم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ادارہ ہے، جس کے وہ اپنی صحت کی معذوری تک خازن کے عہدے پر بھی رہے اور ملک میں ملت اسلامیہ کو جو بعض اہم ترین مسائل پیش آئے ان کے حل کرنے کے سلسلے میں ان کی کوششوں کا حصہ رہا، اسی طرح مسلم مجلس مشاورت کا جب قیام عمل میں آیا اس میں وہ روز اول سے شریک کار اور فعال کارکن رہے، انھوں نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے تعلق سے متعدد تصنیفات بھی تیار کیں جس میں افادیت کا پہلو نمایاں رہتا جن میں بعض کتابوں کا عربی میں اور بعض دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ کے کام کے نمایاں ہونے کا جب آغاز ہوا تو اسی وقت

سے ان کا تعارف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہوا، سے اوران سے اس تعلق نے بڑھ کر خصوصی محبت وعقیدت تک پہنچادیا، اور وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بہت وابستہ رہنے لگے، اور ملت کے کاموں میں دست راست بھی بنتے رہے اور معتمد خاص بن گئے اور اس طرح ان کا ربط وتعلق ندوۃ العلماء سے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اہل تعلق سے بھی بڑھ گیا، اوران سب کو بھی مولانا پاریکھ سے قریبی تعلق ہوگیا جوان کی زندگی کے آخر تک قائم رہا، مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے اس تعلق کو اہمیت دیتے تھے، اور ملت کے کاموں میں مولانا علی میاں صاحب کے نقطۂ نظر اور طرز کار کو بہت مفید قرار دیتے، اور اپنے کو ان کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کی کوشش کرتے تھے، مولانا علی میاں صاحب کو بھی ان کی بڑی قدر تھی اور ان کا جو ملکی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں تفہیم اور نمائندگی کا جو طرز تھا اس کو وہ بہت پسند کرتے تھے اور اس کو سراہتے تھے، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی باطنی استعداد کو دیکھتے ہوئے اپنی خلافت سے بھی سرفراز کیا تھا، اس طرح وہ ارشاد وتربیت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

مولانا عبدالکریم پاریکھؒ دینی وملی اور ملکی معاملات میں مصروفیت کو اس حد تک اختیار کر چکے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمہ وقت ان کی یہی دلچسپی ہے اور یہی کام ہے، حالانکہ وہ اپنے کاروباری لائن میں بھی اپنی ضروری دلچسپی کو بھی قائم رکھے ہوئے تھے۔

مولانا پاریکھؒ کا قیام چونکہ ناگپور میں تھا اور ناگپور ہندوؤں کی متعصب جماعت آر ایس ایس کا مرکز (ہیڈ کوارٹر) رہا ہے تو ان کو ان لوگوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا اس سابقے کو وہ بہت خوبی کے ساتھ نبھاتے تھے، بلکہ متعدد معاملات میں جو غلط فہمی کی بنا پر ابھرتے ان کا تدارک بھی بہت خوبی سے کرتے، اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو اپنے مخاطب کی زبان اور شائستہ اسلوب میں بات کرنے کا بڑا سلیقہ تھا، اور ان کا بات کرنا مفید ہوتا تھا، اس طرح مولانا پاریکھ صاحب ہندوستان کی ملت اسلامیہ کی ایک ضرورت بن گئے تھے،

ان کے نہ رہنے سے ملت کی خیر خواہی کے کاموں میں اپنی پوری زندگی لگادی، جس کا صلہ ان کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھرپور ملنے کی امید ہے لیکن موجودہ کارپرداز بہی خواہانِ ملت کی جو اس وقت ملک میں کمی ہے اس میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ مولانا پاریکھ صاحب کو ان کی خدمات پر بہت اجر عطا فرمائے اور ان کے جانے سے جو خسارہ ہوا ہے اس کی تلافی فرمائے۔

مولانا کے چار صاحبزادگان ہیں الحاج عبدالغفور پاریکھ، الحاج عبدالرؤف پاریکھ، الحاج عبدالقیوم پاریکھ اور سب سے چھوٹے الحاج عبدالمجید پاریکھ ہیں اور یہ صاحبزادگان ان کے قرآنی مشن کو آگے بڑھانے اور اس کوشش میں کہ قرآن کریم لوگ آسانی سے سمجھنے لگ جائیں مصروف عمل ہیں الحاج عبدالغفور پاریکھ صاحب ٹریننگ دینے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں اور عبدالمجید پاریکھ صاحب جلسوں کے انعقاد اور ملاقاتوں کے ذریعہ اور تحریر تقریر کا بھی طریقہ اختیار کر کے اپنے والد کے کام کو آگے بڑھا رہے ہیں اور داماد الحاج عبدالوہاب پاریکھ صاحب بھی اس سلسلہ میں فعال ہیں اور دعوت وتبلیغ کی راہ سے بھی مشغولیت رکھتے ہیں۔

مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ

مختصر علالت کے بعد بزرگ عالم دین مولانا محبوب الرحمٰن ازہری کیرانوی ۴/ جمادی الاول ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۰/ اپریل ۲۰۱۰ء کو لکھنؤ میں انتقال فرما گئے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

وہ دینی علوم اور عربی زبان وادب میں امتیاز رکھتے تھے، اور عربی زبان کی تدریس کا ان کو اچھا تجربہ اور اس سلسلے میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے دینی علوم میں کمال پیدا کیا اور دارالعلوم ندوہ میں حدیث شریف کی اہم کتابوں کا درس دیا، اور کچھ وقت صحیح بخاری اور مسلم شریف جیسی عظیم کتابوں کا درس بھی ان کے ذمہ رہا، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کی نگرانی اور رہنمائی کی ذمہ داری بھی کچھ عرصہ نبھائی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی تعاون اور گرانقدر مشوروں سے تقویت پہنچانے کا سامان فراہم کیا، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اپنے آغاز جوانی سے تدریسی خدمت کی، اس لیے آج دارالعلوم کے بعض سینئر اور ذمہ دار اساتذہ ان کے شاگردوں میں ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انھوں نے تدریسی خدمات پیش کیں، اور اسی زمانۂ تدریس میں ان کی رفاقت معروف اسلامی محقق ومصنف مولانا ابو محفوظ الکریمی معصومی سے رہی، جو دوستانہ اور عزیزانہ روابط کی شکل اختیار کرگئی، اور ان سے تعلق آخر تک قائم رہا، جب کہ وہ کلکتہ اور یہ لکھنؤ میں رہ رہے تھے۔

مولانا محبوب الرحمٰنؒ کو مکہ مکرمہ سے بھی گہری علمی مناسبت رہی، وہاں کی مشہور درسگاہ مدرسہ صولتیہ میں انھوں نے پڑھایا اور پڑھا بھی اور کئی بار مکہ مکرمہ میں منعقد عالمی مسابقۂ قرآنی میں حکم کی حیثیت سے بھی شرکت فرمائی، اور حصولِ علم کے جذبے سے انھوں

نے جامعہ ازہر سے بھی ڈگری لی، قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں حاصل کی تھی، اور قرآن مجید سے تعلق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ ستر محرابیں انھوں نے قرآن مجید کی سنائیں، مولانا کے والد مولانا فضل الرحمٰن صاحب کیرانویؒ ندوۃ العلماء کے اولین فارغین میں تھے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہم زمانہ تھے۔ دینی دعوتی خدمات میں قادیانیت کے خلاف ان کی کوششیں مؤثر ثابت ہوئیں اور انھوں نے ''سفر قادیان'' کے نام سے کتاب بھی تصنیف کی۔ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے المحاورۃ العربیۃ ودروس الأشیاء لکھی، اس طرح ان کا فیض شاگردوں، کتابوں اور صالح اولاد کے ذریعے پھیل رہا ہے۔ (اللہ تعالیٰ قبول فرمائے)۔

اولاد میں تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، بڑے بیٹے ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی کناڈا میں دعوت کے کام میں مصروف ہیں، دوسرے خالد محبوب ندوی جدہ ریڈیو کی اردو سروس سے متعلق ہیں، اور تیسرے بیٹے اسعد محبوب بھوپال میں انجینئر ہیں۔

ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ابھی کچھ وقت اپنے والد کی خدمت میں گزار کر گئے، اور والد محترم کی توجہ اور دعا لی، ان کے داماد مولوی ابوسحبان روح القدس ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف اور بڑی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ کی پیدائش ۱۹۱۹ء کی تھی، اس طرح شمسی اعتبار سے ۹۱ سال اور قمری لحاظ سے ۹۴ سال کی عمر پائی، ڈالی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں مدفون ہوئے، جہاں عموماً دارالعلوم ندوۃ العلماء اور ڈالی گنج وقرب وجوار کے مرحومین کے متعدد احباب مدفون ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اور ان کے درجات کو بلند تر فرمائے، إنه هو الغفور الرحيم۔

حضرت مولانا مرنجا مرنج طبیعت اور علمی مذاق کے حامل تھے اور یکسوئی کے ساتھ علمی ودعوتی تدریسی کاموں میں لگے رہتے تھے، ان کی کوششیں عموماً خاموشی کے

مقصدیت کی حامل ہوتی تھیں، درس وتدریس سے ان کو خصوصی مناسبت تھی، انھوں نے صحت جہاں تک برداشت کرتی رہی تدریسی مشغولیت کو قائم رکھا، اس کے ساتھ ہمت اور بلند حوصلگی میں بھی بڑھے ہوئے اور مرض کی صعوبتوں کو سیر چشمی سے گوارا کرتے رہے اور اپنے کو صحت مند کی صورت میں ظاہر کرتے تھے، آخری دن تک گفتگو اور باتیں صحت مند شخص کی طرح کرتے رہے، حالانکہ اندر سے طبیعت خاصی ناساز تھی، اور اس طرح وہ دوسروں کے لیے اچھی مثال چھوڑ کر گئے، علمی ذوق کے حامل ہونے کی وجہ سے علم کی راہ میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔

(۷) چند باکمال خوردسال

(۱) مولانا اسحاق جلیس ندویؒ
(۲) مولانا عبدالنور (نورعظیم) ندویؒ
(۳) مولانا محمد رضوان ندوی
(۴) مولانا ابوالبرکات فاروقیؒ
(۵) مولانا سید لقمان اعظمی ندویؒ
(۶) پروفیسر محمد یونس نگرامیؒ
(۷) مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ
(۸) پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ
(۹) مولانا محمد رضوان قاسمیؒ
(۱۰) مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ
(۱۱) مولانا ناصر علی ندویؒ
(۱۲) مولانا سید اجتباء حسینی ندویؒ

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ

مدیر تعمیر حیات وترجمان تحریک پیام انسانیت مولانا اسحاق جلیس ندوی ۱۵ر شعبان ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۱ر جولائی ۱۹۷۹ء کو لکھنؤ میں جہاں وہ اپنی دعوتی وصحافتی مشغولیت رکھتے تھے بوقت عصر اس دنیا سے رخصت ہوکر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اناللّٰہ وانّا الیہ راجعون۔

یہ حادثہ ندوۃ العلماء کے لیے اور اس کے سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے لیے ایک ماہ کے فرق سے دوسرا سخت ترین حادثہ ہے کیونکہ ندوۃ العلماء کے مقصد و فکر کی خدمت کے سلسلے میں اور مولانا کی سرکردگی میں دعوت وعلم دین کے میدان میں کام کرنے والے دو اہم ترین سپاہی یکے بعد دیگرے کم عمری میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اپنے رفقائے کار کو اپنے تعاون ورہبری سے محروم چھوڑ گئے۔ عموماً جب جہاد اسلامی میں قتال کا موقع ہوتا ہے تو اس طرح کے حادثے پیش آیا کرتے ہیں، اور بعض وقت یہ حادثے جہاد کی طاقت اور اس کی فعالیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں اور ان سے میدان کے سپاہیوں اور قائدوں کی صف میں بڑا خلا پیدا ہوجاتا ہے، لیکن بہرحال وہاں وہ حادثے تعجب کا باعث نہیں ہوتے اور ان کو توقع کے خلاف بھی نہیں سمجھا جاتا لیکن علمی وادبی اور عام دعوتی میدان میں پے درپے دو اہم حادثے ہیں۔ ان سے جتنا تاثر اور غم وافسوس ہو کم ہے لیکن دعوت وعلم دین کے راستے میں ساری جدوجہد جس پروردگار کی رضا کے لیے کی جارہی ہے وہ قوی اور عزیز بھی ہے اور اپنے بندوں کا محافظ بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔

اس دنیا میں کوئی چھوٹی بات یا بڑی بات نہ اس کی مرضی کے خلاف ہوسکتی ہے اور نہ اس کے علم کے بغیر، اس کی حکمت ومرضی جو بھی ہو اس پر سب بندوں کو راضی رہنا ہے وہ علیم و

حکیم ذات ہر شخص کو ایک مقررہ عمر کے ساتھ اس دنیا میں بھیجتی ہے اور جتنا اور جتنی مدت اس کے حصہ میں رکھی ہے اتنا پورا ہونے کے بعد وہ اس کے یہاں واپس بلالیا جاتا ہے۔ اس کی حکمت کا خدا تعالیٰ کو علم ہے البتہ ان نوخیز و نوجوان عزیزوں کے جدا ہونے سے تمام رفقاء بہت ملول، افسردہ اور غمزدہ ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ایک صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ کے انتقال پر اپنے تاثر کا اظہار آنسوؤں سے اور ان الفاظ سے کیا تھا، ہم تمہاری جدائی سے ابراہیم واقعتاً غمگین ہیں۔

ایک ماہ کے عرصہ میں ندوہ نے اپنے دو عظیم سپاہی کھودیے یہ واقعتاً بڑے صدمے کی بات ہے بلکہ بقول عربی شاعر ؎

و لیس لعین لم یغض ما ء ها عذر

(اس حادثہ پر جس آنکھ سے آنسو نہ بہے اس کا عذر قابل قبول نہیں)

مولانا اسحاق جلیس اپنی متعدد خصوصیات میں اپنے پورے حلقے میں منفرد حیثیت کے مالک تھے، ان کا سب سے بڑا ہنر مسلم و غیر مسلم اجتماعات میں انسانیت کی ستھری اور تعمیری دعوت کو اچھی زبان و اسلوب میں طاقت و تأثر کے ساتھ پیش کرنا تھا، اس سلسلے میں انھوں نے اپنے شیخ و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے فکر و ذہن کو پوری طرح اپنا لیا تھا اور وہ ان کے بڑے اچھے دست راست بن گئے تھے، ان کو اپنے شیخ کا پورا اعتماد تھا اور ان کو ان سے بڑی مدد ملتی تھی ابھی ڈیڑھ ماہ قبل اسی سلسلے کا ریاست کرناٹک کا ایک دورہ کر کے واپس آئے تھے۔

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ کی دوسری بڑی خصوصیت و صلاحیت اردو صحافت پر ان کی قدرت تھی، وہ اس کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے اور مؤثر و طاقتور اسلوب کے مالک تھے، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد پونا میں قیام کے دوران ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا تھا، جس کے ذریعہ ان کی صحافتی صلاحیت کا پہلی بار لوگوں کو علم ہوا۔ پھر جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے لیے ان کی خدمات حاصل کی گئیں تو اردو کا

پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' ان کے سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے خاصی ترقی دی اور اپنی تحریر وا نتظام کے ذریعہ ملک میں اس کی ایک اچھی جگہ بنادی، افسوس یہ پندرہ روزہ اب ان کی تحریر و انتظام سے محروم ہوگیا۔

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ نے بھی بہت کم عمر پائی وہ بھی محمد میاں مرحوم کی طرح صرف ۴۴ سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت کر گئے اور عجیب بات یہ کہ دونوں نوجوان خادمان علم و دین کا انتقال ملتی جلتی بیماری میں ہوا، بیماری ایسی کی اپنی ابتدائی منزل میں نہایت غیر اہم اور معمولی لیکن نتیجے کے اعتبار سے فیصلہ کن۔ وہ انتقال کے خطرہ کا ذہن پوری طرح بننے سے قبل اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کرتا ہے۔ ایک پتہ بھی اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہل سکتا، لیکن یہ بات بھی نظر کے سامنے بار بار آتی ہے کہ دونوں مرحومین اسپتال کے ایمرجنسی کے کارپردازوں کے ہاتھوں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور تیماردار ''اے کاش'' کا لفظ دہراتے رہ گئے۔

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ کا تعلق کئی صوبوں سے تھا۔ ان کے والد صاحب صوبہ سرحد کے ایک معزز پٹھان گھرانے کے فرد تھے اور فوج کے ایک مرکز میں ایک مذہبی منصب پر فائز تھے، امام و مفتی تھے، قیام صوبہ مہاراشٹر کے شہر احمد نگر میں تھا یہیں مولانا اسحاق صاحب کی نشو نما ہوئی اور وہ وطن کے لحاظ سے مہاراشٹری بنے لیکن جب تعلیم کی تکمیل کا وقت آیا تو لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے یہاں ۵ سال میں انھوں نے دینی و عربی تعلیم کی تکمیل کی ۱۹۵۹ء کا سن تھا اور یہ ان کی تکمیل تعلیم کا آخری سال تھا کہ ترجمہ و تصنیف واشاعت کے مشہور شعبہ ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کی ندوہ میں بنیاد پڑی مولانا اسحاق جلیس ندویؒ اپنی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کی بنیاد پر اس شعبے کے معاون وسکریٹری مقرر ہوئے اور انھوں نے اس ادارہ کو شروع کے مرحلے میں اپنی صلاحیتوں سے بڑی مدد پہنچائی۔ پھر وہ اپنے وطن احمد نگر واپس چلے گئے۔ وہاں پر ایک کالج میں تدریسی منصب پر فائز ہوئے جس کو کئی سال تک انجام دیتے رہے اسی دوران انھوں نے وہاں

کے شعبۂ لائبریری سائنس میں اس کے فن کی تعلیم حاصل کی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء آ کر اسلامی کتب خانوں کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حاصل کردہ فن میں مناسب تغیر کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو نئے ڈھنگ پر ڈھالنا شروع کیا جو ان کے انتقال سے خاصا پہلے تکمیل کی منزل تک پہنچا۔

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا ان کا آبائی وطن صوبہ سرحد تھا لہٰذا وہ پشتو جانتے تھے اور حسب ضرورت لوگوں سے اس میں گفتگو کرتے تھے۔ ان کی نشو نما مہاراشٹر میں ہوئی اس طرح وہ مرہٹی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ لکھنؤ میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ یوپی کے آدمی معلوم ہوتے تھے اور اردو ادب سے علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے کامیاب واقفیت رکھتے تھے، ہندی و انگریزی ملک کی سرکاری زبانیں ہونے کی بنا پر ان کو اچھی طرح سمجھتے اور استعمال کرتے تھے اس طرح پر ان کو کسی بھی صوبہ میں مسلم و غیر مسلم کسی مجمع میں اپنی بات کو کہنے اور سمجھانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زبان و قلم دونوں کی صلاحیت یکساں عطا فرمائی تھی۔ وہ اچھے اور مؤثر ڈھنگ سے لکھتے اور اچھے اور مؤثر ڈھنگ پر تقریر کرتے تھے۔ ان کو ندوۃ العلماء کے تخیل و تحریک اور مولانا علی میاںؒ صاحب کے اسلامی و دعوتی فکر سے بڑا لگاؤ اور تعلق تھا وہ مولاناؒ کو اپنا خصوصی و مربی شیخ سمجھتے تھے اور ان کو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں محبت کا تعلق تھا۔ اور مولانا کو بھی ان سے بہت تعلق خاطر تھا۔ مولانا ان کو بڑا عزیز رکھتے اور ان کے خلوص و صلاحیت کے بڑے قدرداں تھے۔

مولانا اسحاق جلیسؒ صاحب کا مولانا سے تعلق و محبت ان کے تمام ان لوگوں کے ساتھ تعلق و محبت میں ظاہر ہوتا تھا جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو عزیز و محبوب تھے۔ چنانچہ محمد میاںؒ سے ان کا قریبی تعلق تھا اور دونوں ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے یہ انس غور فکر کی یکسانی اور عملی کوششوں کی شرکت کی صورت میں ظاہر ہوتا، چنانچہ مولانا محمد میاں کا انتقال ان کے لیے بڑا صدمہ تھا، وہ اپنی اس بیماری میں مجھ سے کہنے لگے کہ محمد میاںؒ کے انتقال کے بعد جلد ہی ان سے جا ملنے کی دعا کی تھی بس یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت (یعنی مولانا علی میاں)

نماز جنازہ پڑھانے کے لیے اس وقت تشریف نہیں رکھتے ہیں۔ مولاناؒ گزشتہ ہفتہ میں مدینہ منورہ گئے تھے اس وقت تک مولانا اسحاق صاحب بالکل معمول کی صحت میں تھے۔ علالت بڑھ جانے پر ان کو بذریعہ تار اطلاع کی گئی جس کے جواب میں فکر وتشویش کا تار آیا لیکن افسوس کہ اس کے جواب میں رحلت ہی کی اطلاع دی جاسکی۔

مولانا اسحاق کو ان کی خواہش ووصیت پر مولاناؒ کے گاؤں دائرہ شاہ علم اللہؒ کی مسجد کے جنوب مغربی رخ پر واقع قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ شیخ وقت حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی نے پڑھائی، جو کسی وجہ سے تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لائے ہوئے تھے۔

مولانا اسحاق جلیس ندویؒ کو چند ماہ قبل معدہ میں السر کی شکایت محسوس ہوئی تھی جو کئی بار درد کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ٹھیک ہوگئی، اس بار جمعہ کے روز پھر محسوس ہوئی زیادہ بڑھنے پر میڈیکل کالج کے ایمرجنسی وارڈ میں داخلہ ہوا لیکن وہاں مرض پیچیدہ ہوتا گیا اور کئی نئی اندرونی شکایات میں تبدیل ہوگیا۔ چار روز سے زیادہ اسپتال میں رہنے کے بعد چہارشنبہ ۱۵ر شعبان ۱۳۹۹ھ کو انتقال کیا۔

تیمار داروں کو یہ بڑا احساس ہے کہ اسپتال میں فائدہ سے زیادہ نقصان ہوا۔ انتقال کے قریب تک وہ ہوش وحواس پر قائم تھے۔ ضروری باتیں بھی کرتے رہے اور خوشی خوشی کچھ دیر میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ و اجزل مثوبۃ الیٰ الآخرۃ۔

پسماندگان میں چار بیٹے اور بیٹیاں ہیں، سبھی بیٹے حافظ قرآن ہیں (۱)۔

---

(۱) بڑے بیٹے حافظ عبدالحمید جلیس نے اپنے والد کی حیات وخدمات پر ایک کتاب ''اسحاق جلیس ندوی-حیات وخدمات'' کے نام سے تصنیف کی ہے جس میں انھوں نے ان کے بعض مؤثر اداریوں کو بھی شامل کیا ہے، جو انھوں نے تعمیر حیات میں لکھے تھے، دو بیٹے حافظ محمد یوسف اور حافظ محمد صادق پاکستان میں مقیم ہیں، اور ایک بیٹے مولوی حافظ محمد ایوب جلیس ندوی ہیں، اور داماد مولوی سید عبدالمنان ندوی حیدرآبادی، کناڈا میں مقیم ہیں (م)

مولانا عبدالنور عبدالعظیم ندویؒ

مولانا عبدالنور صاحب ندوی دارلعلوم ندوۃ العلماء کے ان فرزندوں میں ایک تھے جنھوں نے کم عمری میں ہی اس دنیا سے رحلت کی، ان فرزندوں میں سرفہرست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کا نام ہے جنہوں نے عمر کی تین دہائیاں بھی نہیں پائیں لیکن تحریری وتقریری وہ صلاحیتیں پائی تھیں جن سے ان پر ندوہ کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے اوران کو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنی جماعت کا شب چراغ کہا تھا، دوسرے مولانا علی احمد کیانی ہیں جو عربی صلاحیت کے مالک اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ممتاز شاگردوں میں تھے، پھر عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' کے مدیر اعلیٰ اور اس رسالے کے بانی مولانا سید محمد الحسنی اور تعمیر حیات کے مدیر مولانا اسحاق جلیس ندوی تھے، مولانا محمد الحسنی عربی اردو دونوں کے کامیاب اہل قلم اور ادیب تھے اور مولانا اسحاق جلیس ندوی اردو کے اچھے اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع المطالعہ اور پیام انسانیت تحریک کے سرگرم کامیاب کارگزار تھے، ان کے علاوہ حدیث شریف کے اساتذہ میں مولانا مصطفیٰ ندوی، مولانا وجیہہ الدین ندوی اور آخر میں مولانا ضیاء الحسن ندوی اعظمی تھے جنھوں نے کم عمری میں رحلت کی اب مولانا عبدالنور ندوی نے بھی تقریباً کم عمری میں ہی رحلت کی ان کی عمر انتقال کے وقت ۵۲ سال کی تھی۔

مولانا عبدالنور ندویؒ جن کا قلمی نام اپنے والد مولانا عبدالعظیم کی طرف انتساب کی بنا پر نور عظیم ندوی تھا، ایک شریف الطبع، ادبی ذوق کے حامل اور اچھے مدرس تھے وہ اپنی ادبی صلاحیتوں کو اچھے انداز میں بروئے کار بھی لاتے تھے، ان کو اپنے موضوع پر اچھا قابو تھا وہ ادب کی تدریس کے ساتھ ساتھ اردو صحافت اور ادبی مذاکروں میں بھی حصہ لیتے تھے۔

مولانا عبدالنور ندوی، ندوۃ العلماء آنے سے قبل اپنے قریب کے کئی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ ۱۹۶۰ء میں ندوۃ العلماء آئے اور درجہ پنجم عالیت

میں داخل ہوئے اور سند فضیلت تک چار سال کی تعلیم مکمل کی، ان کا تعلق اس کے بعد بھی ندوۃ العلماء سے کسی شکل میں برابر قائم رہا۔ فضیلت تک کی تعلیم مکمل کر کے انھوں نے اپنی تدریسی زندگی جامعہ احمدیہ سلفیہ سے شروع کی، جامعہ احمدیہ سلفیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالحفیظ سلفی کا حضرت سید احمد شہیدؒ سے جو قلبی و ذہنی تعلق رہا، اس کی بنا پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی وہ خصوصی ربط رکھتے تھے اور بہت تعلق سے ملتے تھے، حضرت مولانا کو بھی ان سے بڑا تعلق تھا، اس کا دونوں طرف سے اظہار ہوتا رہا تھا، دوسری طرف مولانا عبدالنور ندوی کے والد عبدالعظیم مرحوم بھی حضرت سید احمد شہیدؒ سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی طرف سے مولانا علی میاں سے تعلق کا اظہار ہوتا تھا، اور یہ حضرت مولانا تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ان کے اہل خاندان سے بھی تھا، چنانچہ میرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ سے بھی ربط تھا، اس کے اثر سے مولانا عبدالنور ندوی بھی ندوۃ العلماء میں تعلیم کے دوران اور جامعہ احمدیہ سلفیہ جانے کے بعد بھی مولانا سے تعلق رکھتے رہے، چنانچہ کچھ مدت بعد جامعہ سلفیہ سے ندوۃ العلماء بحیثیت مدرس آ گئے۔ لکھنؤ اور ندوۃ العلماء میں ان کے کئی رفیق درس پہلے سے تھے ان میں ان کے استاد زادہ اور رفیق درس ڈاکٹر محمد یونس نگرامی اور رفیق درس و رفیق دارالاقامہ مولانا نذر الحفیظ ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ ندوۃ العلماء سے وابستگی کے دوران تینوں ساتھیوں کے درمیان بڑا آپسی ربط رہا جس کی بنا پر تینوں تقریباً ہر کام میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک رہے، شہر کی ثقافتی و علمی سرگرمیوں میں ڈاکٹر یونس نگرامی کے ساتھ مشارکت رہتی بلکہ عموماً جس کام میں ان میں سے کوئی ایک شریک ہوتا دوسرا بھی اس میں شامل ہوتا، تینوں ذوق اور عمومی علمی صلاحیت میں ایک دوسرے سے بڑی حد تک ملتے جلتے تھے، مولانا عبدالنور ندوی اور مولانا نذر الحفیظ کا تو قیام بھی ایک ساتھ تھا لہٰذا دونوں میں زیادہ خلا ملا رہا۔

صحافتی کام ہوں یا عربی سے اردو ترجمہ ہو تقریباً ہر جگہ مولانا عبدالنور ندوی اور مولانا نذر الحفیظ کا نام ساتھ رہتا، ان کے علاوہ عبدالنور ندوی کے دوسرے ہم سن اور کاموں میں شریک فضلاء میں مولانا شمس الحق ندوی اور مولانا محمود الازہار ندوی بھی رہے۔ ندوۃ العلماء

میں ترجمہ وصحافت وثقافت کی انجمنوں میں مولانا عبدالنور اوران کے یہ ہم عمر فضلاء تقسیم کار اور مشارکت سے کام کرتے، ندوہ سے ازہر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ندوۃ العلماء کی طرف سے جو تین نام بھیجے گئے تھے وہ مولانا عبدالنور ندوی، مولانا نذر الحفیظ ندوی اور سلمان عابد شمسی ندوی کے تھے، ازہر کی منظوری ملنے پر تینوں ازہر گئے، سلمان شمسی تو چند ماہ بعد حجاز آ گئے اور وہاں ان کو ایک ملازمت مل گئی لیکن مولانا عبدالنور ندوی اور نذر الحفیظ ندوی نے ادب ونقد میں ایم.اے کا کورس مکمل کیا، اوراس کی سند لے کر ہندوستان واپس ہوئے، نذر الحفیظ ندوی وہاں سے فارغ ہوکر براہ راست ندوۃ لوٹ آئے اور اپنے سابقہ تدریسی کام میں لگ گئے۔ البتہ مولانا عبدالنور ندوی کو ریاض میں معہد اللغۃ میں تدریس کی جگہ مل گئی جب اس کا معاملہ اختتام پذیر ہوا تو رابطہ عالمی اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے حضرت مولانا علی میاں کی زیر نگرانی ہندوستان میں مبعوث مقرر ہوئے اور تدریسی کام کے ساتھ اپنے ذوق کے ادبی وعلمی کاموں میں رفیق وشریک رہے، سیاسی میدانِ عمل میں مولانا عبدالنور ندوی اور مولانا نذر الحفیظ ندوی نے دلچسپی نہیں لی اور صحافت کے دائرہ میں عربی سے برائے نام رابطہ رہا، البتہ ندوہ کے تعمیر حیات میں اور شہر کے بعض پرچوں خاص طور پر ندائے ملت میں ان دونوں حضرات نے دلچسپی لی، تعمیر حیات مولانا اسحاق جلیس ندوی مرحوم کی ادارت میں اور خصوصی دلچسپی کا محور رہا پھر ان کے بعد ان کے بعض رفقاء مولانا شمس الحق ندوی اور مولانا محمود الازہار ندوی نے اس کی ذمہ داری سنبھالی جو تا حال باقی ہے، البتہ درمیان کے اس کے بعض شماروں میں مولانا عبدالنور ندوی نے بعض محدود ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔ البتہ مولانا نذر الحفیظ ندوی کبھی کبھی مضامین یا نوٹ کے ذریعہ حصہ لیتے رہے لیکن جب بھی ان لوگوں نے کچھ لکھا وہ ان کے نام کے ساتھ آیا، اس میں نام کا اخفا نہیں کیا گیا، شہر کے پرچوں میں سے ندائے ملت سے ایک مدت تک مولانا عبدالنور ندوی اور مولانا نذر الحفیظ ندوی کا ادارتی تعلق ذرا زیادہ رہا، وہاں ان حضرات نے اپنے نام کے اظہار کے بغیر بھی مضامین شائع کئے۔

کلیۃ اللغۃ سے ذمہ داری کا تعلق ہونے کے بنا پر اس میں مولانا عبدالنور ندوی

کے مدرس ہوجانے پر ان کا مجھ سے تعلق بڑھا، یوں تعلق کی ابتدا تو ان کے طالب علمی کے زمانہ سے ہی ہوگئی تھی جب کہ ادب عربی کے اسباق میں ان کے دیگر اساتذہ کے علاوہ مجھ سے بھی ربط رہتا تھا۔

مصر سے لوٹنے کے بعد ان کی ادبی واقفیت میں نمایاں اضافہ ہوا، ان کا ادبی ذوق بھی بلند ہوا، البتہ عربی تحریر و مقالہ نگاری سے انھوں نے کم دلچسپی لی، اس کے لیے میں نے اور میرے بعض رفقاء نے ان کو توجہ بھی دلائی لیکن انھوں نے اردو کو اپنی نگارش کے لیے ترجیح دی، اور باوجود توجہ دلانے کے نہ ہونے کے برابر شرکت کی البتہ جب رابطہ ادب اسلامی کا ضمیمہ نکالنا طے کیا گیا تو رابطہ ادب اسلامی کے دفتر کے ایک ذمہ دار کی حیثیت سے میں نے ان کو اس میں ذمہ دارانہ حصہ لینے کے لیے کہا۔ انھوں نے قبول کیا اور حصہ لیا اور اس کے متعدد شماروں میں انھوں نے نوٹ لکھے، لیکن اس دوران شکر کی بیماری اور بلڈ پریشر کے اثر سے ان کو کام میں دشواری ہونے لگی اور وہ اس پرچہ میں تحریری کام اتنا نہ کر سکے جتنا کہ ان کو کرنا تھا۔ رسالے کی سہ سالہ مدت میں وہ چند مختصر مضامین کے علاوہ کوئی اہم مقالہ نہ لکھ سکے، ان کی کمزوریٔ صحت اس بات کا باعث بنی کی رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ سیمیناروں میں اپنی علمی شرکت کو انھوں نے عموماً زبانی حد تک محدود رکھا اور مقالہ کے ذریعہ شرکت نہ کر سکے وہ علمی مجالس میں اپنی علمی و فکری بات کو مؤثر اور بہتر انداز میں پیش کرتے، اس سے یہ بات عیاں ہوتی رہی کہ ادب کا ان کا مطالعہ جدید اور وسیع ہے اور ان کو ادب کے نظریات اور مفاہیم سے اچھی واقفیت ہے، رابطہ ادب اسلامی کے وہ باقاعدہ رکن نہ تھے لیکن ان کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے انکے ساتھ رکن جیسا معاملہ کیا گیا۔ اور ان کے حقوق کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ان کی صحت کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس بات کا بھی لحاظ کیا جاتا رہا کہ ان پر بوجھ زیادہ نہ پڑے، رابطہ کی طرف سے عربی خط و کتابت نیز سیمیناروں کے لیے رپورٹ اور اس کے دعوت ناموں کی ترتیب عموماً میں ہی کرتا اور جو کام وہ بسہولت کر سکتے اسی کا ان کو موقع دیا جاتا اور وہ انھیں کے نام

سے ہوتا تھا۔

مولانا عبدالنور ندوی سلفی المسلک تھے، مگر وہ اس میں متشدد اور متعصب نہیں تھے، وہ ائمہ اربعہ کی تقلید کرنے والوں کا لحاظ کرتے اور تقلید کی افادیت اور ضرورت کو محسوس کرتے تھے، ان کے ساتھ بھی ان کے سلفی ہونے کو مغایرت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا وہ گھل مل کر اور محبانہ تعلق کے ساتھ رہے، اب وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں کہ وہ اس کی شہادت دے سکیں لیکن ان کے قریبی رفقاء جن کا دن رات ساتھ تھا، وہ شہادت دے سکتے ہیں۔

دراصل ندوۃ العلماء کے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ فقہی اختلاف کو کبھی کشاکش کا باعث نہ بننا چاہئے، اہل سنت کے سب فقہی مسلک قرآن وحدیث سے وابستہ ہیں اس لیے ایک دوسرے کے ساتھ رواداری اور احترام ملحوظ رکھنا چاہئے اور امت اسلامیہ کے موجودہ حالات اس بات کے متحمل بھی نہیں ہیں کہ محض فقہی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کو ضال ومضل قرار دیا جائے اور امت کو بے شمار گمراہیوں میں بانٹ دیا جائے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے تو بعض بعض مرتبہ دیگر فقہی مسلک سے وابستہ کسی شخص کو اپنے مسلک کے مطابق کرنے میں کوتاہی کرتے دیکھا تو ٹوک دیا کہ جس فقہی مسلک کے ماننے والے ہو اس میں کیوں کوتاہی کرتے ہو۔ ندوہ کی یہی رواداری ہے جس کی وجہ سے اس میں شافعی المسلک اور سلفی المسلک طلباء واساتذہ، حنفی المسلک طلباء واساتذہ کے ساتھ اپنائیت سے رہتے ہیں۔ یہ مثال بڑی شاندار مثال ہے جس کو بعض متشدد المسلک لوگ قابل تنقید بھی قرار دیتے ہیں لیکن ندوہ اس سیر چشمی اور اعتدال کو برابر اپنائے ہوئے ہے۔ مولانا کا یہی اخلاق وکشادگی ہے جس کی بنا پر حنفی علماء کے یہاں ان کا جو احترام ہے وہ تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ ہندوپاک کے بڑے سلفی علماء بھی حضرت مولانا کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور محبت کا معاملہ رکھتے ہیں ان میں صادق پور پٹنہ کے مرحوم بزرگ مولانا حکیم عبدالخبیر صادق پوری اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی، مولانا عبدالحفیظ سلفی، مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری، مولانا عبیداللہ کشمیری ثم رائے بریلوی، مولانا مختار احمد ندوی اور دیگر متعدد علماء اہل حدیث شامل ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ندوہ کے دیگر تمام ذمہ داران کی طرف سے مولانا عبدالنور صاحب ندوی کے ساتھ بڑا قدر دانی کا معاملہ رہا ان کی صلاحیتوں کے پروان چڑھنے اور ترقی کرنے سے دلچسپی رہی، اور آج بھی ان کی خوبیوں کا ذکر کرنے میں سب کو خوشی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ سب اس طرح جس طرح ان کے ہم پلہ رفقاء اور اصحاب ذوق وعلم کے معاملہ میں ہے البتہ ان کے کم عمری میں وفات پا جانے سے ان کے ساتھ ہمدردی اور احساس تعلق دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہو رہا ہے۔ مولانا عبدالنور صاحب جب ندوہ آئے تو وہ صلاحیت کے لحاظ سے اپنے درجہ کے ساتھیوں کی طرح ہی تھے، کوئی خاص امتیاز نہ تھا، انھوں نے یہاں پڑھا اور ترقی کی، عالمیت کی، پھر فضیلت کی پھر مدرس رہے۔ مولانا عبدالنور صاحب ندوی نے ندوے میں جو پڑھا اور سیکھا اس میں وہ ان اساتذہ کے جن میں میں بھی ہوں، برسوں شاگرد رہے۔ ان سے ہماری محبت اور تعلق میں اس بات کو بھی دخل رہا کہ وہ ہم لوگوں کے چھوٹے بھائی اور شاگرد کی حیثیت بھی رکھ چکے ہیں وہ خود بھی اس کو محسوس کرتے اور لحاظ رکھتے تھے۔ وہ ہم سب کو عزیز تھے لیکن ان کا کوئی ہمدردان کی تعریف اتنی کرنا چاہے کہ ان کو وہ مقام دے دے جو ان کے ان بڑوں کا ہے جن کو تمام دنیا مانتی ہے اور جانتی ہے تو یہ بات اگر خود مولانا عبدالنور صاحب بقید حیات ہوتے تو ان کی پسند و تائید کی نہیں بن سکتی تھی اور یہ صحیح بھی نہیں ہے، انھوں نے تو اپنے اساتذہ سے جن کے وہ بعد میں رفیق کار بنے، حسب موقع علمی مراجعت ومشورہ سے بھی گریز نہیں کیا اور اظہار اعتراف بھی کیا۔

وہ ایک شریف سنجیدہ اور مثقف صاحب علم تھے، قدرت کی طرف سے ان کو مختصر عمر ملی لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو کافی ترقی کرتے اور ملت اسلامیہ کے ممتاز فرزندوں میں شمار ہوتے۔

ان کے انتقال کو تمام اہل ندوہ نے ایک بڑا خسارہ محسوس کیا، ہم سب دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص ومحبت کا صلہ ان کو آخرت میں اور ان کے پسماندگان کو اس دنیا میں بھی

عطا کرے۔ ان کے انتقال سے جو نقصان ہوا اس کو محسوس کرنا اور ان کی نیکیوں اور خوبیوں کو سراہنا ایک نیک فریضہ ہے، ان کے انتقال کے زمانہ میں ملک ایسے حالات سے گزر رہا تھا کہ پڑے لکھے اور جاہل مسلمان لیڈر اور عوام بہت سخت فکرمندی اور پریشانی کی کیفیت میں تھے، بابری مسجد کا انہدام ہوا تھا اور فسادات نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ایسے حالات میں کام معمول کے مطابق نہیں چل پا رہے تھے، اس لیے بروقت ان پر مضامین نہ آسکے(۱)۔

وہ بہت خوبی کے انسان تھے اور اچھی صلاحیت کے حامل تھے اللہ تعالیٰ ان کو ترقی درجات سے نوازے اور ان کے پسماندگان (جن میں ان کے ہونہار فرزند ذکی نور سلمہ بھی ہیں) کی حفاظت و مدد فرمائے۔ (آمین)

---

(۱) مگر بعد میں لکھنے والوں نے ان پر خوب لکھا اور ان مضامین کا مجموعہ ان کے لائق فرزند مولوی ذکی نور صاحب نے نقوش نور کے نام سے شائع کیا ہے، مولانا عبدالنور ندوی کی صاحبزادی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حدیث وادب کے استاد مولانا محمد یعقوب ندوی صاحب کو منسوب ہوئیں، اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے گھر میں علم ودین کی دولت نہ صرف باقی ہے بلکہ اس کی اشاعت اور فروغ کا کام بھی جاری ہے (م)

مولوی محمد رضوان ندویؒ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عزیز فرزند اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے بھی علمی سند حاصل کرنے والے مولوی محمد رضوان ندوی نے یوم شنبہ ۲۱/ جمادی الثانیہ ۱۴۲۰ھ مطابق ۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو ۴۴ سال کی عمر میں سڑک کے ایک حادثہ میں سر میں چوٹ کھا کر وفات پائی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مرحوم جید حافظ قرآن ذی استعداد عالم دین تھے، اور علوم دینیہ کے لیے قائم مدارس کو تقویت پہنچانے کی فکر کرنے والے تھے، وہ تعلیم وتربیت کے کام میں پورے انہماک سے مشغول تھے، وہ سعودی عرب کی وزارت امور دینی سے مبعوث بھی تھے۔ اس سلسلے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس تفسیر کی حیثیت سے منسلک تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے بچیوں کی دینی وعربی تعلیم کا ایک مدرسہ بھی لکھنؤ شہر میں قائم کیا تھا، جس کو ترقی دے کر شہر کے مضافات میں منتقل کر دیا تھا۔ اور جامعۃ المؤمنات الاسلامیہ کے نام سے اس کو بہت اچھے معیار سے چلا رہے تھے، اس میں بچیوں کی دینی تعلیم تفسیر وحدیث وفقہ کے ساتھ عربی زبان وادب کی تعلیم ومشق کا بھی انتظام رکھا تھا۔ وہ اس کے سرپرست اور منتظم تھے۔

مرحوم اپنے اختیار کردہ ملی ودینی تعلیمی کاموں میں بڑے باشوق وباحمیت تھے، دینی وتعلیمی کوششوں کو تقویت دینے والے وسائل کے لیے اپنی صلاحیت وہمت کے مطابق فکر کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء ان کا اصل مادر علمی تھا۔ چنانچہ اس سے ان کو بہت گہرا تعلق تھا، اس کی شاخوں کی بھی ترقی وبقا کے لیے کوشاں رہتے اور مشوروں وتعاون سے کام لیتے تھے، اپنے اساتذہ کے ساتھ نیازمندانہ مخلصانہ ربط رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اہل تعلق کے دل میں گھر کر لیا تھا، اس لیے ان کے حادثۂ وفات کو اہل تعلق میں بہت محسوس کیا

گیا۔اوران کی جدائی کو مدارس دینیہ کے لیے ایک بڑا نقصان سمجھا گیا۔

مولوی محمد رضوان مرحوم لکھنؤ کے ایک صدیقی خاندان کے فرد تھے،ان کے والد محمد عثمان عرف اعجاز صاحب لکھنؤ کی زردوزی کی صنعت کے ماہراور کارخانہ دار تھے،وہ اپنے فن میں معاصرین میں ممتاز مقام کے مالک رہے ہیں۔ان کا یہ اثر ان کے صاحبزادگان میں بھی منتقل ہوا،لیکن مولوی محمد رضوان مرحوم کوان کے دادا نے بچپن ہی میں حفظ قرآن میں لگایا،جس سے وہ ترقی کرکے عالم دین بنے اوراپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے اقران میں ممتاز ہوئے۔مبعوث ہونے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی زبان اور تفسیر قرآن کے اسباق پڑھاتے رہے،پھراپنے قائم کردہ جامعۃ المؤمنات میں بھی مختلف اسباق کی تعلیم دی۔تعلیم سے ان کی عملی دلچسپی سے بچیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ان کی اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ جامعۃ المؤمنات تیزی سے ترقی کرنے لگا۔اوراس نے بچیوں کے ایک مؤقر جامعہ کی حیثیت سے اپنی اہمیت محسوس کرائی۔

مولوی محمد رضوان صاحب بہت ملنسار،ہنس مکھ اور سب کے ہمدرد اور دوست تھے ،بڑے فراخ دست اور دوست نواز تھے۔حضرت مولانا علی میاں صاحب سے بہت احترام ومحبت کا تعلق رکھتے تھے۔جس کے نتیجہ میں حضرت مولانا کے عزیزوں سے بھی قریبی تعلق وربط ہوگیا تھا۔بعض سے شاگردی کا بھی تعلق تھا۔وہ اپنے تمام اہل تعلق سے نہایت اپنائیت کے ساتھ فرد فرد سے محبت وتعاون کا معاملہ رکھتے تھے،حضرت مولاناؒ کا بھی عزیز مرحوم سے اپنائیت کا تعلق تھا اور وہ ان کے قدرداں تھے اوراپنے کاموں میں معاونت بھی لیتے تھے،اس لیے حضرت مولاناؒ نے ان کے حادثۂ وفات کو بہت محسوس کیا اور حادثے کی نوعیت معلوم کرکے اسے شہادت سے تعبیر کیا،اور باوجود اپنی علالت کے رائے بریلی سے خبر سنتے ہی لکھنؤ تشریف لائے،اورانھوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔

وہ مختلف النوع ہمدرد ملت لوگوں سے ملتے اوران کی کوششوں میں مخلصانہ طور پر ہاتھ بٹاتے،اور مشکل سے مشکل کام کی انجام دہی کے لیے پورا تعاون کرتے۔شہر کے اندر

بھی کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی، لوگ ان سے ربط وتعلق رکھتے اور ان کی دوستی ومحبت سے فائدہ اٹھاتے، تعلیمی وسماجی کام کو انھوں نے اتنی فکرمندی کے ساتھ اختیار کیا کہ وہ آخر میں ذہنی طور پر بہت مشغول ومتفکر رہنے لگے تھے۔ لیکن چونکہ جوان تھے اس لیے سب کام خواہ کیسا ہی مشکل ہو وہ خود کرنے کی کوشش کرتے اس طرح بہت مشغولیت اور دوڑ دھوپ کی زندگی گزارنے لگے تھے۔ بہرحال متعدد جہات کی خصوصیات کے حامل تھے، چنانچہ ان کے انتقال کو صرف ندوے نے ہی نہیں بلکہ سارے مسلمان شہریوں نے بھی بہت محسوس کیا اور نماز جنازہ میں بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ مرحوم کا کنبہ والدین کے علاوہ کئی بھائیوں اور بہنوں پر مشتمل ہے۔ بھائیوں میں ان کے ہم ذوق ان کے بڑے بھائی محمد عرفان صاحب ہیں جو ان کے ہم مذاق ہونے کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک بھی رہتے تھے، ان کے لیے یہ صدمہ زیادہ سخت رہا۔

مرحوم کے والدین کے لیے جو الحمدللہ باحیات ہیں یہ صدمہ جو جوان بیٹے کی صورت میں ان کے سامنے آیا ان کے دل کو ہلا دینے والا تھا اور ظاہر ہے کہ جس کے حادثۂ وفات سے ان کے شناساؤں کی آنکھیں پُرآب ہوگئی ہوں والدین کے لیے کیسا صبر آزما واقعہ ہوگا!

مرحوم نے اپنے پسماندگان میں والدین اور بھائی بہنوں کے علاوہ اہلیہ اور کئی خوردسال بچے بچیاں چھوڑیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو قوت عطا فرمائے اور ان کی پرورش کے باعزت اسباب مہیا فرمائے۔ آمین

ان کے دو بیٹے بلوغ کو پہنچے ہیں ایک عبدالسلام اور دوسرے عبیدالرحمٰن، دونوں ابھی زیرتعلیم ہیں۔ آخرالذکر نے دبی کے ایک اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی ہے اور ہنر بھی سیکھا ہے(۱)۔

مرحوم تعمیرحیات کی ترقی وتوسیع اشاعت کی فکر بھی رکھتے تھے اور کچھ دنوں اس کی تحریری کمیٹی میں بھی رہے۔ مدیر تعمیرحیات سے بھی ان کا مخلصانہ تعلق رہا ہے، اس کے علاوہ جمعیۃ شباب اسلام سے نکلنے والے ماہنامہ ''بانگ درا'' کے وہ مدیر بھی رہے۔ خواتین کے

رسالہ ماہنامہ ''رضوان'' میں انھوں نے تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا تھا، مگر وہ ابھی ابتدائی مرحلے میں ہی تھا، اور چند ہی دروس شائع ہوئے تھے۔

مرحوم کا مجھ سے ربط ان کے آغاز تعلیمی سے ہوا اور انھوں نے اس کو بڑے اخلاص و تعلق خاطر کے ساتھ تسلسل قائم رکھا جس کی وجہ سے میرے لیے یہ حادثہ ایک عزیز خاندان کے حادثہ کی طرح کا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے اس تعلق خاطر کو اپنی مرضیات کے زمرہ میں شامل فرماتے ہوئے قبولیت و اجر کا درجہ عطا فرمائے۔ آمین۔

مولوی ابوالبرکات فاروقی ندویؒ

ادھر قریبی عرصے میں جن عزیز ترین احباب اور محترم شخصیتوں نے داغ مفارقت دیا ان میں ایک نام مولوی ابوالبرکات فاروقی ندوی کا بھی ہے، جنھوں نے اپنا ایک علمی مقام بنانے کے بعد دعوتی واصلاحی میدان میں قدم رکھا اور رخصت کے بجائے عزیمت کو اختیار کیا، اور اپنے دعوتی کاموں کو تقویت پہنچانے کے لیے مدرسہ ریاض العلوم کے نام سے کھجرانہ اندور میں ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اور درجات بلند فرمائے، ان کی شخصیت کے تعارف کے لیے مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کی ایک تحریر پیش کی جارہی ہے جو انھوں نے ''تعمیر حیات'' کے لیے لکھی تھی، وہ لکھتے ہیں:

''۱۷/نومبر ۱۹۹۹ء کو اچانک اندور کے مدرسہ ریاض العلوم کے مؤسس اور ناظم اعلیٰ مولوی ابوالبرکات فاروقی ندوی کا سحر کے وقت انتقال ہوگیا، موصوف دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ان فضلاء میں تھے جنھوں نے اس کے ابتدائی زمانے میں تعلیم حاصل کی تھی، جب کہ علامہ شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ اس کے نائب صدر تھے، اور علامہ شیخ محمد بن ناصر العبودی امین عام تھے، اس بیچ کے اکثر طلبہ نائیجیریا، یوگنڈا اور دوسرے افریقی ممالک میں افریقی بچوں کو تعلیم دینے کے لیے مبعوث کیے جاتے تھے، اگر مولانا ابوالبرکات چاہتے تو بغیر کسی دشواری کے کہیں نہ کہیں بھیج دیے جاتے، اور ایک آسودہ حال زندگی گزارتے، لیکن انھوں نے جامعہ اسلامیہ کے مقاصد دعوت اور ندوۃ العلماء کی مقصدیت تعلیم ودعوت دونوں کو ہمیشہ ترجیح دی اور اپنے وطن میں ایک بہت سنگلاخ زمین میں مدرسے کی بنیاد ڈالی، جس میں ان کو جان توڑ محنت کرنا پڑی، اور ایسے

عناصر سے نمٹنا پڑا جو ندوۃ العلماء اور مدینہ منورہ کے فارغ کو سرے سے مسلمان ہی نہیں سمجھتے تھے اور ان کی طرف سے اس درجہ سختی تھی کہ وہاں اپنا مدرسہ قائم کر کے پیر جمانا تو بڑی بات ہے وہاں سے گزرنا مشکل تھا، مالی بے سروسامانی اپنی جگہ پر قائم تھی، مگر مرحوم نے اپنے ایمانی جوش، عالمانہ اخلاص اور اللہ کی تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے زمین شور میں سنبل اُگایا، ان کے رفقاء سے میں نے سنا ہے کہ جب مدرسے کی ابتدائی کوٹھریاں تعمیر ہو رہی تھیں اور اس وقت وہ سرزمین جو ایک ویرانہ تھی زہریلے کیڑوں اور سانپ بچھوؤں کی کثرت تھی، اور دوسری طرف سامان عمارت کی حفاظت کے لیے کسی کا رہنا بھی ضروری تھا، مولانا ابوالبرکات نے وہاں راتیں گزاریں اور اللہ پر بھروسہ کر کے ہر قسم کے حشرات کا تنہا مقابلہ کیا، اب وہ مدرسہ اس کی خوشنما اور مضبوط مسجد ان کی ہمت کی نشانی ہے اور مدرسہ عزم و کردار کی کہانی ہے۔

مولوی ابوالبرکاتؒ نے اپنے کام کی تکمیل کے لیے سفارشوں اور امت کے معروف افراد کا سہارا نہیں لیا، ان کا کام ان کے مدرسے کی خود سفارش کر رہا تھا، بیرونِ ملک و اندرونِ ملک کے جو افراد وہاں گئے انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا اس بنا پر جو خدمتیں کر سکتے تھے کرتے رہے، مرحوم نے زندگی بھر جان توڑ محنت کی، اپنا نام اونچا کرنے کے بجائے دین کی سربلندی کو پیش نظر رکھا، مرحوم فاروقی نے اپنے عمل سے ایک نمونہ پیش کر دیا کہ اگر کوئی جدوجہد اخلاص کے ساتھ کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی غیبی تائید حاصل ہوتی ہے۔

وہ ندوے قابل احترام فرزند تھے، جس نے ندوے کے رسوخ اور نفوس سے اتنا فائدہ نہیں اٹھایا جتنا کہ اس کا نام بلند کیا، وہ مرشد و مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے قابل اعتماد افراد میں تھے، اور حضرت مولانا نے گزشتہ رمضان میں یا اس کے بعد ان کو اجازت مرحمت فرمائی تھی، امید ہے کہ ان کے اخلاف اور احباب اور معاونین اس ادارے کو باقی رکھیں گے اور پروان چڑھائیں گے۔" (۱)

مولوی ابوالبرکات صاحب ندوی اندوری کے اندر داعیانہ صفت شروع سے پائی جاتی تھی، اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھیں شروع سے اپنے عہد کے ممتاز داعیوں کی صحبت ورفاقت بچپن سے میسر آئی، شروع میں وہ داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلویؒ کی خدمت میں مرکز نظام الدین دہلی میں رہے، اور وہیں رہ کر اس کے تعلیمی ادارے مدرسہ کاشف العلوم میں حفظ کی تعلیم مکمل کی، حفظ مکمل کر کے وہ بھوپال میں دارالعلوم تاج المساجد آ گئے اور وہاں عربی ودینیات کی تعلیم حضرت مولانا محمد عمران خاں صاحب کی نگرانی میں حاصل کی اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی سرپرستی میں رہ کر اکتساب فیض کیا، اور علوم دینیہ وعربیہ میں اچھی لیاقت پیدا کی، پھر ۱۹۶۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں بطریق تعلیم وحصول برکات داخلہ لیا، اور وہاں سات سال گزارے، مدینہ منورہ کے سفر سے پہلے انھوں نے اندور میں رانی پور کے علاقے میں ریاض العلوم کے نام سے تعلیم گاہ قائم کردی تھی اور درس وتدریس کا سلسلہ اور عوام کے لیے الگ درس قرآن کا سلسلہ کر دیا تھا، پھر مستقل بدعت کے گڑھ میں ادارہ قائم کرنے کا عزم کیا، اور وہاں کے بعض باہمت اور مخیّر لوگوں کے تعاون سے کھجرانہ (اندور) میں جامعہ ریاض العلوم کی داغ بیل ڈالی، جس میں ان کو سخت ترین حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور جان ومال کی ذرا پروانہ کی، اور انھیں پھر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، اس طرح جہاں دینی کام صفر پر تھا اس کو انھوں نے عروج تک پہنچایا، اس کے ساتھ وہ دعوتی سفر بھی کرتے، جن ممالک کے انھوں نے سفر کیے ان میں جرمنی، ماریشیس، کینیا، ممباسا، ایتھوپیا، یوگنڈا، ملاوی وغیرہ دوسرے ممالک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، یوگنڈا کا سفر ان کے یادگار کی حیثیت رکھتا ہے کہ جب وہ ۱۹۸۴ء میں وہاں گئے وہ ایک مسجد میں محراب سنانے کا اتفاق ہوا جو ایک ٹیلے پر تھی، مسجد کے کچھ فاصلے پر ایک عیسائی بستی تھی، جس میں ایک بزرگ شخص شدید بیماری میں مبتلا تھے، اور صاحب فراش تھے، مسجد میں محراب سنانے پر قرآن کی آواز جب ان کے کانوں میں

پہنچی تو اسے بڑا اچھا محسوس ہوا، کئی دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا، ایک اور اس شخص نے اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے، اور گھر والوں نے معلوم کر کے بتایا کہ ہندوستان سے کوئی عالم یہاں آئے ہیں اور قرآن سنا رہے ہیں، اس بیمار شخص نے مسجد کے پاس جا کر سننے کی خواہش ظاہر کی اور اس مریض کو بستر سمیت لے جا کر مسجد کے پاس لیٹا دیا، قرآن کی دلفریب آواز اس کے دل کو چھو گئی اور اس نے مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور کہنے لگا، شیخ آپ جو چیز پڑھتے ہیں اس میں مجھے بڑی روحانیت لگتی ہے، مجھے اور پڑھ کر سنایئے، مولوی ابوالبرکات صاحب نے اس کو قرآن پڑھ کر سنایا اور چند آیتیں پڑھ کر دم کیں، جس سے اس کی طبیعت میں افاقہ ہوا، اور طبیعت سنبھلنے لگی، یہی سلسلہ لگا تار تین چار روز تک چلتا رہا، اس کے بعد اس نے بھی پڑھنے کی اجازت چاہی، جس پر ابوالبرکات صاحب نے کہا: اس کے فائدے کے لیے ایمان شرط ہے، یہ بات سنتے ہی اس کے دل میں ایمان کی روشنی جاگی، اور وہ ایمان قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا، اسی کے ساتھ اس کے خاندان کے کچھ لوگوں نے ایمان قبول کیا، اور سلسلہ آگے بڑھتا رہا، اور تقریباً ڈیڑھ سو (۱۵۰) لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

مولوی ابوالبرکات صاحب کا خاندان فریدی فاروقی خاندان ہے، ان کے مورث اعلیٰ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر مسعود اجودھنی کا سلسلۂ نسب سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، بیعت وارادت کا تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے قائم کیا تھا، اور ان کی وفات کے بعد ان کا یہ تعلق اپنے استاد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے قائم ہوا، اور ان کے مجاز بھی ہوئے، امید تھی کہ راہ سے بھی وہ دین کی تقویت کا بڑا ذریعہ بنیں گے کہ وقت موعود آ پہنچا اور انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

اس سانحہ کو ندوۃ العلماء کے حلقے میں بہت محسوس کیا گیا، وہ علم ودعوت کے لیے جو کام کر رہے تھے وہ بہت اہم تھا، ان کے انتقال سے اس کو بڑا خسارہ ہوا، خاص طور پر مالوہ کے علاقے میں اس کام کی بڑی ضرورت تھی، جس کو صدمہ پہنچا، حضرت مولانا نے بھی

صدمہ محسوس کیا، اس موقع پر ایک تعزیتی مکتوب پیش کیا جارہا ہے جو حضرت مولانا نے ان کے اخلاف کو ارسال کیا تھا، اس سے اس تعلق کا پتا چلتا ہے جو دونوں کے درمیان تھا۔

عزیزانِ گرامی قدر عرفان، حافظ ریحان وسلمان سلمہم اللہ تعالیٰ وبارک فیہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم الحروف اپنے عزیز دوست وداعی اور معلم مولوی ابوالبرکات صاحب مرحوم کی وفات پر آپ سے تعزیت کرتا ہے، افسوس ہے کہ ہمارے یہ عزیز دوست داعی الی اللہ، ناشر تعلیم اس دنیا سے رحلت کر گئے، اور صرف اندور نہیں بلکہ یہ عہد ایک مبارک اور مصروف خادم دین وعلم کی ہستی وزندگی سے محروم ہوگیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے، اور ان کے فیض وافادے کا سلسلہ جاری رکھے، زمانہ ایک دینی درسگاہ اور فاضل وسعید ہستی سے محروم ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجے بلند فرمائیں، اور ان کی دینی جدوجہد کو ان کے فرزندوں اور دوسرے تربیت یافتہ حضرات کے ذریعے جاری رکھے، آپ لوگوں کی عمر میں برکت ہو، اور ان کی قائم کردہ درسگاہ جاری اور قائم رہے، ہماری طرف سے آپ تینوں بھائی اور ان کے تربیت یافتہ افراد دلی تعزیت قبول کریں، اور ان کو حیات طیبہ عطا ہو، وما ذلك على الله بعزيز

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

۲۲/نومبر ۱۹۹۹ء

مولانا ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندویؒ

مولانا سید محمد لقمان اعظمی ندویؒ جو کہ ایک پُر جوش خطیب اور دل دردمند وفکر ارجمند کے حامل فاضل ندوہ اور ایک اچھے مصنف تھے مختصر سی علالت کے بعد مؤرخہ ۷/جنوری ۲۰۰۱ء کو سعودی عرب میں انتقال کر گئے۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون۔ للّٰه ما أخذ وله ما أعطى، وكل شيئ عنده بأجل مسمى۔

مولانا ڈاکٹر سید محمد لقمان اعظمی ندوی ندوۃ العلماء کے ان فرزندوں میں تھے جنھوں نے اپنی علمی صلاحیتوں سے اسلامی تعلیمات کی تعلیم وترویج میں بڑا قابل قدر حصہ لیا، انھوں نے ندوۃ العلماء سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے کے بعد جامعہ ازھر مصر سے اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کی۔

ان کی علمی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے سعودی عرب کے شہر حائل کے ٹیچر ٹریننگ کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرری ہوئی جو رٹائرمنٹ تک قائم رہی، کالج کے اساتذہ اور طلباء میں ان کا بڑا وقار اور نسبت حاصل رہی، حدیث شریف ان کا خاص موضوع تھا، اس مضمون پر ان کے درس ہوتے تھے، جن کی قدر طلباء کی نظر میں بہت تھی انھوں نے اپنی عمر کے آخری سالوں میں ان دروس کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا نیز ان کی افادیت کی بنا پر اردو میں بھی ان کا ترجمہ ہوا جس کو بڑی قدر سے دیکھا جاتا ہے اور شائقین فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مولانا موصوفؒ نے حدیث کے موضوع کے ساتھ ساتھ اسلامی تاریخ سے بھی دلچسپی رکھی اور سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ان کے شہر پاک مدینہ منورہ کی جو سماجی وثقافتی زندگی تھی اسکو بھی تحقیق کر کے ایک کتاب کی صورت میں تیار کی

جو اسلامی کتب خانوں کی زینت ہے اور اہل علم اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں انھوں نے ندوۃ العلماء میں اپنی طالب علمانہ دور کے وقت سے عربی زبان وادب سے خصوصی دلچسپی لی اور اپنی قابلیت اس میں اچھی پیدا کی جس سے انھوں اپنے مطالعہ وتحقیق میں نیز درس وتدریس میں بہت کام لیا وہ ادب عربی میں اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔

ندوۃ العلماء سے ان کو جو ربط وتعلق تھا تھا وہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک جاری رہا خاص طور پر ندوۃ العلماء کے مؤقر ناظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے تو ان کو عقیدت تھی وہ جب تعطیلات میں لکھنؤ آتے تو مولاناؒ سے ملتے اور ان کی صحبت میں کچھ وقت گذارنے کا اہتمام کرتے، ندوۃ العلماء کے اپنے سابق اساتذہ سے بھی محبت واحترام کے ساتھ ملتے اس طرح سب ہی افراد ندوۃ العلماء ان کو اپنی تعلیمی خاندان کا قریبی فرد سمجھتے تھے۔

مجھ سے مولانا موصوفؒ کا ربط وانس ان کی طالب علمانہ زندگی کے عہد سے شروع ہوا تھا جو تادم حیات قائم رہا، مجھے بھی ان سے خاص انس وتعلق رہا اور ان کی کتب کی بڑی قدر رہی اور اس تعلق سے بڑی مسرت رہی۔

مولانا موصوفؒ بڑی مرنجامرنج اور خوش مذاق طبیعت کے آدمی تھے ان سے ملنے والا عموماً خوش ہوتا اور الفت محسوس کرتا۔

ان کے والد صاحب کا انتقال ان کی کم عمری میں ہوگیا تھا انھوں اس کے باوجود اپنے بھائیوں کے تعاون سے اپنی سیرت کی اچھی تعمیر کی اور اس میں اللہ تعالی کی طرف سے ان کی بڑی مدد ہوئی، وہ اعظم گڈھ کے علاقہ کے اور ایک سید خاندان کے فرد تھے، علاقہ کی محنت اور مقصد کے لیے لگن کی صفت کے حامل تھے اور خاندانی بنیاد پر ان میں نرمی اخلاق اور حسن اخلاق کی صفات کی خوشبو آتی تھی۔

نکاح کے سلسلے میں ان کو اردو کے مایہ ناز شاعر حضرت نشورؔ واحدی کی صاحبزادی کی رفاقت حاصل ہوئی اور ان کا گھر ذوق سخن کا بھی حامل بنا، سعودی عرب کے شہر حائل میں تعلیمی مقبولیت کی بنا پر ان کی زندگی کا بڑا حصہ وہیں کے ماحول میں گزرا، انھوں نے وہاں کے ماحول

سے ہم آہنگی اختیار کی لیکن ایک مربی اور معلم کی حیثیت سے، چنانچہ پوری بستی میں ان کا ایک وزن تھا جو وہاں کے فارغ ہونے والے عرب طالب علموں کے اس طرز عمل سے ظاہر ہوتا تھا، جو وہ ان کے معاملے میں اختیار کرتے تھے، ان کی عربی بھی اس بات کا اچھا سبب تھا، اور اتفاق یہ ہوا کہ ان کا انتقال بھی اس خطہ کے ایک اسپتال میں ہوا اور ان کے اس آخری وقت میں وہاں کے لوگوں نے ان کو محبت وقدر کے ساتھ عالم فانی کے لیے رخصت کیا۔

مولاناؒ کی علمی صلاحیت کی شہرت ان کو جنوبی افریقہ کی طرف بھی کھینچ لے گئی، وہاں وہ توسیعی خطبات دینے کے لیے گئے اور حدیث شریف پر خطبات دیئے اور مقبولیت حاصل رہی۔

مولاناؒ کو شکر کا عارضہ بھی تھا اس کے بنا پر جسمانی کمزوری کا سابقہ رہا جس کی وجہ سے وہ بڑی عمر سے قبل بڑی عمر کی کمزوری سے متأثر رہے جو آخر میں اچانک قلب کے عارضہ میں تبدیل ہوگئی جسکے لیے آپریشن تجویز ہوا اس آپریشن سے مولانا کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور وہ اپنے مالک کے پاس چلے گئے۔ إناللّٰہ وإناالیہ راجعون۔

مولانا سید محمد لقمان صاحب کے مجھ سے ربط وتعلق کی مدت خاصی طویل رہی، یہ ندوۃ العلماء میں اپنے درجہ کے ان طلبہ میں سے تھے جو ممتاز اور فائق ہوئے اور جنھوں نے علم کی اشاعت کا کام اپنے اپنے مقام اور حیثیت سے نمایاں طور پر انجام دیا، ان میں مولانا ناصر علی لکھنوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث کے استاد اول کی حیثیت سے انجام دے رہے ہیں اور اپنے علم وتفقہ میں شہرت ومقبولیت رکھتے ہیں، انھیں میں ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی (حیدرآباد) مولانا محمد لقمان خان ندوی (بھوپال) اور مولوی محمد عباس گیاوی بھی تھے، جنھیں خدمت علم ودین کے مواقع ملے، اور ان مواقع سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا، ان میں ڈاکٹر سید لقمان اعظمی ندوی نے اپنی کتابوں کی وجہ سے زیادہ شہرت پائی، مگر انھوں نے اپنے کو چھوٹا ہی سمجھا، اور انھوں نے اس ربط وتعلق کو محبانہ طریقہ سے قائم رکھا، جو ان کو اپنی مادر علمی ندوۃ العلماء اور وہاں کے لوگوں سے تھا، اور چونکہ مجھ کو بھی ان سے انس بھی بہت رہا، اس کی وجہ

سے ان کے واقعۂ وفات سے دل کو بہت صدمہ پہنچا، یہ قدرت کا تقدیری امر ہے اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اس کو جانا ہے جب انبیاء نہیں رہ سکے تو پھر دوسروں کے لیے کیا گنجائش ہے بس اس بات یہ ہے کہ آدمی اس حیات میں امتیازی کام کر کے اور دنیا کو کچھ دیکر جائے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مولانا سید لقمان صاحب اس کے لحاظ سے بھی کامیاب گئے، اللہ تعالی ان کو اپنے یہاں بہترین جزا اور مقبولیت واجر کا مقام عطا فرمائے اور ان کے نمونے سے دوسرے فائدہ اٹھائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد یونس نگرامیؒ ندوی

ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ کی ۸؍تاریخ کو (بلاد عربیہ میں ۹؍ذی الحجہ عرفہ کا دن تھا) ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی نے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوکر عالم باقی کو کوچ کیا، وہ شکر اور بلڈ پریشر کے پرانے مریض تھے، لیکن اپنی کمزور صحت کے باوجود اپنی علمی وملی ذمہ داریوں میں پوری طرح مشغول رہتے تھے، کہ اچانک ان کو یرقان کی شکایت ہوگئی جس نے خطرے کی شکل اختیار کرلی اور وہ باوجود شہر کے اعلیٰ سے اعلیٰ اسپتال میں علاج کرانے کے ایک عشرہ سے زیادہ مرض کا مقابلہ نہ کرسکے اور اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔

ڈاکٹر یونس نگرامی ایک علمی ودینی خاندان کے چشم وچراغ تھے ان کے دادا مولانا محمد ادریس نگرامی ضلع لکھنؤ کے مردم خیز قصبہ نگرام میں ایک بڑے عالم اور داعی کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور قرب وجوار کے مسلمانوں میں ان کا دینی وعلمی فیض پھیلا، پھر ان کے صاحبزادہ اور ڈاکٹر صاحب کے والد مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے علمی ودینی شہرت حاصل کی، انھوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور بطور خصوصی علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو علم التفسیر میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، وہ ندوۃ العلماء میں استاد ہوکر شیخ التفسیر کے منصب پر فائز ہوئے پھر انہی کی سرپرستی میں ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی نے تعلیم حاصل کی، پہلے دینی تعلیم میں ندوۃ العلماء سے عالمیت کی تکمیل کی پھر اپنے شہر کی عصری یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی پھر یونیورسٹی ہی میں لکچرر ہوئے اور جلد ہی پروفیسر کا منصب مل گیا، شہر کے علمی وادبی اداروں میں ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، ان میں سے کئی اداروں کے رکن بھی منتخب ہوئے، اور بعض کے چیئرمین ہوئے جن میں یوپی کی اردو اکیڈمی اور خود ان کی قائم کردہ انجمن جمعیۃ المثقفین

المسلمین قابل ذکر ہیں، وہ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن منتخب ہوئے، ندوۃ العلماء ان کا مادرِ علمی تھا اور بعض خصوصی مسائل میں اپنے مفید مشوروں اور تعاون سے مدد دی، اور بعض موقعوں پر انھوں نے منتظمین ندوۃ العلماء اور حکومتی انتظامیہ کے درمیان حسب ضرورت وساطت کا بھی فریضہ انجام دیا۔

ڈاکٹر نگرامی مرحوم کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق تھا، یہ تعلق ان کے بزرگوں سے بھی رہا تھا، ڈاکٹر مرحوم کے دادا صاحب کے زمانہ سے یہ ربط چلا آرہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے شاگردی کا ربط بھی حاصل ہوا، ان سب اسباب کی بنا پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کو اپنے خورد عزیز کی طرح سمجھتے اور خیال کرتے تھے۔

ڈاکٹر یونس نگرامی کی نظر ملت اسلامیہ ہند کے مسائل پر اچھی تھی وہ اخبارات کا مطالعہ اس توجہ کے ساتھ کرتے تھے، اور یہ دیکھتے تھے کہ ملک کے ہندو فرقہ وارانہ انتہا پسندی کا ذہن رکھنے والوں کی طرف سے ملت اسلامیہ کے لیے نقصان دہ کیا چیزیں ہیں اور ان کی طرف سے کیا عملی اقدام کئے جارہے ہیں، وہ ایسی خبروں اور بیانات کو جو مسلم ملت کے لیے تخریبی اثرات کے حامل ہیں نوٹ کرتے تھے اور ان کو ترتیب دے کر پندرہ روزہ ''الرائد'' کے شمارے میں پابندی سے شائع کرتے تھے، اس طرح ''الرائد'' کے قارئین کو معلومات یکجا مل جاتی تھیں، انھوں نے ثقافتی وعلمی معلومات پر کئی سیمینار بھی منعقد کرائے، اور اردو کی ترقی کے لیے بھی متعدد منصوبے تیار کئے اور ان پر عمل کرایا، اس کے لیے یوپی کی نیم سرکاری انجمن فخر الدین علی احمد میموریل سوسائٹی کے پروگرام میں اور اردو اکیڈمی اتر پردیش کے پروگرام میں شامل کرائے اور پھر ان کو انجام بھی دلوایا، وہ فخر الدین علی احمد میموریل سوسائٹی کے بڑے فعال رکن تھے، اور دوسری نیم سرکاری انجمن اردو اکیڈمی کے چیئر مین بھی رہے، دونوں اداروں میں وہ اپنی فعالیت کی وجہ سے بڑے اثر انداز رہے، اور متعدد جرأتمندانہ اقدام کئے اس میں اردو کے صاحب اسلوب ادیب

مولاعبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالحئ حسنیؒ پر بھی کامیاب علمی سیمینار منعقد کرائے، ڈاکٹر محمد یونس نگرامی نے اپنی اصل تعلیم دینی درسگاہوں میں حاصل کی پھر اس میں عصری تعلیم کا اضافہ کیا اور ڈی لٹ تک ڈگری حاصل کی، انھوں نے اپنی سمجھ اور فعالیت کے ذریعہ یونیورسٹی میں اچھا اثر ورسوخ حاصل کرلیا تھا۔

دوسری طرف ملک کے سیاسی قائدین اور حکام وقت کی نظر میں بھی بڑی حیثیت کے مالک بنے چنانچہ بعض ان مسائل میں جو مقامی اہل اقتدار کے ذریعہ حل نہ ہوسکے، اس سلسلے میں وہ مرکزی اہل اقتدار سے رابطہ قائم کرنے میں دشواری محسوس نہیں کرتے تھے اور اس طریقہ سے بعض مشکل مسائل کے حل میں اہل ضرورت کو ان کی مدد حاصل ہوتی۔

وہ قلم وزبان دونوں کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کی تحریریں شگفتہ اور مفید مواد پر مشتمل ہوتی تھیں، وہ عالم دین بھی تھے، ادیب اور دانشور بھی تھے، انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، ڈاکٹر یونس صاحب کی صلاحیتوں میں تنوع تھا، انھوں نے مختلف موقعوں پر اپنی صلاحیت کا ثبوت دیا، اپنے ملک کے اندر اہل علم اور اہل اقتدار دونوں حلقوں سے ان کا ربط تھا، اس کے ساتھ ساتھ بیرون ملک میں بھی ان کو تعارف حاصل ہوگیا تھا، انھوں نے اولاً جامعہ ملیہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ایک سال گزارا تھا، پھر حجاز کے اپنے سفروں کے ذریعہ ربط پیدا کیا تھا، سعودی عرب کے اسلامی امور کے وزیر ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی اور رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف اور بعض دوسری اہم شخصیات سے ان کو تعارف حاصل تھا اور اس تعارف سے انھیں بعض مفید کام انجام دینے میں مدد ملی، رابطۂ عالم اسلامی کا سکریٹریٹ ہندوستانی مسلمانوں کے بعض امور میں ان سے بھی معلومات حاصل کرتا تھا، اور اس سلسلے میں ان کو مشیر بنالیا تھا۔

ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق پشتینی تھا، ان کے والد اور دوسرے اعزہ نے ندوہ میں تعلیم حاصل کی تھی، والد تو بعد میں ندوہ کے شیخ التفسیر ہوئے اور ندوہ کے مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے، یہ رکنیت بعد میں ڈاکٹر محمد یونس کو بھی حاصل ہوئی اور انھوں نے ندوہ کے مفاد

میں اچھا تعاون کیا۔

ڈاکٹر محمد یونس نگرامیؒ اور ان کے والد ماجد مولانا محمد اویس نگرامی کا ربط حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے عزیزوں سے ایک طرح سے خاندانی ربط وتعلق کی شکل کا تھا، اور اسی طرح کے ربط وتعلق کو دونوں طرف سے برابر قائم رکھا گیا، اسی کا یہ اثر تھا کہ ڈاکٹر محمد یونس صاحب کا ربط ہم سے بھی خاصا رہا، وہ اسی محبانہ تعلق سے ملتے اور ندوہ اور ملت اسلامی کے مسائل میں تعاون دیتے اور علمی وادبی کاموں میں شرکت کرتے تھے، اس طرح ان سے قریبی ربط قائم ہوگیا تھا، اور تعلق بڑھ گیا تھا، اس طرح ان کے انتقال کا سانحہ ہم لوگوں کے لیے خاندانی سانحہ کی طرح تھا۔

ڈاکٹر محمد یونس نگرامیؒ کی صلاحیتوں اور ان کے ذریعہ سماجی اور علمی کاموں میں مفید حصہ لینے کے پیش نظر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ترقی کر کے ملک کے ممتاز اور اہم شخصیت کا مقام حاصل کریں گے، اور ممکن ہے کہ وہ ایسے منصب تک پہنچیں، جس سے ملک وقوم اور خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں خاصی بڑی مدد حاصل ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے لیے یہی عمر لکھی ہوئی تھی جس کو پورا کر کے وہ اس طرح دنیا سے رخصت ہوئے کہ لوگوں کو یہ واقعہ اچانک واقعہ محسوس ہوا، اور ان سے علمی، سماجی اور ملی کاموں میں جو مزید فائدوں کی امید کی جاتی تھی، وہ اچانک ختم ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کی بیش از بیش مغفرت فرمائے اور ان کے چھوڑے ہوئے مفید کاموں کے لیے دوسروں کو توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

وہ اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ کر گئے، جو اہلیہ، بیٹی اور صاحبزادگان پر مشتمل ہے۔

مولوی شفیق الرحمٰن ندویؒ

عزیز سعید مولوی شفیق الرحمٰن ندوی کا سانحۂ ارتحال دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک جید الاستعداد فرزند کا سانحۂ ارتحال تھا جو لکھنؤ میں احاطۂ دارالعلوم میں ان کی قیام گاہ میں پیش آیا اور قلبی تکلیف اس کا ظاہری سبب بنی "لقد مااعطی ولہ مااخذو کل شیٔ عندہ لاجل مسمی"۔

وہ اگرچہ کچھ مدت سے علیل رہنے لگے تھے، لیکن ان کی یہ علالت ذیلی قسم کی علالتوں میں سے تھی، ان کو شکر کا مرض تھا، جس کا آج کل متعدد افراد کو سابقہ ہے اور احتیاط کے ساتھ آدمی اس مرض سے نباہ کر لیتا ہے، ان کو اس کے ساتھ ساتھ نگاہ کی اچانک کمزوری کا عارضہ ہوا جس کے لیے انھوں نے آپریشن کا سہارا لیا، وہ آپریشن غالباً معالج کی کسی کمزوری کے سبب پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا، جس کے لیے ان کو بعد میں کچھ عرصہ تک علاج کی فکر کرنا پڑی، جس سے بعد میں کچھ بہتری پیدا ہوگئی تھی، جوان کے لیے ان کے علمی کام میں معاون بنی، نگاہ کی کمزوری سے قبل وہ علمی کاموں میں پورے انہماک سے لگے رہتے تھے، اور انکے اس انہماک سے متعدد علمی ضرورتوں میں بڑی مدد ملتی تھی۔

مولوی شفیق الرحمٰن صاحب کی علمی صلاحیت ادب اور فقہ میں زیادہ ممتاز تھی، یہ دونوں موضوع ان کی توجہ کا میدان زیادہ بنے، ادب کے دائرے میں انھوں نے اپنی علمی افادیت کا اظہار تدریس کے ذریعہ کیا اور فقہ میں ان کی افادیت ان کی فقہ کی درسی کتاب "الفقہ المیسر" کی ترتیب کے ذریعہ سامنے آئی، اسی کے ساتھ انھوں نے فقہ کی موقر کتاب ہدایہ کی تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا۔

عزیز موصوف سے میں ان کی طالب علمی کے دور سے واقف رہا ہوں اور مجھے ان کی استعداد کا اندازہ اسی زمانے سے ہوگیا تھا، خاص طور پر میں نے ادب کے دائرے میں ان

کی استعداد کو ممتاز پایا اور اسی احساس سے ان کی فراغت پر میں نے چاہا کہ وہ اس مادر علمی میں اپنی یہ صلاحیت صرف کریں اور انھوں نے اس کو پسند کیا، لیکن ان کے کچھ نجی حالات نے ان کی اس راہ پر زیادہ قائم رہنے نہ دیا، لیکن پھر چند برسوں کے بعد ان کو دارالعلوم واپس آنے کا موقع ملا اور وہ یکسوئی کے ساتھ دارالعلوم کی خدمت میں مصروف ہوئے اور اپنی عمر کے اختتام تک اس پر قائم رہے۔ دارالعلوم میں ان کے باقاعدہ آجانے سے ان کا میرے ساتھ ربط مزید بڑھا متعدد کاموں میں مجھ کو ان سے تعاون بھی حاصل رہا، جو میرے ذوق واطمینان کے مطابق تھا۔ دارالعلوم کے تعلیمی امور میں جن باتوں سے میرا تعلق رہا ان میں وہ میرے معاون بنتے رہے، ان کا تعاون مفید اور ضرورت کے مطابق ثابت ہوتا رہا اور مجھے ان کی بڑی قدر محسوس ہوئی۔ جب آنکھوں کے سلسلے میں ان کو کمزوری لاحق ہوئی تو ان کے لیے دشواری بڑھ گئی لیکن مشورہ کی حد تک ان کا تعاون جاری رہا۔

ان کو اردو میں بھی دستگاہ تھی، اردو میں کام ہوتا تو اس میں بھی ان کی پختہ کاری ثابت ہوتی اور عربی میں تو انکو علمی وفنی لحاظ سے پختہ کاری حاصل ہی تھی، اردو میں جب کوئی علمی یا ادبی کام ہوتا تو وہ بھی اچھے انداز سے انجام دیتے تھے۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب نے نئی دہلی سے جب اردو کا ادبی تحقیقی ماہنامہ ذکر وفکر نکالا و یہ اس کے مستقل مضمون نگار ہوئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کا زیادہ وقت تدریسی فرائض کی انجام دہی میں گزرتا تھا، لیکن ضرورت پڑنے پر تعلیم کے بعض انتظامی کاموں میں بھی وہ تعاون کرتے تھے اور ان کا یہ تعاون عموماً میرے توسط سے ہوتا تھا۔ ان کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کی بنا پر خاص طور پر مجھے ذاتی طور پر ان کی بڑی قدر تھی ان کی نگاہوں کی کمزوری کے زمانہ میں وہ علمی مشغولیت کم کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کے تعاون میں ناگزیر طور پر کمی آئی، علاج کے دوران اس کی توقع رہی کہ وہ نگاہوں کی صحت کے بعد اپنے قیمتی تعاون کو بحال کرسکیں گے اور وہ واقعتاً بتدریج ان کی صحت کے ساتھ بڑھا، امید تھی کہ ان کی عمر دیگر اہل

علم حضرات کی طرح ہوگی، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی عمر یہی لکھی تھی، مقدر کی بات ہے جس میں کسی کو اجارہ نہیں۔

مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ندوی نے تعلیمی فرائض کی ادائیگی میں ندوۃ العلماء کے اندر ایک طویل مدت گذاری، انھوں نے تعلیمی مدت کا آغاز ایک نوجوان استاذ کی حیثیت سے کیا تھا، پھر اپنے کام کے تسلسل سے وہ ایک کہنہ مشق استاد بنے تھے اور ندوۃ العلماء کے تدریسی عملہ میں انھوں نے اچھی جگہ بنالی تھی ان کو اپنے بڑوں کا اعتماد اور اپنے چھوٹوں کا احترام حاصل تھا۔

وہ اپنی علمی مشغولیت میں سنجیدہ اور علمی طرز عمل سے متصف تھے۔ ان کی اس صفت نے ان کے متعلق سب کی نظر میں حسن ظن پیدا کیا، وہ ایک خاموش کام کی انجام دہی کی لگن رکھنے والے تھے۔ ان خوبیوں نے ان کی شخصیت کو پسندیدہ بنادیا تھا اور اس نے ندوۃ العلماء کے کارگذار طبقہ میں ان کی افادیت کو ثابت کردیا تھا اور دارالعلوم کے تدریسی وعلمی دائرہ میں ان سے اچھا تعاون حاصل ہوتا تھا۔ ندوۃ العلماء سے ملک کے جن مدارس کا الحاق ہوتا رہا اس کے دفتری معاملات کو بھی ان کے سپرد کیا گیا تھا جس کو وہ ٹھیک اور اچھے ڈھنگ سے انجام دیتے تھے۔ مجھے ان سے جو دیرینہ ربط وتعلق تھا اس کی بنا پر مجھے ان کے انتقال کا حادثہ اپنے کسی قریبی تعلق والے فرد کے انتقال کا حادثہ محسوس ہوا اور عجب اتفاق یہ ہوا کہ میں اس موقع پر لکھنؤ میں موجود نہ تھا چنانچہ میں ان کے جنازہ میں نہ پہنچ سکا، بعد میں پہنچا، جس کا مجھے افسوس رہا۔ صاحبزادہ مولوی طارق شفیق ندوی سے تعزیت کی اور اپنے رنج کے احساس کا اظہار کیا۔

مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ندوی ایک عالمِ دین، پختہ مدرس اور اردو عربی دونوں ہی کے ادب شناس فاضل تھے، وہ باوجود علمی وتدریسی خصوصیت کے حصول شہرت کے لیے کوشاں نہیں رہے۔ انھوں نے خدمت علم میں صرف عملی طور پر اپنے کو مشغول رکھا اور اس خدمت علم کے لیے انھوں نے اپنا جو دائرہ کار بنایا تھا۔ اسی کے اندر انھوں نے اپنے کو محدود

رکھا، یہ صفت دراصل علم کے ساتھ اپنے کو خلوص کے ساتھ وابستہ کر لینے سے ہوتی ہے جو موصوف میں پائی گئی۔ اخلاق اور میل جول میں وہ اپنے دیگر رفقائے کار کی طرح سادہ مزاج اور اچھی سیرت کے مالک تھے۔ میرے اندازہ کے مطابق ان کی کسی سے کشمکش یا دوری نہ تھی بلکہ سب کے ساتھ ہمدردی اور ہم آہنگی تھی وہ اپنے رفقاء اور بڑوں سے تواضع کے ساتھ پیش آتے اور ساتھیوں کے ساتھ برادرانہ طرز رکھتے تھے۔

موصوف نے "الفقه المیسر" کتاب درسی اسلوب میں مرتب کر کے اپنی تصنیفی صلاحیت کا بھی بہت اچھا ثبوت دیا، اس معیار اور اسلوب کی کتاب تیار کرانے کا ارادہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کی نظر میں عرصہ سے تھا جس کے لیے کسی موزوں صاحب علم کی تلاش تھی، ان کی علمی وتدریسی خصوصیات کی بنا پر اس کام کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا اور ان کو معیار علمی اور اسلوب بیان کا اشارہ بھی دیا گیا، جس کو انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ نباہا۔ اور عین ضرورت کے مطابق کتاب تیار کردی۔ جو نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی داخل نصاب کی گئی بلکہ بہت سے مدارس میں بھی قبول کی گئی اور داخل نصاب کی گئی۔ اس کے معیار علمی کو دیکھ کر قدیم مصنفین کا انداز محسوس ہوتا ہے اور اسلوب بیان اور ترتیب مضامین کے لحاظ سے جدید پختہ کار مصنفین کا انداز محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب ان کے لیے اچھی یادگار رہے جو عرصہ تک ان کے نام کو باقی رکھے گی۔

موصوف ۱۹۴۲ء میں مغربی چمپارن بہار میں پیدا ہوئے اور اپنے قریب کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کی، ان میں خاص طور پر مدرسہ اسلامیہ بیتیا قابل ذکر ہے اس مدرسہ میں تعلیم کے دوران موجودہ امیر شریعت واڑیسہ وسکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مولانا نظام الدین صاحب سے ربط رہا جو آخر تک ایک تعلق کے طور پر قائم رہا۔ حضرت مولانا نظام الدین صاحب ان کے بارے میں اپنی اسی واقفیت اور ربط کی بنا پر اچھی رائے رکھتے تھے جس کا انھوں نے مجھ سے ذکر بھی کیا۔ موصوف اسی مدرسہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے اور کئی سال یہاں تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوئے، دوران تعلیم

وہ عموماً اپنے درجہ کے رفقاء میں ممتاز رہتے تھے اور پھر شعبۂ تدریس میں بھی انھوں نے اچھا مقام پیدا کیا، اس کے ساتھ انتظامی امور میں بھی ان کے مشورے سودمند ثابت ہوا کرتے تھے، اور ان کا صحافتی تعاون بھی ندوۃ العلماء کے عربی اردو رسالوں کو حاصل ہوا کرتا تھا۔

موصوف نے اپنے کو جس خلوص کے ساتھ علم کی خدمت کے ساتھ وابستہ رکھا یہ اس کا ثمرہ ہے کہ وہ اپنی ایک علمی یادگار باقی چھوڑ گئے جس سے فائدہ اٹھانے والوں کے شکریہ کے وہ برابر مستحق رہیں گے اور ان کی نیت حسنہ کی صورت میں ان کی یہ کوشش ان کے لیے صدقۂ جاریہ رہے گی۔

موصوف دین دار اور صالح انسان اور باعمل عالم تھے۔ ان کو اپنی علمی خصوصیت کے ساتھ اپنی تربیت باطنی کا بھی خیال رہتا تھا، چنانچہ انھوں نے آخری سالوں میں اپنا معمول سا بنا لیا تھا کہ رمضان المبارک کے موقع پر وہ ایک ہفتہ رائے بریلی آکر حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں ان کے مسجد کے ماحول میں گذارتے تھے اور اس ماحول میں عبادت وتلاوت میں مشغول رہتے تھے، یوں وہ اپنی عام زندگی میں بھی جماعت کے ساتھ نماز کی پابندی اور صلاح ودینداری سے وابستہ رہنے کے طریقہ پر کاربند رہتے تھے اس طرح انھوں نے جو طرزِ عمل اپنا رکھا تھا وہ صالح اور باعمل عالم دین کا طرز عمل تھا، ان کی یہ صفت انشاء اللہ اب ان کے اپنے رب کے پاس چلے جانے پر ان کو خصوصی فائدہ پہنچا رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ سے صمیم قلب سے دعا ہے کہ ان کے پس ماندگان کو اور محسنین ومتعلقین کو ان کے نہ رہنے سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی عطا فرمائے اور پس ماندگان میں خاص طور پر ان کے دونوں صاحبزادگان مولوی محمد طارق شفیق اور مولوی خالد شفیق کو ترقیات اور کامیابیوں سے نوازے۔ ان دونوں نے ندوۃ العلماء سے تعلیمی فراغت کی ہے، اور اپنی اپنی علمی مشغولیتوں میں مصروف ہیں۔

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندویؒ

پروفیسر مولوی سید ضیاء الحسن ندوی ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹز اینڈ لنگویجز (Humanities & Languages) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی جنھوں نے مورخہ ۲۱ رجنوری ۲۰۰۳ء کو دہلی میں ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر میں واقع اپنی قیام گاہ پر انتقال کیا، ان اصحاب علم وفضل میں تھے جنھوں نے دینی مضامین اور عربی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد یونیورسٹی کے عصری مضامین میں بھی دسترس حاصل کی اور پھر تدریسی مشغولیت اختیار کی جس کے لیے لکھنؤ، حیدرآباد اور دہلی میں اپنی ذمہ داری انجام دی، ابھی ان کی عمر کے رٹائرمنٹ کی حد تک پہنچنے میں تقریباً ۴ رسال باقی تھے کہ اچانک داعی اجل نے ان کو آواز دی اور وہ اس کو لبیک کہتے ہوئے اپنے پسماندگان اور احباب کو غمزدہ چھوڑ کر اس جہان فانی سے جہان باقی کو کوچ کر گئے، مولوی سید ضیاء الحسن مرحوم ندوۃ العلماء کے ان فرزندوں میں تھے، جنھوں نے اس کے ابتدائی درجات سے اعلیٰ درجات تک تعلیم حاصل کی، ''الرائد'' کے شروع کے دور میں وہ طلباء کی نمائندگی کرتے رہے اور ''الرائد'' کے کاموں میں معاون رہے اسی طرح ''النادی العربی'' اور ''جمعیۃ الاصلاح'' کی سرگرمیوں میں بھی وہ پیش پیش رہے اور ان انجمنوں کے سکریٹری بھی رہے، اس طرح قدیم وجدید کی صلاحیت لے کر آگے بڑھے اور یونیورسٹی کی بھی سند حاصل کی اور تدریس کے میدان میں داخل ہوئے، اولاً ندوۃ العلماء کے متوسط درجات میں تعلیمی کام کیا، پھر ان کو یونیورسٹی کے میدان میں تدریس کا موقع ملا، جو عمر کی انتہا تک جاری رہا، وہاں انھوں نے لکچرر سے ترقی کر کے پروفیسر کا منصب حاصل کیا اور وہ صدر شعبۂ عربی اور پھر ڈین مقرر ہوئے۔

مولوی سید ضیاء الحسن مرحوم نمایاں صلاحیتوں اور بھرپور عزائم کے آدمی تھے، ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سب کے ہمدرد تھے اور کسی کو بھی کوئی ایسی پریشانی لاحق ہو جو ان

کے دائرہ کار میں آتی ہو تو اس کو دور کرنے میں پوری دلچسپی لیتے اور اس کی مدد کرتے، متعدد لوگوں نے اس بات کا اعتراف کیا اور بتایا کہ خود ان کا معاملہ ایک موقع پر بہت الجھ گیا تھا، انھوں نے بہت توجہ کی اور پیچیدگی کو حل کرادیا، انتظامیہ کے لوگوں نے بتایا کہ انتظامی معاملات میں ان کا رویہ بہت تعاون اور سمجھ کا دیکھنے میں آیا اور یہ بتایا کہ وہ اختلاف کی صورت میں بھی فرق مراتب کا لحاظ رکھتے تھے اور اپنے سے بڑے مرتبہ والوں کے ساتھ لحاظ وخیال رکھتے ہوئے اختلاف رائے کو ظاہر کرتے تھے، وہ جس رائے کو غلط اور نامناسب محسوس کرتے تو اس کا اظہار بصراحت کردیتے اور محض ادب واحترام میں اس پر خاموش نہیں رہتے، لیکن یہ اختلاف مہذب طریقہ سے کرتے، جس سے دوسرے کی بے عزتی نہ ہوتی۔

وہ رفقاء کے ساتھ اچھے رفیق، اساتذہ کے ساتھ سعادت مند شاگرد اور بزرگوں کے ساتھ باادب اور نیازمند تھے اور علمی مذاکروں کی محفل میں بے لاگ تبصرہ کرنے والے اور علمی بنیاد پر تجزیہ وتحقیق پیش کرنے والے تھے، ان کو انہی خصوصیات کی بنا پر یونیورسٹی میں ترقی کرنے اور انتظامیہ کا بھی اعتماد حاصل کرنے میں مدد ملی، یونیورسٹی میں ان کو ڈین شپ کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کے ثقافتی ادارہ I.C.C.R. کے عربی رسالہ "ثقافة الهند" کی ادارت بھی سپرد ہوئی جس کو انھوں نے ایک مسلمان اسکالر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے نکالا، اس کا آخری شمارہ خاص حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تھا جو ان کی ادارت وترتیب کا شاہکار ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں وہ ابتدائی درجات میں داخل ہوئے تھے، اس وقت ان کے بڑے بھائی مولانا محمود الحسن ندوی جن سے وہ ۱۱/۱۲ سال چھوٹے تھے تعلیم کی تکمیل کے مرحلہ میں تھے، عمر کے اس فرق کی بنا پر وہ ان کے لیے سرپرست کی حیثیت بھی رکھتے تھے، ان کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بڑے طلبا اور بعض اساتذہ سے اچھا خلا ملا تھا اور بعض کے ساتھ ان کے بعض درجات میں رفاقت درس کا ربط بھی ہو چکا تھا، انہی میں میں بھی تھا، اس طرح ضیاء الحسن مرحوم کا مجھ سے دوہرا تعلق قائم ہوا، ایک تو استاد اور

شاگردی کا اور دوسرے ایک دوست کے چھوٹے بھائی ہونے کا اس کی بنا پر مجھے سید ضیاء الحسن مرحوم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور مجھے ان کی سعادت مندی اور شرافت کا تجربہ ہوتا رہا، ان کے علمی زندگی میں آنے اور تدریسی منصب پر پہنچنے کے بعد مختلف علمی اجتماعات میں میرا ان کا کئی بار ساتھ ہوا، کئی سفروں میں بھی رفاقت ہوئی میں نے ان کو ایک اچھا رفیق سفر اور علمی سطح پر اچھے مذاق کا حامل پایا، اسی کے ساتھ خورد و کلاں کے درمیان جو مہذب ربط ہونا چاہئے اس کا بھی پورا لحاظ ان کو کرتے دیکھا۔

ضیاء الحسن مرحوم نے چونکہ اولاً دینی تعلیم حاصل کی اور وہ بھی ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں جہاں قدیم وجدید کے صالح امتزاج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس تعلیم سے پختہ استعداد بنانے کے ساتھ دوسرے ایسے مضامین جن سے موجودہ تمدنی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے، اچھی واقفیت حاصل کی تھی جس میں ان کے اپنے ذاتی مطالعہ اس صلاحیت سے ان کو دونوں طرف کے فائدے اور صلاحیتیں حاصل ہوئیں، زبان کے سلسلے میں ندوۃ العلماء میں اچھا اہتمام ہے خاص طور پر عربی میں زیادہ لیاقت پیدا کرنے کا انتظام ہے، اس کے ذریعہ ضیاء الحسن مرحوم نے عربی کی عملی استعداد اچھی حاصل کرلی تھی، یونیورسٹی جانے پر انگریزی کو مزید مضبوط اور بہتر بنایا، چنانچہ وہ دونوں زبانوں میں گفتگو اور تقریر اچھے ڈھنگ سے اور بے تکلف کرتے تھے، اور لکھنے میں بھی مضمون نگاری اور تحقیقی کاوش کا اچھا نمونہ پیش کرتے تھے، عربی کی حد تک تو میں نے اس کو اچھی طرح محسوس کیا اور انگریزی کے معاملہ میں میں نے ان کو اس کا اظہار کرتے وقت سمجھا، ان کی اس دوہری صلاحیت سے ان کی بات کا اچھا وزن قائم ہوتا تھا اور کسی علمی مجلس میں خواہ وہ دینی مزاج رکھنے والی ہو یا عصری معیار کی ہو ان کو تکلف یا دشواری نہیں ہوتی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء ان کی مادرِ علمی تھی، اس سے ان کا تعلق اور لگاؤ فطری اور جذباتی تھا اور وہ وہاں کے تعلیمی مزاج اور مقصد کو صرف صحیح ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کے داعی بھی تھے، اور وہاں کے ذمہ داروں اور اساتذہ سے ان کے مخلصانہ روابط بھی تھے، ان ہی روابط کی بنا پر ندوۃ العلماء کے علمی وفکری منصوبوں سے ان کو دلچسپی رہتی

تھی، وہ وہاں کی انجمنوں کے رکن منتخب ہوئے، ان میں اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلی کیشن (مجلس تحقیقات ونشریات اسلام) عالمی رابطہ ادب اسلامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور ابھی گزشتہ سال ان کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کی رکنیت بھی حاصل ہوگئی تھی، وہ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سہ ماہی علمی آرگن ''کاروان ادب اسلامی'' کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے اور اس کے بعد بعض شذرات انہی کی قلم سے شائع بھی ہوئے۔

اس طرح ان کا انتقال ندوۃ العلماء کے لیے بھی ایک خسارہ کی بات ہوئی، چنانچہ ندوۃ العلماء کے حلقہ میں اس کو محسوس کیا گیا اور ندوۃ العلماء میں کئی جلسہائے تعزیت منعقد ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے بعد ان کا سب سے زیادہ تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تھا جس کے وہ شعبۂ عربی کے پروفیسر صدر شعبہ رہتے ہوئے ڈین آف فیکلٹی ہوئے، چنانچہ وہاں بھی ان کے انتقال کو ایک نقصان اور حادثہ سمجھا گیا، یونیورسٹی کی طرف سے جلسۂ تعزیت منعقد کیا گیا اور اس میں اہم اور ذمہ دار شخصیت نے ان کو سراہا اور قدر دانی کا اظہار کیا۔

مرحوم کے بڑے بھائی مولانا سید محمود الحسن ندوی کے لیے یہ سانحہ بڑا سانحہ ہوا، کیوں کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ان کے چھوٹے اور عزیز بھائی تھے، بلکہ وہ ساتھ رہتے بھی تھے، اور مختلف خاندانی اور نجی معاملات میں ایک دوسرے کے لیے تقویت کے باعث تھے اور علمی وادبی ومذہبی ذوق ورجحان میں شریک تھے، پھر مرحوم کی تعلیم وتربیت کے دوران ان کی خصوصی توجہ اور فکرمندی کو مرحوم کی شخصیت سازی میں خاصا دخل تھا، اسی وجہ سے متعدد واقف کار لوگوں نے ان سے بھی خصوصی تعزیت کی، اور دلاسہ دیا، دونوں بھائیوں میں بڑی ہم آہنگی تھی، بڑے بھائی مولانا سید محمود الحسن بھی ندوۃ العلماء کے قدیم وجدید کی جامعیت رکھنے والی شخصیت ہیں، اور علمی وادبی ذوق میں اپنے چھوٹے بھائی کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اس ہم آہنگی کی بنا پر ان کے لیے یہ حادثہ سخت حادثہ ہے، اور دل کے مریض ہونے کے تعلق سے اس کا بوجھ زیادہ محسوس کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو صبر کی توفیق دے۔

مرحوم مولوی سید ضیاء الحسن ندوی کا ادبی وفکری کتابوں کا بہت اچھا مطالعہ تھا، وہ

عہد حاضر کی تحریکوں اور ان کے نظریات سے بھی خوب واقف تھے، اسی طرح اسلامی فکر وتحریکات سے ان کا قریبی ربط تھا، وہ ان کے سلسلے میں منعقد اجتماعات میں علمی مزاج سے شرکت کرتے اور مناسب وضروری مشورے بھی دیتے تھے، جس سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے سالانہ سیمیناروں میں ان کی شرکت برابر ہوتی تھی، اس شرکت کے سلسلے میں ان کا استنبول ترکی کا سفر ہوا، نیز ایک سفر مراکش کا ہوا اور ایک سفر مصر کا ہوا، اور انھوں نے ان میں مقالہ بھی پیش کئے اور مذاکرے میں بھی شرکت کی اور بعض موقعوں پر تو بڑی جرأت کے ساتھ اور مؤثر زبان میں اپنی بات کہی اور مرعوبیت کا کوئی اظہار نہیں ہوا۔

چند سال سے تو علمی وادبی دلچسپیوں میں ان کا تعاون میرے ساتھ بہت ہو گیا تھا اور پرانے تعلق کی بنا پر وہ میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے معاملہ کرتے تھے اور مجھے ان سے اچھا تعاون ملتا تھا اس طرح ان کا انتقال میرے لیے ایک خاندانی حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے، مرحوم نے اپنے پیچھے اہلیہ اور تین صاحبزادگان چھوڑے جو ابھی یونیورسٹی کے اعلیٰ درجات میں ہیں، امید ہے کہ انشاء اللہ وہ جلد اپنے والد مرحوم کی صفات وکردار کے حامل ہوں گے اور ان کی جگہ پر کھڑے ہونے کے لائق ہوں گے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی خصوصی مدد فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں بہتر سے بہتر مقام عطا کرے۔ اللھم ارحمه واغفرله

مولانا محمد رضوان قاسمیؒ

مولانا محمد رضوان القاسمی جن کو زید لطفہ، لکھنے کے بجائے اب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ سے ذکر کیا جانا ہے، گزشتہ ماہ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ کو انھوں نے حیدرآباد میں ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، اور وہ تعلیم ودعوت کے میدان میں ایک بڑا خلا چھوڑ گئے وہ مقرر بھی تھے ،مصنف بھی ادیب وصحافی بھی تھے اور معلم وقائد بھی ،وہ ہندوستانی علمائے دین کی صف میں نمایاں کاموں کی وجہ سے ممتاز اور معروف رہے تھے، اور ان کو مسلمانوں کے مختلف الفکر اداروں اور انجمنوں کی طرف سے اعتماد اور قدر کی خصوصیت اس وقت کے حالات میں جب کہ مسلمانوں کی نمایاں اور کارگزار شخصیتوں کے یکے بعد دیگرے متعدد اور اکثر کے جدا ہوجانے سے علماء کے طبقہ میں کارگزار اور ذمہ دار شخصیتوں کی کمی محسوس کی جارہی ہے، شہر حیدرآباد میں ایک کنارے بارکس میں تعلیمی مرکز ہی تھا، وہاں ان کے نہ رہنے سے بہت کمی محسوس کی گئی ہوگی، یوں پورے ہندوستان میں جامعہ سبیل الاسلام قائم کیا، اور اس کو بڑی ترقی دی یہاں تک کہ ملک وملک سے باہر اس نے اچھی شہرت پائی اس سے ان کی عالی حوصلگی بلندی ہمت اور انتظامی صلاحیت کے ساتھ تعلیم وتربیت کے تقاضوں سے واقفیت کا کھلا اظہار ہوتا ہے انہوں نے یہاں کانفرنسوں سمیناروں اور اجلاسوں کا انعقاد بھی کیا، اور ہمارے رابطہ ادب اسلامی عالمی کی بھی میزبانی کی جس کی صدارت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے فرمائی تھی ،وہ ایک ممتاز فاضل اور کارگزار عالم دین، صاحب قلم اور ممتاز خطیب اور دینی تعلیم کے کام اور نظام کے ماہر شخص تھے، اور اس کے ساتھ ایک مصنف وادیب بھی تھے، اور شعر وسخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے، انھوں نے دارالعلوم سبیل السلام کے تحقیقی واشاعتی ادارے سے متعدد کتابیں شائع کیں جن میں مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب کی بعض تصنیفات اور مشہور شاعر کلیم عاجز

صاحب کے شعری مجموعہ کے علاوہ خود ان کی کتابیں ''چراغ راہ'' ''متاع قلم'' بھی ہیں سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر خطبات حیدرآباد کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جس میں انھوں نے ممتاز اہل علم واہل بیان وقلم کو دعوت دی، وہ مونگیر (بہار) کے جامعہ رحمانی اور پھر دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے، اور فراغت تعلیم کے بعد حیدرآباد میں ایک مسجد کی خطابت سے انھوں نے اپنی علمی وعملی زندگی کا آغاز کیا، اور جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی، انھوں نے دینی اور مذہبی دائرہ میں صرف خطابت تک ہی اپنے کو محدود نہیں رکھا، بلکہ وہاں کے علمی اور ادبی میدان میں بھی اپنی افادیت ثابت کی، وہاں کی صحافت میں حصہ لے کر اسلامی اور اصلاحی رجحان کے لیے جگہ میں اضافہ کیا، وہاں کی علمی ودینی وادبی محافل میں اپنا مقام بنایا، اور دینی تعلیم کے لیے وہاں ایک بڑی درس گاہ کا آغاز کیا، ان کی صلاحیتوں کی شہرت پورے ملک میں ہوئی اور بتدریج ملت اسلامیہ کے سارے مقتدر اور کل ہند پیمانہ کے اداروں میں ان کو قدر واعتماد کی جگہ حاصل ہوئی، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، آل انڈیا ملی کونسل، آل انڈیا فقہ اکیڈمی، اور ندوۃ العلماء کے رکن منتخب ہوئے، اور ان سب اداروں میں ان کی شرکت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، وہ ایک معتدل و سنجیدہ مزاج اور تعمیری رجحان اور تعاونی مزاج کی خصوصیات رکھنے والے شخص تھے، ان کا اسلامی علوم وادب کا بڑا اچھا مطالعہ تھا، اور اس راہ میں ان کے افادۂ تحریر کا نمایاں حصہ تھا، ان کی علمی اور دینی کوششوں کو دیکھ کر بڑی توقع ہوتی تھی کہ ملت اسلامیہ کو اپنے بدلتے ہوئے اور متنوع مسائل میں غور وفکر اور رائے قائم کرنے میں ان سے بڑی مدد ملے گی اور اس ملک میں مسلمانوں کی ثقافت وشریعت کی حفاظت میں ان کا حصہ نمایاں رہے گا، لیکن مقدر کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی عمر اتنی ہی رکھی گئی تھی، جو عمروں کا عمومی معیار ہے وہ اس سے کم ثابت ہوئی، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے قریبی تعلق رکھنے والے حضرات ان کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھائیں اور لائق تکمیل کاموں کی تکمیل کریں اور یہ کوشش کی جائے کہ ان کے رخصت ہونے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کی کچھ تلافی ہو۔

مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم کا تعلق جن بڑی شخصیات سے رہا ان میں حضرت مولانا

سید منت اللہ رحمانی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے جن کی سرپرستی ان کو جامعہ رحمانی میں حاصل ہوئی دوسری شخصیت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی ہے جن سے ان کو عقیدت ومحبت اور فکری تعلق تھا اور ان سے بیعت وارادت کا بھی تعلق قائم کرلیا تھا ان کے انتقال پر یہ تعلق مجی السنۃ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب حقی سے قائم کیا اس راہ میں بھی وہ برابر متوجہ اور فکر مند رہے۔

مولانا مرحوم سے میرا تعارف تو شروع ہی میں ہوگیا تھا لیکن جتنا ربط بڑھا ان کی خصوصیات اور خوبیوں کا اندازہ ہوتا گیا اور ان سے ایک اچھا ربط قائم ہوگیا تھا، اور عجیب بات ہے کہ مرض الوفات سے صرف دو ہفتے پہلے وہ دہلی ہوتے ہوئے لکھنؤ آئے تھے، اور دو تین روز لکھنؤ کے قیام میں ملت اسلامیہ کے مسائل پر ان سے تبادلۂ خیال رہا تھا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے زیر عمل معاملات میں ان کی وقیع رائے ہوتی تھی، اور ادھر کچھ عرصہ سے عالمی رابطہ ادب اسلامی کی حیدرآباد شاخ میں ان سے اچھا تعاون مل رہا تھا، ان سے ملاقات پر ان معاملات میں مشورہ رہا، اور یہ امید تھی کہ اس مشورہ کے مقصد کو اچھی تقویت ملے گی لیکن خدا کو یہ ہی منظور تھا کہ وہ اپنی ذمہ داری کو اپنی زندگی کی اسی محدود مدت تک ہی انجام دے سکیں، آدمی کی بڑائی اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے جانے پر ملت کے اس خسارے کا احساس ہو اور ملت کے وسیع طبقہ میں نقصان محسوس کیا جائے، جیسا کہ ان کی وفات سے محسوس کیا گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے بے پایاں رحمت سے نوازے، اور ان کے پسماندگان کی ان کے اخسارے میں خصوصی مدد فرمائے، ان کو اللہ تعالیٰ نے گھر کی طرف سے مطمئن کر رکھا تھا اور نیک وسعادت مند اولاد عطا فرمائی چھوٹے صاحبزادے محمد نعمان بدر سلمہ کو اس سال کے شروع میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل کرایا، جنھوں نے ہفتم عربی کی تعلیم مکمل کی ہے(۱) اور باصلاحیت بھائی ہیں جن میں سلمان صاحب دبئی میں اور حسان القاسمی صاحب کویت میں مقیم ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کی خصوصی مدد فرمائے اور اپنی مرضیات پر چلائے۔

---

(۱) اور اب انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کی تکمیل کرلی ہے اور مزید دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک سال گزار کر اب دارالعلوم سبیل السلام میں آئے اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہونچا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے علم ودین کی خدمت واشاعت کا کام لے اور قبول فرمائے۔ (م) آمین

مولانا محمد عارف سنبھلی ندویؒ

معتمد تعلیم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی وفات کو ابھی چند ماہ گزرے تھے اور ان کے نہ رہنے سے اہل ندوہ ابھی مغموم تھے اور خسارے کا احساس جاری تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک ممتاز فرزند اور عالم دین مولانا محمد عارف سنبھلی نے بھی اس دار فانی سے کوچ کیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا محمد عارف ندویؒ ندوۃ العلماء کے لائق فرزند بھی تھے اور اس کے ایک اہم استاد بھی تھے، ابھی طویل عمر تک نہیں پہنچے تھے کہ رخصتی کا وقت آ پہنچا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بیش از بیش رحمتوں سے نوازے۔ وہ اپنی طالب علمی میں ایک ہونہار، سنجیدہ اور محنتی طالب علم تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد تدریسی زندگی اختیار کی اور مفید علمی مشغولیت میں جس میں ان کا جذبہ دین کی تقویت اور علوم دینیہ کی خدمت کا رہا تھا، قرآن مجید کے ترجمے و تفسیر کو اپنا خاص موضوع بنایا، اسی کے ساتھ دین کے صحیح عقیدے کے دفاع اور نصرت کو انھوں نے اپنی تقریر و تحریر کے ذریعے خصوصی طور پر اختیار کیا، اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی عالمانہ خصوصیت پیدا کر لی تھی اور ان کا بیان بھی بہت اچھا ہوتا تھا، وہ علمی انداز اور موثر طرز استدلال اختیار کرتے تھے، ان کی علمی کاوش سے ایک طرف ان کے شاگردوں کو قرآن مجید سے خصوصی استفادہ کرنے کا موقع مل رہا تھا اور دوسری طرف ان کی عملی کاوش سے دین کے صحیح عقیدے کے دفاع اور نصرت کا فرض انجام پا رہا تھا۔

مولانا محمد عارف ندویؒ مرحوم علمی اور سلجھے طریقے سے درس دیتے تھے، انھوں نے اپنا انداز سنجیدہ اور علمی رکھا تھا، وہ یکسو ہو کر علمی استعداد بڑھانے کی فکر رکھتے تھے، وہ اجتماعی زندگی کے ردّ و قدح سے اپنے کو بچاتے ہوئے تعلیم اور دعوت کے کام سے عملی تعلق رکھا تھا، ان کی زندگی کا طرز احتیاط، استغناء اور خود اعتمادی کا رہا، دوسروں سے فائدہ

اٹھانے میں کم دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں زیادہ، دین ودعوت کے کام میں تعاون اور اس کی راہ میں مشقت جھیلنے کا انداز رکھا تھا، وہ اپنے وقت کے ایک بہت بڑے عالم دین حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کے بھتیجے تھے، طالب علمی کا ان کا زمانہ ان کی سرپرستی میں گزارا تھا، جس کے اثر سے علم دین کے کام میں ہمت وجرأت کے پیدا ہونے میں ان کو اپنے عم معظم سے فیض حاصل ہوا، جو ان کے کردار وعملی جدوجہد میں محسوس کیا جاسکتا تھا، ان کے دادا صاحب بھی ایک بڑے بزرگ صفت فرد تھے، ظاہر ہے کہ ان کے اثرات بھی فطری طور پر ان کے سب بیٹوں میں اور ان کے ذریعے ان کے پوتوں میں منتقل ہوئے ہوں گے، جن میں مولانا محمد عارف صاحب بھی تھے، ان کا خاندان ان ہی اسباب کی بنا پر دین وعلم سے خصوصی ربط رکھنے والا خاندان رہا، جس کے اثرات مولانا محمد عارف صاحب کو بھی وراثت میں ملے، مولانا محمد عارف صاحب ندوی کے خاندان کی بزرگ شخصیت مولانا محمد منظور نعمانی صاحبؒ کا مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر ورجحان اور اس خاندان کی فکر ورجحان میں ایک حد تک ہم آہنگی تھی، اسی کے ساتھ ساتھ مزید اس بات کا بھی اثر تھا کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دعوت وجہاد کے عمل سے برصغیر کے سارے اہل دین قدر وعقیدت رکھتے تھے، ان میں اس خاندان کے بھی افراد تھے۔ اس خاندان کا مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حضرت سید شہیدؒ سے نسبتی تعلق کی بنا پر، ان سے اور اس گھرانے کے بڑوں اور چھوٹوں سے بھی تعلق تھا، خاص طور سے مولانا محمد عارف صاحب اور ان کے گھر کے لوگ اس میں بڑھے ہوئے تھے، مولانا عارف صاحب اپنے گھر والوں کی اس عقیدت مندی کا اپنی گفتگو میں تذکرہ کرتے تھے، خود مولانا محمد عارف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان والوں سے عملی طور پر جو محبت وتعلق رکھا، اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا رہا، حضرت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کو محسوس کرتے تھے اور مولانا محمد عارف صاحب کو قدر وتعلق کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد عارف ندویؒ نے مہاراشٹرا کے بعض مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیں اور جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں بھی پڑھایا، جس کے ناظم مولانا مجیب اللہ ندویؒ تھے، لیکن مولانا علی میاں نے ان کو ندوۃ العلماء بلالیا، اور تدریسی کام سپرد کیا، اس میں ان کو خصوصی مضمون ترجمہ وتفسیر قرآن مجید مقرر ہوا، قرآن مجید کے ساتھ عقیدے کا بھی موضوع ان کے درس میں رہا، دونوں موضوعات میں ان کا درس مفید اور معلومات افزا ہوتا تھا، اس سے طلبہ بڑا فائدہ اٹھاتے تھے، وہ درس کے ساتھ ساتھ دین اور عقیدۂ صحیحہ کی نصرت اور دفاع کے لیے مختلف جلسوں میں بھی جاتے تھے اور ان کی تقریریں مفید ہوتی تھیں، ان کا اسلوب سادہ اور پُر اثر ہوتا تھا، وہ اپنی گفتگو میں بھی اور اپنی عملی زندگی میں بھی سادہ اور تکلفات سے گریز کرنے والے عالم دین تھے۔ انھوں نے اپنی ضروریات کو محدود رکھا تھا، وہ کچھ عرصے سے اعصابی اور قلبی طور پر کچھ شکایات محسوس کرنے لگے تھے، اور ان کا علاج عموماً سادہ انداز (ہومیو پیتھ) تک محدود رکھتے رہے، شہر کے مشہور معالج اور ملت اسلامیہ کی تقویت کا جذبہ اور عمل رکھنے والے ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی سے ان کا اس علاج کے سلسلے میں خصوصی ربط رہا، جس کو انھوں نے برابر جاری رکھا، اس علاج سے ان کے مرض میں تخفیف ہوتی رہی، لیکن مرض کا پورا ازالہ نہیں ہوسکا تھا اور بالآخر ان کا وقت موعود آ گیا جو کہ ہر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے اور وہ کسی بھی طریقے سے گھٹ بڑھ نہیں سکتا، البتہ ان کا یہ وقت موعود بلا کسی بڑی تمہید کے آیا، انھوں نے انتقال کی رات تقریباً معمول کے مطابق گزاری اور صبح کے معمولات شروع ہونے پر بھی نماز فجر کی ادائیگی تک ان کی علالت کا کوئی بڑا اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا، بروقت علم میں آیا اور وہ آہستگی کے ساتھ اس دار فانی سے دار باقی کی طرف منتقل ہوگئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بڑی رحمتوں سے نوازے اور نیک اعمال کا اضعافاً مضاعفہ بدلہ عطا فرمائے، وہ بڑے با اخلاق، ہمدرد، تعلق ومحبت کا لحاظ رکھنے والے انسان تھے، عالم دین اور استاذ تھے، اپنی بڑی حیثیت ہونے کے باوجود ان کا برتاؤ ایسا تھا جس

میں ان کو اپنی اہم شخصیت کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا اور عام فرد کی طرح وہ لوگوں سے ملتے اور رابطہ رکھتے تھے، سادہ طبیعت، سادہ لباس، اور سادہ وضع قطع، اور سادہ اور سنجیدہ طرز عمل ان کی خصوصیات تھیں، ان کے اندر نصرت دین کا بڑا جذبہ تھا جوان میں بڑا جوش عمل پیدا کرتا تھا، علمی مطالعے میں وہ بڑا وقت صرف کرنے والے اور قرآن مجید کے مضامین میں بہت غور وخوض کرنے والے اور ان سے استفادے بڑا ذوق رکھنے والے مدرس اور مصلح کی حیثیت سے اپنی علمی، دینی فریضے کو انجام دینے والے تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کے معانی ومضامین کی تدریس وخدمت کے کام میں اہم جگہ پُر کر رکھی تھی جوان کی وفات سے خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کا بندوبست فرمائے اور جانے والے کو اس کی خوبیوں کا بیش از بیش بدلہ عطا فرمائے۔

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے افراد سے ان کو خاص ربط تھا، اس کے نتیجے میں وہ وقتاً فوقتاً تکیہ کلاں رائے بریلی آتے اور رمضان کے اور بعض دیگر موقعوں پر جب مولانا علی میاں ندویؒ کے پاس ندوے کے طلبہ کچھ وقت گزارنے آتے تو مولاناؒ کی نظر مولانا عارف صاحب پر پڑتی کہ وہ طلبہ کی نگرانی وسرپرستی کرنے کے لیے مولانا کے ساتھ رہیں، اس سلسلے میں تکیہ کلاں سے متصل میدان پور میں قائم شدہ دار عرفات کے تحت ایسے پروگرام انجام پاتے جن میں مولانا عارف ندویؒ کا تعاون اور طلبہ کی سرپرستی کا موقع فراہم ہوتا، جس کو وہ اچھے اور تربیتی انداز میں پورا کرتے، رمضان المبارک کے ایام میں ان کے دروس قرآن کا بھی حضرت مولانا علی میاں اہتمام کراتے جس سے رمضان کا وقت گزارنے کے لیے یہاں قیام کرنے والوں کو عقیدہ اور فکر وعمل کا بڑا فائدہ حاصل ہوتا تھا، البتہ یہ سلسلہ مولانا محمد عارف صاحب کی وقتاً فوقتاً علالت کے پیش آنے سے مسلسل نہیں رہ سکا، لیکن تعلق خاطر اور ربط قائم رہا۔

حضرت مولانا کے خاندان کے دیگر متعلقین کے ساتھ مولانا عارف ندویؒ کو جو

تعلق قائم ہوگیا تھا،اس کی وجہ سے ان کی وفات کو خاندان کے حضرات نے اپنے خاندان کی وفات کی طرح محسوس کیا، مجھ سے ان کا جو خصوصی ربط تھا اس کی بنا پر ان کی وفات میرے لیے بھی ذاتی صدمے کا باعث ہوئی،ان کا سانحہ وفات احاطۂ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی رہائش گاہ پر ہوا جہاں وہ دارالعلوم کی طرف سے مقیم تھے اور دارالعلوم کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں اپنا پورا تعاون دیتے تھے ندوۃ العلماء کے شعبۂ دعوت وارشاد کو بھ ان سے بڑی تقویت ملتی تھی ،اور ان کے بعض مفید رسائل بھی شعبۂ نے شائع کئے اسلامی عقائد ان کا اصل موضوع تھا اور اس سلسلہ میں ان کے یہاں ذرا لچک نہ تھی ان کی کتاب بریلوی فتنہ کا نیا روپ مکتبہ الفرقان سے شائع کی اور کئی ایڈیشن اس کے نکل چکے ہیں۔پسماندگان میں اہلیہ بیٹی اور اپنے مولوی محمد حمزہ ندوی مولوی طلحہ ندوی ہیں داماد مولوی اسعد قاسمی سنبھلی صاحب ہیں جو تعلیم وتصنیف کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے،آمین!

مولانا ناصر علی ندویؒ

افسوس دارالعلوم ندوۃ العلماء میں گذشتہ ایک سال کے اندر تدریسی عملہ کے متعدد اہم افراد جن کو اپنے اپنے مضامینِ درس میں اپنے اپنے دائرہ میں خصوصیت حاصل رہی تھی ہم سے جدا ہو گئے، ان میں پہلے مولانا محمد عارف سنبھلی صاحب ہیں جو قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کے شعبہ میں خصوصی امتیاز رکھتے تھے اور عقائد وعلم کلام میں بھی خصوصیت رکھتے تھے، انھوں نے گذشتہ سال یکم جون کو رحلت کی، پھر کچھ دنوں کے بعد ماسٹر عبداللطیف صاحب نے وفات پائی وہ انگریزی وعلوم جدیدہ کے شعبہ میں قابل قدر خدمت انجام دے رہے تھے، پھر عید کے متصلاً بعد ہی مولانا محمود الازہار صاحب نے وفات پائی جو مختلف مضامین کی تدریس کے ساتھ صحافتی اور ثقافتی کاموں میں بھی خصوصیت رکھتے تھے، اور اب تازہ تازہ واقعہ مولانا ناصر علی ندوی صاحب کا پیش آیا جو ایک حادثہ کے نتیجہ میں اس جہان فانی سے جہان باقی کی طرف کوچ کر گئے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون، ان کی تدریسی خدمات بہت قابل قدر اور اہم رہی ہیں، جن کی مدت بھی طویل رہی اور جو اپنے تعلیمی کام میں بڑے لائق قدر اور اہمیت والے فرد تھے۔

انھوں نے اپنے سانحۂ وفات کے پیش آنے کے حادثہ سے ایک دن پہلے تک دارالعلوم ندوۃ العلماء آئے اور تدریس وافتاء وقضاء کی ذمہ داریوں کو انجام دیا تھا، علوم دینیہ کی تدریس میں اور خاص طور پر حدیث وفقہ کی تدریس میں جو خصوصیت حاصل تھی اسکی وجہ سے ان کا سانحۂ وفات دارالعلوم کے تدریسی شعبہ کا ایک بڑا خسارہ محسوس کیا گیا، وہ دارالعلوم میں شعبۂ حدیث کے سربراہ بھی تھے اور دارالقضاء میں قاضی کونسل کے رکن بھی تھے، ان کے فیصلے بڑے ذمہ دارانہ ہوتے تھے۔

مولانا ناصر علی ندویؒ لکھنؤ ہی کے رہنے والے تھے، انھوں نے دارالعلوم ندوۃ

العلماء میں درجہ اول عربی سے علیا کے آخری درجہ تک تعلیم حاصل کی، وہ اپنے طالب علمانہ زمانہ میں ہر درجہ میں شروع سے آخر تک ممتاز رہے، اوران کے اساتذہ ان کی صلاحیت علمی اوران کے امتیاز کے قدرداں رہے، انھوں نے اپنا پورا تعلیمی زمانہ علمی محنت اور درسیات میں پختگی کی فکر میں گزارا، چنانچہ تعلیم مکمل کرتے ہی ان کو تدریس کے شعبہ میں لے لیا گیا، جس کے حق کو انھوں نے بحسن وخوبی ادا کیا، ان کے درس کے طلبہ عام طور پر ان کے درس سے بڑا فائدہ محسوس کرتے تھے، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان سے استفادہ کرنے والے طلبہ اس وقت زندگی کی مختلف مشغولیتوں میں داخل ہو چکے ہیں، بڑے اچھے اور تأثر کے انداز میں ان سے استفادہ کا ذکر اپنے تعزیتی خطوط میں کر رہے ہیں۔

میری نظر میں مولانا ناصر علی ندویؒ کی تین خصوصیتیں قابل ذکر ہیں، ایک تو یہ کہ میں مولانا ناصر علی ندویؒ کو ان کی ابتدائے تعلیم سے واقف رہا ہوں، میں نے براہ راست ان کی تعلیمی محنت ویکسوئی کو اوران کی استعداد کی خوبی کو دیکھا ہے، اپنے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے تمام کتب درسیہ کو بڑی توجہ ومحنت سے پڑھا حتی کہ ان کی علمی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے ان کے رفقائے درس خارج وقت میں وہ نکات اور تحقیقات سمجھنے کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے جو ان کے ساتھیوں کو درجہ کے اندر سمجھ میں آنے سے رہ گئے تھے، عام طور پر وہ اپنے درجہ کے اسباق کا اپنے رفقاء درس کو مذاکرہ کراتے، نیز انھوں نے یہ بھی کیا کہ اپنے ایک بڑے استاد کو جو نابینا ہو گئے تھے ان کے لیے تیاری میں معاونت کے لیے کتاب پڑھ کر سناتے تھے، اس سب کا فائدہ ان کو خود بھی اپنی استعداد کو پختہ بنانے میں حاصل ہوتا، کہ جو کچھ وہ پڑھتے تھے وہ سمجھ لیتے اوراخذ کرنے کی پوری فکر کرتے، یہ سلسلہ انھوں نے فراغت کے بعد اپنی تدریس کے زمانہ میں بھی جاری رکھا، جو ان کا درس ہوتا تھا وہ اس میں گہرے مطالعہ کے ساتھ تیاری کرتے، ان کے اس طرح کے اشتغال علمی کا یہ بھی اثر تھا کہ وہ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کسی دوسری مشغولیت میں شریک نہیں ہوتے تھے، وقت پر آنا اور پڑھا کر وقت پر چلا جانا اوراس بات سے کوئی مطلب نہ رکھتے کہ دوسرا

پروگرام ادارہ کے اندر انجام دیا جارہا ہے، اس سلسلے میں اس کی بھی فکر نہیں کرتے تھے کہ انتظامیہ یا یہاں کے ذمہ داروں سے زیادہ ملاقات کریں، حتی کہ انتظامیہ کے جن افراد سے انہیں تعلق حاصل تھا ان سے بھی وہ مہینوں ملاقات نہیں کر پاتے تھے، اس سے بعض ان اساتذہ کو جن کے وہ شاگرد رہ چکے تھے شکایت ہوجاتی، لیکن وہ کہتے کہ علمی مشغولیت کے ساتھ دوسری مشغولیتیں مشکل ہوتی ہیں، اس طرح انھوں نے اپنے کو تعلیم وتدریس کے کام کے لیے پورے طور سے یکسو کر رکھا تھا، ان کی یہی کوشش رہی کہ علمی اشتغال کی کیفیت کو برقرار رکھیں اور اس میں خلل واقع نہ ہونے دیں، اسی لیے پابندیِ اوقات کا بھی وہ بڑا ہی خیال رکھتے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ اچھے اخلاق سے ملتے تھے، کسی کو ان سے کوئی اختلاف یا شکایت کا موقع نہیں پیدا ہوتا تھا، اور یہی ہر اس شخص کی شان ہوتی ہے جو علم میں پورا انہماک رکھتا ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کو تدریس کا کام ملنے پر اسی علمی انہماک کی بنا پر علمی سطح پر ان کی ترقی ہوتی گئی، اور وہ فقہ میں اپنے استاد اور شعبۂ فقہ کے صدر مولانا مفتی محمد ظہور صاحب ندوی کے معاون خاص بلکہ ان کے شریک کار کی حیثیت کے ہوگئے تھے، اور دونوں کے شخصی تعلق میں بھی اسی خصوصیت کی بنا پر بڑا اضافہ ہوا، اور فقہ کے علاوہ علوم دینیہ کے دوسرے شعبوں میں بھی ان کو اچھا درک حاصل تھا، شعبۂ حدیث شریف کے جو اسباق ان کے سپرد کئے گئے ان کو انھوں نے مفید انداز سے قابل فہم بنا کر پڑھایا، وہ حدیث کے شعبہ میں بخاری شریف پڑھانے کی بنا پر صدر شعبۂ حدیث (یعنی شیخ الحدیث) مقرر کئے گئے، جس کو انہوں نے اپنی وفات کے ایک روز پہلے تک بخوبی انجام دیا، اور اندازاً انھوں نے ۱۸-۱۹ سال بخاری شریف پڑھائی اور اس میں بڑی لیاقت وصلاحیت کا ثبوت دیا۔ اسی کیساتھ شعبۂ افتاء میں ان کا مقام یہ تھا کہ فتاویٰ تیار کرنے والے ان کی تصدیق کے بعد فتاویٰ کو مکمل حیثیت دیتے تھے۔

مولانا ناصر علی صاحب مرحوم کی ساری تعلیم چونکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں ہوئی تھی اس لیے مختلف فنون کے پڑھانے کا ندوۃ العلماء میں جو اسلوب اور منہج رکھا گیا ہے وہ اسی پر پوری طرح عامل تھے اور اسی کو صحیح قرار دیتے تھے اور اسی کو صحیح سمجھتے تھے وہ یہ کہ ہر فن کو اسی فن کے دائرہ میں رکھتے ہوئے پڑھایا اور سمجھایا جائے، نیز فقہی مسلک میں شدت کو عملی دائرہ میں رکھنا تو صحیح ہے لیکن تدریس کے موقع پر تشریح وتوضیح میں وسعت اختیار کرنا چاہئے اور مسلکی شدت سے بچنا چاہئے، نیز طلباء کو مطمئن کرنے کے لیے ان کو سوالات کا موقع دینا چاہئے اور ان کو مطمئن کرنے کے لیے جواب دینے میں کمی نہ کرنا چاہئے، اسی طرح حدیث کو حدیث کے دائرہ میں اور فقہ کو اس کے عمومی دائرہ میں رکھنا چاہئے تاکہ طلبہ بنیادی اور فروعی پہلوؤں کو الگ الگ سمجھ سکیں، مولانا ناصر علی صاحب کو اس طریقہ پر بڑا انشراح تھا اور اسی کو وہ ندوہ کی تعلیمی خصوصیت سمجھتے تھے اور ان کے اسلوب تعلیم سے طلبہ کو جو فائدہ پہونچا اس کا تذکرہ ان کے ان طلبہ کے خطوط میں ملتا ہے جو ان کی تعزیت میں آرہے ہیں، مذکورہ بالا خوبیوں کی بنا پر مولانا ناصر علی صاحب کی وفات سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی شعبہ کو بڑے خسارے سے سابقہ پڑا ہے، ان کے تدریسی اشتغال سے اور فقہ اسلامی میں افادہ وتعاون سے جو بھی فائدہ ہوا ہوگا، آخرت میں ان کو اس کا صلہ حاصل ہورہا ہوگا، یہاں جو جگہیں خالی ہوئی ہیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سے پیدا ہونے والی کمی کو دور فرمائے۔

مولانا ناصر علی صاحب نے اپنے پیچھے ایک بھرا کنبہ چھوڑا، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ صاحبزادگان اور تین صاحبزادیاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر وہمت دے اور صحیح طریقہ پر قائم رکھے اور مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انکی ساری نیکیوں اور علمی خدمات کو قبول فرمائے اور مقام علیین میں جگہ دے۔ آمین

مولوی ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندویؒ

مولوی ڈاکٹر سید محمد اجتباء حسینی ندوی نے اپنی علالت کے تسلسل کے نتیجے میں ۲۰ رجون ۲۰۰۸ء کی دوپہر میں اس دار فانی سے دار باقی کو رحلت کی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولوی اجتباء ندویؒ بستی کے ایک دینی، علمی اہمیت رکھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور وہ خاص طور پر تحصیل علم اور علمی مشغولیت کے راستے میں مختلف منزلوں اور مختلف مرحلوں سے گزرے تھے۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دینی تعلیم کی تکمیل کی، پھر دمشق یونیورسٹی شام کے کلیۃ الشریعہ سے بھی تعلیمی استفادہ کیا اور وہاں سے فراغت حاصل کی، اس طریقے سے ان کو ہندوستان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے استفادے کے ساتھ ساتھ شام کے علماء سے استفادے کا موقع ملا، اس کے لیے انھوں نے وہاں پانچ سال گزارے، وہاں سے ہندوستان مراجعت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہوئے، اسی کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کی تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے عربی شعبہ میں استاد مقرر ہوئے، اسی دوران ان کو اندرون ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دینے کے مختلف مواقع ملے، اور ہندوستان اور سعودی عرب دونوں جگہ ان کو اشتغال علمی کا موقع حاصل ہوا، اس طرح علم کے متنوع ماحول میں رہنے سے جو وسیع تجربات ہوتے ہیں، وہ ان کو حاصل ہوئے۔

آخر میں رٹائرمنٹ کی عمر کے قریب الٰہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبۂ عربی کے عہدے سے رٹائرڈ ہوئے، اور دہلی اوکھلا میں جامعہ ملیہ کے قریب سکونت اختیار کرلی، اور آزادانہ علمی و دینی کاموں میں مشغول ہوگئے۔

ان کے خاندان کو مولانا سید جعفر علی نقوی بستوی سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، جو امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، اور ان کے مشورے سے انھوں نے ہندوستان میں تعلیمی ودعوتی کام کی ذمہ داری سنبھالی، اور مشرقی یوپی، بہار اور نیپال جیسے علاقے میں درجنوں دینی مدارس قائم کیے، اور ان کی ان کوششوں سے علم دین کی اشاعت کا بڑا کام ہوا۔ ان کا علمی ودینی جذبہ ان کے خاندان میں بحیثیت وراثت کے منتقل ہوا، اور مولوی اجتباء صاحب کے بڑے بھائی مولانا سید محمد مرتضیٰ نقوی مظاہری ایک بڑے فاضل اور کارگزار شخصیت ہوئے، اور انھوں نے اپنے خاندانی مورث وجد اعلیٰ مولانا سید جعفر علی صاحب کی حضرت سید احمد شہیدؒ سے محبت وتعلق کی نسبت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے عقیدت ومحبت کا تعلق قائم کیا، اور تعلیمی مرحلے سے فراغت کے بعد ہی سے انھوں نے پوری زندگی ان کے قریب رہ کر گزادی۔ وہ دارالعلوم کے استاد بھی رہے، اور اس کے کتب خانے کے مہتمم بھی رہے، اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تمام دینی وسماجی کاموں میں معاونت بھی کرتے رہے، اور اسی تعلق کے ساتھ ۷۲ سال کی عمر پوری کی۔ انھوں نے ڈاکٹر سید محمد اجتباء ندوی کے بڑے بھائی ہونے کے تعلق سے ان کی تعلیم وتربیت کی پوری رہنمائی کی، والد کے انتقال کے بعد ان کے لیے والد جیسی سرپرستی کرتے رہے، مولوی اجتباء صاحب کی زندگی پر ان کی تربیت کے گہرے اثرات ہوئے، اور اس طرح حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے ان کے اس پورے خاندان کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور ان کے خانوادے سے گہرا ربط رہا، اس تعلق سے بھی مولوی اجتباء مرحوم حضرت مولانا سے قربت رکھتے تھے، اور ان کے مشوروں پر چلنے کو اپنے لیے مفید سمجھتے تھے۔ اور اسی نسبت سے ندوے سے بھی گہرا تعلق رکھتے تھے، اور شروع میں استاد کی حیثیت سے یہاں رہے، اور بعد میں یہاں سے دوسری جگہوں میں منتقل ہونے پر ندوۃ العلماء سے علمی ربط رکھتے رہے، اور اخیر میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

انھوں نے مختلف علمی اداروں سے واسطہ پڑنے پر اور تعلیمی وعلمی کاموں سے تعلق

رکھنے کی بنا پر اہم موضوعات پر تصنیفی کام بھی انجام دیے، ادب عربی کے تعلق سے بھی ذمہ داریاں انجام دیں، رابطہ ادب اسلامی عالمی کے قیام کے تعلق سے جو مشورے ہوئے، ان میں وہ عرب ادباء کے ساتھ شریک رہے، اور رابطہ ادب اسلامی کے قیام کے بعد اس کے وقیع رکن اور بعد میں پورے ہندوستانی حلقے کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ ان سے رابطہ ادب اسلامی کو تقویت پہنچی، اس طرح ان کے انتقال سے کئی حیثیتوں سے خسارہ محسوس کیا جارہا ہے۔ مذکورہ مختلف وجوہ سے میرا بھی ان سے قریبی ربط رہا، یہ ربط ندوۃ العلماء میں ان کی ابتدائے تعلیم سے اختتام تعلیم تک رہا، جو بعد میں آخر تک قائم رہا، اس کی بنا پر میں نے ان کے حادثۂ وفات کو اپنے قریبی اور عزیز شخص کا حادثہ محسوس کیا۔

انھوں نے مجھ سے اپنی طالب علمانہ زندگی سے اپنی بعد کی زندگی تک اپنے بڑے بھائی کی حیثیت سے تعلق رکھا، ان کے بڑے بھائی مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی مظاہری مرحوم (جو کہ عزیزان مولوی عبیداللہ اسعدی اور مولوی سعید مرتضیٰ اور مولوی عمیر وغیرہم کے والد تھے) ہمارے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص اور عزیز ترین دوستوں میں تھے، ان کے ان سے چھوٹے اور مولوی اجتباء صاحب سے بڑے بھائی مولوی سید محمد عبداللہ صاحب میرے ہم عمر اور دوست ہیں، ان دونوں کے تعلق نے بھی ان کے تعلق کو مجھ سے بڑھایا۔

عزیزی مولوی سید محمد اجتباء ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنے طالب علمانہ، پھر مدرسانہ مرحلے میں عربی زبان وادب سے جو گہرا تعلق پیدا کرلیا تھا، اس کی بنا پر برادر عزیز مولوی محمد الحسنی مرحوم اور مولانا سعید الرحمٰن صاحب حال مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان کی رفاقت رہی تھی، جب لکھنؤ سے ''البعث الإسلامی'' جاری ہوا تو اس کام میں مولوی اجتباء ندوی بھی عربی سے دلچسپی رکھنے والے اس گروپ میں شریک ہوئے، ان تینوں کے درمیان، اور بعد میں موجودہ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور عزیزی مولوی محمد واضح رشید ندوی کے ساتھ فکری ہم آہنگی، دعوتی فکر اور مسلم مسائل میں ان کا اشتراک رہا،

اور واضح سلمہ کے دہلی کے قیام میں خاص طور پر ان میں اور مولوی اجتباء صاحب کے درمیان ربط زیادہ بڑھا، جو تا حال قائم رہا۔

عزیزی مولوی محمد اجتباء ندوی کو ایک خصوصیت یہ حاصل رہی کہ انھوں نے عالم اسلام کی اہم اور چوٹی کی شخصیات سے استفادہ کیا، جن میں وہاں کی علمی ودعوتی شخصیات کے سربراہ شیخ مصطفیٰ سباعی اور ان کے دیگر رفقاء تھے۔ ان کے اس متنوع تعلقات کی بنا پر ان کو یہ خصوصیت بھی حاصل رہی کہ وہ بین الاقوامی پروگراموں میں مدعو کیے جاتے، اور وہاں وقیع طریقے سے شرکت کرتے، ان پروگراموں میں شرکت کے لیے سفر کرتے، دمشق یونیورسٹی، جامعہ ازہر، مراکش، اردن اور کویت کی یونیورسٹیوں میں ان کے محاضرات ہوئے، ان کا آخری اہم علمی سفر کویت یونیورسٹی کی دعوت پر دسمبر ۲۰۰۲ء میں ہوا، جہاں انھوں نے ''ہندوستان اور عرب کے ادبی روابط'' کے عنوان پر کلیدی خطبہ انٹرنیشنل سمینار میں پیش کیا، جو بہت مقبول ہوا۔

ہندوستانی حکومت نے عربی زبان وادب میں ان کی نمایاں خدمات کی وجہ سے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا تھا۔

اللہ نے بہت سی خصوصیات اور اوصاف وکمالات سے انھیں نوازا تھا، وہ اپنی صلاحیتوں سے لوگوں کو متاثر کرتے اور لوگ ان کے قدرداں تھے، متعدد اہم کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں، فکر اسلامی کے موضوع پر اسلام کی پندرہ سو سالہ تاریخ کا جائزہ ''تاریخ فکر اسلامی'' کے نام سے پیش کیا۔ اس کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی شخصیت وکارناموں پر اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ پر عربی میں کتابیں لکھیں، اور ''عورت اسلام کی نظر میں''، ''حقوق انسانی شریعت میں'' اور ''نقوش تابندہ'' کے عنوانات سے مختلف الموضوعات کتابیں تصنیف کیں، جو ان کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔

لگ بھگ ۷۴ سال کی عمر میں جمعہ کے دن ۲۰/ جون ۲۰۰۸ء کو نئی دہلی میں انتقال کیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی نیک کوششوں کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے، اور ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے، اور امت اسلامیہ کی دینی اور علمی ضرورتوں میں ان کا بدل عطا فرمائے۔

(۸) چند مخلصین اور خادمین دین

(۱) مولانا سلمان ندویؒ
(۲) شیخ عبداللہ العزامؒ
(۳) مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ
(۴) مولانا مرتضیٰ صاحب مظاہریؒ
(۵) مولانا عبدالسمیع ندویؒ
(۶) مولانا نعمان خان ندویؒ
(۷) حکیم افہام اللہ انہونویؒ
(۸) میر مقصود علی خان بنگلوریؒ
(۹) ڈاکٹر ابرار مصطفیٰؒ

مولانا سلمان ندویؒ

سہ روزۂ دعوت دہلی اور پندرہ روزۂ ''الدعوۃ'' کے ایڈیٹر مولانا سلمان ندوی کا ۲۱ رنومبر ۱۹۸۹ء کو پونے نو بجے انتقال ہوگیا اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم کا اعظم گڑھ کے ایک راجپوت گھرانے سے تعلق تھا اور دوران تعلیم ایک مولوی صاحب کی تقریر سے متاثر ہوکر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سرائے میر (اعظم گڑھ) میں وہ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ اردو کلاس میں بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اردو کے صدر مدرس (ہیڈ ماسٹر) نے آخرت پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور دین اسلام قبول کریں گے وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں گے، اور جنت میں جائیں گے، اس کے برعکس دوسرے لوگ ناکام قرار دیئے جائے گے، اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور دین اسلام کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا، ان کے گھر والوں کو اس کا علم ہونے پر بہت ناگواری ہوئی لہذا مشورہ ہوا کہ جگہ بدل دیں ادھر ندوۃ العلماء کے ناظم ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے تعارف کے لئے ندوے شعبہ قائم کر رکھا تھا، جس کے اثر سے کئی لڑکے اسلام کی طرف آئے تھے سلمان صاحب کے مشورہ ہوا کہ فی الحال کسی اور جگہ جانا مناسب ہوگا اس کے لئے ٹونک راجستھان تجویز ہوا وہاں کچھ مدت رہ کر پھر وہ مولانا سید سلیمان ندوی معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کے توسط سے ندوہ آگئے، اس واقعہ کی خبر سن کر میرے گھر والوں کو سخت غم وغصہ ہوا اور اس سے وہ پریشان ہوکر اپنے استاد کے پاس گئے، استاد نے یہ تفصیل سن کر ان سے فرمایا کہ اگر تم اسلام پر قائم رہنا چاہتے ہو، اور حفاظت چاہتے ہو تو ریاست ٹونک چلے جاؤ، چنانچہ استاد کے اس چیز مؤدبانہ مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ ٹونک چلے گئے اور پھر ٹونک سے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے توسط سے ندوہ آئے، اور محنت سے تعلیم حاصل کی، دوران تعلیم ان کے سرپرست کی حیثیت سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام درج ہے۔

مولانا سلمان ندوی ذہین اور محنتی تھے، دینی علوم، عربی ادب میں غیر معمولی دل چسپی

رکھتے تھے۔صحافت سے ان کا انہاک بڑھا،جس میں انھوں نے شہرت بھی حاصل کی،''دعوت'' اور''الدعوہ'' کے ذریعہ ان کی صلاحیتوں اور افادات سے اردو اور عربی دونوں حلقوں کو استفادے کا موقع ملا۔

وہ فراغت کے بعد درس تدریس کے بعد جماعت اسلامی کے مختلف ذیلی اور صوبائی شاخوں سے منسلک رہے۔ان کے پسماندگان میں ایک لڑکی اور لڑکا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے،اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔(آمین)

فضیلۃ الشیخ عبداللہ العزامؒ

فضیلۃ الشیخ عبداللہ العزام شرق اردن کی وزارت اوقاف میں ایک بڑے عہدے پر رہے اور دینی ودعوتی مقاصد کی طرف توجہ کرتے رہے پھر اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی فروفیسر ہوگئے اور جب افغانستان میں روسی اقتدار کے خلاف جد جہد شروع ہوئی تو اس میں شریک ہوئے کچھ عرصہ کے بعد ان کو حادثہ پیش آیا اور اپنے مالک حقیقی سے اپنے نیک کاموں کے ساتھ جا ملے واقعہ اس طرح پیش آیا کہ ۲۴ر نومبر ۱۹۸۹ء کو ان کے دو بیٹے نماز جمعہ کے لیے جمرود روڈ پشاور پر واقع جامع مسجد صغریٰ معاذ بن جبل پہنچے تو ریموٹ کنٹرول سے چلائے گئے ایک بم کے دھماکے سے کار کے پرخچے اڑ گئے اور یہ عرب محقق اور جانباز مجاہد مع اپنے جواں سال فرزندوں کے شہید ہوگئے، اور علم وجہاد کے میدان میں بڑا خلا چھوڑ گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

حادثہ کی ابتدائی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ شیخ مرحوم ہر جمعہ کو ایک مقررہ جگہ پر گاڑی کھڑی کرتے تھے۔ لہٰذا دشمن نے اس مقام پر بم رکھا اور دور تک تار لے جا کر ریموٹ کنٹرول سے بم اڑایا۔

پروفیسر عبداللہ العزام گزشتہ ۱۰ سال سے افغان مجاہدین کے شانہ بشانہ علمی وعملی طور پر افغان جہاد میں حصہ لے رہے تھے، اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پشاور میں ''دفتر خدمت'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور عرب دنیا سے افغان جہاد کے لیے آنے والے تمام عرب باشندے ان کی قیادت میں جہاد کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پروفیسر کے عہدے سے قبل دست برداری اختیار کر لی تھی، اور اپنی پوری زندگی افغان جہاد کے لیے وقف کر دی تھی۔

انھیں تیرہویں صدی ہجری کی تحریک اصلاح وجہاد کے عظیم رہنماؤں

امیر المومنین حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے جاں نثار رفیق کار و معاون خاص حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے والہانہ تعلق تھا، جنھوں نے اس خطہ کو اپنی جہادی کوششوں کا مرکز بنایا تھا اور صوبۂ سرحد کے بالاکوٹ کے میدان میں سکھوں کے ایک حملہ آور لشکر سے مقابلے میں شہید ہو گئے تھے۔

شیخ عبداللہ عزام نے اپنے ایمانی جذبہ اور دینی غیرت وحمیت سے کام لیتے ہوئے جس میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز نظر آتے تھے ملت کو لادینی خطرے سے بچانے کے لیے جان جوکھم میں ڈالتے ہوئے غیر معمولی اقدامات کیے، اور افغان مجاہدین کا نہ صرف ساتھ دیا، وہ خود اس اسلامی جہاد کا ایک حصہ بن گئے، مجھے ان سے ملاقات اور ان کی دینی جذبہ اور ان کے علمی ودعوتی کردار سے استفادے کا موقع ملا اور یہ محسوس ہوا کہ اللہ نے ان کو بڑے امتیازی صفات وخصائص سے نوازا تھا۔

ہم مرحوم شیخ اور ان کے صاحبزادوں کی اس دردناک موت پر (جسے ہم شہادت سمجھتے ہیں) اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی حسنات کی قبولیت اور مغفرت تامہ کی دعا کرتے ہیں: اللھم اغفرلھم وارحمھم وارزقھم جنۃ الفردوس۔

مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ ایم، اے علیگ

مولانا محبّ اللہ صاحب لاری ندوی ایم-اے علیگ ایک نہایت فاضل اور وسیع المطالعہ اور علوم دینیہ وعلوم عصریہ دونوں کی بیک وقت واقفیت رکھنے والی شخصیت تھے، ندوۃ العلماء میں فقہ وحدیث ادب عربی کی تعلیم مکمل کر کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وہاں کے علوم حاصل کئے، سیاسیات کے مضمون میں ایم.اے کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تدریس کا مشغلہ اختیار نہیں کیا ورنہ وہ کسی یونیورسٹی میں عربی یا پولیٹکل سائنس کے ایک ماہر اور بڑے استاد کی حیثیت سے تدریسی ذمہ داریاں انجام دیتے انھوں نے اپنے علمی مقام کو مطالعہ کے دائرے میں محدود رکھا اور کاروباری لائن اختیار کی۔ وہ قصبہ لار کے رہنے والے تھے جہاں کاروباری مشغلہ پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وہی اختیار کیا اور کانپور کو اپنا مرکز عمل بنایا۔

مولانا مرحوم کا ندوہ کے ساتھ طالب علمی کے دور سے جو ربط وتعلق قائم ہوا وہ برابر جاری رہا، چنانچہ جب وہ تعلیمی زندگی سے عملی زندگی میں داخل ہوئے تو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور اس وقت سے وفات کے وقت تک وہ برابر رکن مجلس انتظامی رہے اس رکنیت کے تعلق سے وہ ندوۃ العلماء کی سرگرمیوں سے برابر واقف رہے اسی کے ساتھ ساتھ ان کا تعلق ندوۃ العلماء کے ان ذمہ داروں سے جو مولانا اور ان کے رفقاء درس کے اساتذہ تھے برابر قائم تھا، چنانچہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے نیازمندانہ ربط تھا اور سید صاحب بھی شفقت فرماتے اور اعتماد کرتے تھے۔

پھر ندوۃ العلماء کے بعد کے ذمہ داروں سے مولانا کا تعلق رفیق درس کا تھا اس لیے ندوۃ العلماء سے ان کو مزید قرب ہوا اور بالآخر ۱۹۶۹ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم جناب مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ان کو ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری قبول

کرنے پر آمادہ کیا جو انھوں قبول کیا پھر انھوں نے اس ذمہ داری کو تادم آخر نباہا، اس خدمت میں وہ ۲۴ سال رہے اس پوری مدت میں ناظم صاحب مدظلہ اور ان کے درمیان بڑے اعتماد کی فضا قائم رہی، یہ اعتماد و تعلق اس بات کا نتیجہ تھا کہ تعلیم و تعلیم گاہ کے انتظام کے بارے میں دونوں کے خیالات میں پوری ہم آہنگی تھی۔ مولانا محب اللہ لاریؒ نے مخلصانہ انتظام کے ساتھ طلباء و اساتذہ سے معاملہ کرنے میں بڑی محبت و رعایت سے کام لیا، اس کی وجہ سے طلباء و اساتذہ میں ایک خاندان کے افراد کے ربط و تعلق کی فضا میں کام کرنے کی طاقت پیدا ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بڑا قیمتی وصف تھا کہ اساتذہ کے ساتھ ہمدردی و تواضع کے ساتھ پیش آتے اور وہ طلباء کے ساتھ شفقت اور خبر گیری کا طریقہ اختیار کرتے استاد کو یہ حق ملتا تھا کہ اپنے کسی تاثر و شکایت کو بے تکلف پیش کرتا اور مولانا ملاطفت اور بردباری سے اس کو سنتے خواہ اس میں ان کو اپنی کسر شان سے گزرنا پڑتا، وہ اس کا گلہ و شکوہ بھی نہ کرتے اور بات توجہ سے سنتے اور جو ہمدردی کر سکتے کرتے، طلباء کے ساتھ ان کا معاملہ یہ تھا کہ ان کو اپنی بات کہنے کا پورا حق دیتے، تعلیمی اوقات کا وقت کافی نہ ہوتا تو اپنی قیام گاہ پر وقت دیتے اور دیر تک طالب علم کی وضاحت کو سنتے اور کوشش کرتے کہ کسی غلط اطلاع یا غلط فہمی میں کسی طالب علم کو نقصان نہ پہنچے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جب کوئی بات ان کے سامنے عیاں ہو جاتی تو نظم و ضبط و انتظام کا جو تقاضہ ہوتا اس کو عمل میں لاتے اور اس کے خلاف کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے، ان کی یہ بات بہت قیمتی تھی کہ معاملہ کرنے میں بہت نرمی لیکن انتظامی تقاضے کو پورا کرنے میں سختی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مذکورہ بالا رویہ محض ایک خودرائی کا عمل نہ تھا بلکہ تعلیم و انتظام کے سلسلے میں ان کا مطالعہ تھا وہ اپنے علم و مطالعہ سے فائدہ اٹھاتے اس کے تجربوں سے واقفیت کو کام میں لاتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے ۲۴ سال اس نظم و انتظام میں گزارے اور سب کی محبت اور قدر افزائی کے مستحق بنے اور جب ان کا انتقال ہوا تو طلباء

واساتذہ دونوں نے یکساں شدید صدمہ محسوس کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی، وفات سے قبل کئی سال انھوں نے ضعف و پیری میں گزارے درمیان درمیان میں کئی بار اچانک ایسے بیمار ہوئے کہ لوگوں کو ان کے جانبر نہ ہوسکنے کا خطرہ ہوا، لیکن پھر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور وہ بیماری کے اچانک حملوں سے نکل آئے۔ بیماری کے تازہ حملہ میں بھی یہ امید کی جارہی تھی کہ مولانا انشاء اللہ اس مرض سے صحت حاصل کرسکیں گے، لیکن وقت موعود آچکا تھا اور مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں شروع ہی سے دین داری اور احتیاط کا جذبہ تھا، وہ اپنے اوقات کو صحیح اور دینی لحاظ سے سودمند طریقے سے گزارتے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے بہت پابند خود بھی تھے اور طلباء کے لیے بھی اس کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کوتاہی نہ کریں، انھوں نے اپنا رویہ یہ بنا رکھا تھا کہ طلباء کی نماز میں غفلت بالکل برداشت نہ کرتے اس کے لیے سمجھانے کی کوشش کرتے، انتظامی سطح پر اس کی فکر کرتے اور ضرورت پڑنے پر سرزنش کا بھی طریقہ اختیار کرتے۔

مولاناؒ کو یہ بڑا خیال رہتا کہ ہر شخص کو اپنی آنے والی زندگی میں پروردگار کے سامنے حساب دینا ہے اس کے لیے اسی دنیاوی زندگی میں فکر وتوجہ کرنا چاہئے۔ انھوں نے اپنی جوانی سے ہی دینی شخصیتوں، دینی تحریکوں سے ربط رکھا اور ان سے تعلق کے ذریعہ اپنے لیے دینی احساس اور جذبہ عمل حاصل کیا اور وہ اس کو اپنی زندگی میں بروئے کار لاتے رہے، تعلیمی زمانے کے ان رفقاء میں بڑی شخصیتیں ہوئی، ندوۃ العلماء کے تعلق سے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ، مولانا رئیس احمد جعفری ندویؒ، مولانا محمد عمران خاں ندویؒ اور کئی دیگر حضرات ہیں، علی گڑھ کے تعلق سے بھی ان کے رفقاء میں متعدد بڑی شخصیتیں رہی ہیں ان میں بعض مذہبیت سے بہت دور تھیں وہ مولانا مرحوم سے متاثر ہوئیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ اہتمام میں ندوہ کے اندر متعدد اچھے اور

عالمی سطح کے پروگرام ہوئے ان میں پہلا ندوۃ العلماء کا جشن تعلیمی تھا جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اسلامی عالمی اجتماع تھا جس مین باہر کے درجنوں اداروں کے نمائندے شریک ہوئے، باہر آنے والے ان مندوبین کی تعداد ۲۷ تھی۔ پھر چند سالوں کے بعد ادب اسلامی کا عالمی اجتماع ہوا جس کے بعد ادب اسلامی کی ایک عالمی انجمن کی تشکیل ہوئی یہ بھی اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع تھا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج ملی اور اسلامی پروگراموں کے کاموں میں اپنی فکر وتوجہ پرسکون طریقہ سے صرف کرنے کا تھا نام ونمود کے مظاہرے سے وہ بچتے تھے، ان کی عادت تقریر کرنے کی نہ تھی وہ اپنے خیالات صرف گفتگو سے پیش کرتے ۔ان کی رائیں ذمہ دارانہ اور بامقصد ہوتی تھیں وہ بہت سے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کرتے، اور جو مشورے ان کو وقیع محسوس ہوتے فوراً قبول کرتے۔ وہ اپنی نرمی، خوش اخلاقی اور فکرمندی سے مقبول ہوئے اور اپنے تدین وتقویٰ کا لوگوں پر اثر ڈالا، اور سب کو فائدہ پہنچایا اور اپنے انتقال سے سب کو خسارہ کا احساس دلایا۔

آسماں ان کے لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ان کے صاحبزادے عزیز مکرم مولوی اشتیاق احمد لاری ندوی ہیں جنہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور وہ دین کو تقویت پہنچانے والے کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ مہتمم صاحب کا سانحۂ وفات ۲۹ رنومبر ۱۹۹۳ء کو صبح ۸ بجے کے قریب پیش آیا اور ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور ڈالی گنج کے قبرستان میں جس میں ندوے کے متعدد فضلاء اساتذہ اور ذمہ دار مدفون ہیں وہ سپرد خاک ہوئے۔

رحمه الله رحمةواسعة وأكرم مثواه و رفع منزلته و الهم ذويه الصبر السلوان۔

مولانا سید محمد مرتضیٰ نقوی بستویؒ

مولانا سید محمد مرتضیٰؒ صاحب نقوی مولانا سید جعفر علی صاحب نقوی بستوی کے احفاد کے احفاد میں تھے۔ مولانا سید جعفر علی صاحب نقوی ان مصلحین اور مربیوں میں تھے جنھوں نے حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ وقت گذارا تھا۔ اور فیض حاصل کیا تھا۔ انھوں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات بھی قلمبند کئے تھے اور ان کی کتاب ''منظورۃ السعداء'' حضرت سید احمد شہیدؒ کے حالات زندگی کے مراجع میں ہے۔

دوسری طرف مولانا سید جعفر علی صاحب نے اصلاح وتربیت کا کام بستی اور اس کے قرب وجوار کے علاقہ میں مؤثر ڈھنگ سے انجام دیا۔ ان کے قائم کردہ مدارس ومکاتب اور ان کے انجام دیئے ہوئے اصلاحی کاموں کے اثرات اور ان کے قائم کردہ ادارے بستی کے علاقے کی ترائی مغربی بہار اور نیپال کے علاقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مولانا سید محمد جعفر صاحبؒ کے اثرات ان کے احفاد میں دینی حمیت، عقیدہ کی درستگی اور صلاح کی صورت میں عمومی طور پر پائے جاتے ہیں ان کے ان اہم احفاد میں ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کے ناظر مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب نقوی بستوی مظاہری بھی تھے، جن کا انتقال مؤرخہ ۴؍نومبر ۱۹۹۵ء کو فالج کے اچانک حملہ کے بعد تقریباً دو روز علیل رہ کر ہوا۔

مولانا مرحوم ایک صالح عالم دین، مظاہر العلوم سہارنپور کے فاضل، دردمند دل رکھنے والے اور دینی حمیت کے حامل شخص تھے ان کے اخلاق وانسانی ہمدردی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کو دوسروں کے فائدے اور سہولت کی فکر اپنے فائدے اور سہولت سے زیادہ ہے۔ دارلعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے خاص تعلق والوں کے معاملات میں کوئی فکرمندی اور تعاون اور کام میں مشارکت کا معاملہ ہوتا، اس میں مولانا پیش پیش نظر آتے۔ اور ایسی فکرمندی اور دلچسپی کا ثبوت دیتے کہ جیسے وہ خود اپنے گھر کے کاموں کو انجام دے رہے ہوں۔ اپنے اہل تعلق کی بیماری،

شادی، غمی کا معاملہ ہوتا تو مولانا مسائل کو حل کرتے اور ضروری نظم وانتظام کرنے میں خصوصی تعاون کرتے، عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے وسیع نظام کو چلانے میں اولین بوجھ اپنے اوپر لے لیتے ملی کاموں میں یا دینی اداروں کے معاملہ میں نہایت خوش دلی وفکرمندی سے تعاون دیتے اس کے لیے ان کو بارہا مشکل سفر کرنے میں بھی تردد نہ ہوتا۔

چنانچہ انتقال سے صرف ایک ماہ قبل آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے سالانہ اجلاس کے لیے جو احمد آباد (گجرات) میں کیا جانا طے ہوا تھا اور وہاں یہ اجلاس پہلی بار ہونے کی وجہ سے زمین تیار کرنے کی ضرورت تھی اور انتظامات کی صورتیں طے کرنا تھا۔ مولانا مرحوم کا انتخاب کیا گیا، مولانا مرحوم اس علاقہ میں پہلے سے متعارف تھے اسی لیے ان کا انتخاب ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے کشادہ دلی کے ساتھ تیار ہوئے۔ اس سلسلے میں ان کو لکھنؤ سے احمد آباد کے کئی سفر کرنے پڑے، اور انھوں نے ایسا کام انجام دیا اور ایسی فکر مندی کا ثبوت دیا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے تمام ذمہ دار رطب اللسان تھے۔ حالانکہ مولانا کی عمر ستر (۷۰) سال سے متجاوز تھی۔ لیکن ان میں کام کا حوصلہ بہت بلند تھا چنانچہ انھوں نے عمر کی پرواہ نہیں کی۔ یہ تو ان کے ہمدردانہ رویہ اور حسن تعاون کا حال تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی جو اصل ذمہ داری یعنی کتب خانہ کا اہتمام تھا، اس میں مولانا مرحوم کا کام اور اس کی ترقی میں حصہ بہت نمایاں رہا۔ کتب خانے کی کتابوں کی حفاظت اس کے ذخیرہ کے اضافہ میں انھوں نے بڑی مستعدی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا وہ کتابوں کے اضافہ کے لیے خرید کے ذریعہ، ہدیہ کے طور پر اور وقف کے طریقہ سے حصول کی برابر کوشش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب سے انھوں نے کتب خانہ کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت سے ان کے انتقال کے وقت تک کتب خانہ کا ذخیرہ دوگنے سے زیادہ ہوگیا۔ وہ کتب خانہ کی کتابوں سے اپنی عزیز ترین متاع کی حیثیت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ فکر میں رہتے تھے کہ کتابیں کن کن حضرات کے پاس زیادہ دنوں سے باقی رہ گئیں ہیں اور وہ کس طرح جلد واپس ہونا چاہئیں۔ وہ اہم کتابوں کی جگہوں تک سے واقف ہوتے تھے۔ جس سے مراجع کے طالب

کو فائدہ اٹھانے، ان سے استفسار پر بہ تکلف کتاب کی کتب خانہ میں موجودگی اور ان کی جگہ کا بھی پتہ چل جاتا تھا۔ بلکہ بعض وقت وہ کتاب خود وہاں سے نکال لاتے تھے۔ اور تحقیق کا کام کرنے والے کی مدد کر دیتے۔ ندوہ کا کتب خانہ کوئی چھوٹا کتب خانہ نہیں کہ مذکورہ بالا کام آسان ہو، وہ ایک لاکھ سے اوپر کتابیں رکھنے والا کتب خانہ ہے۔ اس میں زیادہ تر عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں کتابیں ہیں۔ ان کے بعد دیگر کئی زبانوں میں بھی کتابیں ہیں جو ایک درجن سے زیادہ موضوعات پر مشتمل ہیں۔

مولانا مرحوم کا دینی جذبہ بھی بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ دین کے فروغ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ جذبہ انھوں نے اپنے اجداد سے ورثہ میں پایا تھا، اس جذبہ کا ہی اثر تھا کہ وہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے اور ان کے خانوادہ کے افراد سے بہت محبت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کا تعلق اسی راستہ سے ہوا۔ اور پھر انھوں نے ان سے اتنا تعلق بڑھایا اور ایسا قرب پیدا کیا کہ تکمیل تعلیم کے بعد سے اپنی زندگی کی آخری سانس تک حضرت مولانا کے حلقۂ عمل سے وابستہ ہو گئے، اور ان کے معتمد علیہ ہو گئے۔ اس تعلق کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معہد میں تدریس کے کام سے ہوا۔ پھر اپنی کارگزاری کی وجہ سے کتب خانہ ندوہ میں ناظر کی جگہ خالی ہونے پر اس کے لیے نامزد ہوئے۔ اور پھر ساری زندگی اسی منصب کی ذمہ داری کو انجام دیتے رہے اور اس کے ساتھ رہ کر جو بھی ملی و مذہبی جدوجہد ہوتی اس میں جذبہ کے ساتھ شریک ہوتے اور توجہ دیتے، مولانا مرحوم کا اپنے زمانہ کے تمام بزرگوں سے بھی قریبی تعلق تھا۔ اور مولانا مرحوم ان کا اعتماد رکھتے تھے، اور اس تعلق سے روحانی اور دینی طور سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اپنے زمانے کے شیوخ کبار حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادرؒ رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ اور ان کے علاوہ مولانا اسعد اللہ سہارنپوری سے خصوصی عقیدت تھی۔ مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری سے جو کہ آپ کے استاد بھی تھے بیعت تھے، اور مظاہر علوم میں زمانۂ طالبعلمی ہی سے ان کو حضرت مولانا سید

ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے خصوصی تعلق قائم ہوگیا، اس کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ان کی خدمت میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ سے تو بالکل عزیزانہ اور دوستانہ تعلق تھا، وہ دونوں مظاہر علوم میں درجہ کے ساتھی بھی رہ چکے تھے۔ اس کی وجہ سے بے تکلفی بھی تھی، لیکن حضرت مولانا قاری صدیق احمد باندویؒ کے دینی مقام کی قدردانی اور احترام کا ان کو خیال بھی رہتا تھا۔ کاتب الحروف کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ مظاہری بھی مظاہر علوم میں ان دونوں کے درجہ کے ساتھ رہے تھے، اس تعلق سے دونوں حضرات کی محبت مجھ کو اور خاندان کے دوسرے افراد کو حاصل ہوتی رہتی تھی، اور ان سے ایک طرح کا دوہرا ربط ہوگیا تھا۔

مولانا مرحوم اپنی خصوصیات اور امتیازات کی بناء پر اپنے پورے خاندان میں ممتاز تھے۔ وہ اپنے خاندان کے لیے ایک ہمدرد، غم گسار عزیز تھے۔ خاندان کے سب افراد کو ان سے تقویت ملتی تھی۔ وہ اپنے ہم عمروں کے لیے محبت کرنے والے بھائی چھوٹوں کے لیے ہمدرد و سرپرست اور بڑوں کے لیے ایک سعادت مند خورد کی حیثیت رکھتے تھے مولانا مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ، پانچ فرزند اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ فرزندوں میں بڑے مولوی عبیداللہ اسعدی ہیں، جو مدرسہ اسلامیہ عربیہ ہتھورہ باندہ میں استاذ و مفتی ہیں، اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مولوی سعید حسن ندوی ریاض میں سعودی عرب کی ایک درس گاہ میں استاذ ہیں اور مولوی محمد عمیر ندوی کئی مفید کاموں کو شہر لکھنؤ میں انجام دے رہے ہیں۔ مولانا مرحوم کے مذکورہ تینوں صاحبزادے حافظ قرآن اور عالم دین ہیں اور تینوں کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی۔ ان میں سے اول الذکر مولوی عبیداللہ اسعدی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ دارالعلوم دیوبند میں بھی تعلیم حاصل کی انھوں نے وہاں سے افتاء کے ساتھ فضیلت کی، باقی دو بھائی خالد اور عمار سلمہما ابھی چھوٹے ہیں اور زیر تعلیم ہیں۔ ان کی بڑی صاحبزادی ان کے بڑے بھانجے سید محمد اسامہ کی زوجیت

میں ہیں اور دوسری صاحبزادی غیر شادی شدہ ہیں(۱)۔مولانا مرحوم کا سانحہ اگرچہ بہتر سال کی عمر میں پیش آیا لیکن ان کی خصوصیات اور ان کی زندگی افادیت کی وجہ سے صرف ان کے اہل تعلق کے لیے ایک صدمہ ہی کی بات نہیں بلکہ ان کے لیے اور ملی کاموں کے لیے بھی ایک خسارہ ہے۔ان کی خوبیوں کی وجہ سے عرصہ تک لوگ ان کو یاد رکھیں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ مولانا مرحوم کو اپنے قرب میں جگہ عطا فرمائے۔لغزشوں سے درگزر فرمائے،اور درجات بلند فرمائے اور اہل خاندان کو صبر استقامت عطا فرمائے۔(آمین)

---

(۱) ان کی شادی تکیہ رائے بریلی میں مولوی حافظ سید ابوالقاسم ندوی سے ہوئی جو مصنف کے عزیزوں میں ہیں اور مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں ۲۰۱۱ء کو انتقال کر گئیں اور دو بیٹیاں اپنے پیچھے چھوڑیں رحمہا اللہ تعالیٰ۔(م)

مولانا سید محمد عبدالسمیع ندویؒ

ندوۃ العلماء کے شعبہ تعمیر وترقی کے معاون ناظر مولانا سید محمد عبدالسمیع ندوی ایک باوقار بااخلاق خادم دین وملت، اور کار پرداز شخصیت تھے جو سال رواں ماہ شعبان کے اوائل میں قلبی دورے کے نتیجہ میں اس حیات فانی سے حیات باقی کی طرف کوچ کر گئے۔ انھوں نے ۷۵ سال کی عمر پائی۔ مرنجا مرنج متحرک اور فعال طبیعت کے مالک تھے زندگی علوم دینیہ کی خدمت، کتابوں کی اشاعت اور علوم دینیہ کے اعلی مقاصد کے اداروں کی خدمت میں صرف کی۔

انھوں نے تعلیم دارلعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں جگہوں حاصل کی اور دونوں جگہوں کی خصوصیات سے استفادہ کیا تعلیم سے فراغت کے بعد چند سال کانپور کی ایک معروف دعوتی وملی انجمن جمعیۃ مرکزی تبلیغ الاسلام کے کاموں سے دلچسپی لی پھر ندوۃ العلماء کے کارگزاروں میں شامل ہوئے، شعبۂ تعمیر وترقی کے قیام کے بعد اس کے ناظر کے معاون کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی جو تاحیات قائم رہی، شعبہ تعمیر وترقی ندوۃ العلماء کے تعمیری، اشاعتی اور ترقیاتی کاموں کے ذمہ دار شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا، اس کے تحت مطبعہ، تجارتی مکتبہ اور ندوۃ العلماء کی امداد کے لیے تحصیل وحصول کے کاموں کے فکر وانتظام کی ذمہ داری ہے۔ مولانا مرحوم کو کتابوں کی طباعت واشاعت کے معاملات سے آگہی پہلے ہی سے تھی، انھوں نے عملی زندگی کے آغاز سے ہی پانچویں دہائی کے آخر سے چھٹی دہائی کے نصف تک جو مشغولیت اختیار کی تھی اس میں نظیر آباد لکھنؤ میں واقع مشرقی اور اسلامی کتابوں کے ایک بڑے مرکز شبلی بک ڈپو کی ذمہ داری بھی تھی یہ ایک پرائیوٹ مرکز تھا جو مصری، شامی کتابیں نیز دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین کے تعلق کی کتابوں کا تجارتی

مرکز تھا۔اس کو اولاً کتب خانہ ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا کلیم احمد بہرائچی شخصی مکتبہ کی حیثیت سے چلاتے تھے اس کے چلنے میں دشواری ہونے کے نتیجہ میں اور دیگر اسباب کی بنا پر قابل فروخت ہوا، تو مولانا عبدالسمیعؒ نے اس کو سنبھالا لیکن مکتبہ زوال کے راستہ پر آ گیا تھا لہٰذا ان کے قابو میں نہ آ سکا اور انھوں نے اس سے دست برداری اختیار کر لی، اسی درمیان ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اسی جیسے کام کی جگہ مل گئی۔

مجھ کو مولاناؒ سے تعارف اسی زمانہ میں حاصل ہوا، اولاً شبلی بک ڈپو کے واسطہ سے کیونکہ اس میں مولانا کلیم احمد بہرائچی کے زمانہ ہی سے آتا جاتا رہا تھا، دوسرے یہ کہ مولانا عبدالسمیعؒ کوڑا جہان آباد ضلع فتح پور کے تھے جہاں ہمارے خاندان کے متعدد افراد کی رشتہ داریاں رہی ہیں، تیسرے ندوۃ العلماء میں مولانا کی تعلیم کے دوران جو رفقاء ان کے قریبی تھے ان میں میرے بڑے بھائی سید محمود حسن (متوفی ۱۹۴۲ء) اور میرے دوسرے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہما بھی تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر مولاناؒ کا ہمارے محلّہ محمد علی لین میں آنا اور ملنا ہوتا تھا اس وقت میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانیؒ کے مظاہر العلوم سہارنپور کے رفیق درس مولانا سید محمد مرتضیٰ نقوی بھی وہیں رہتے تھے۔ یہاں ان دو تین دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو بے تکلف عمر اور علمی درسی مشغلہ سے دلچسپی میں وحدت کی بنا پر دوستانہ اور رفیقانہ انداز سے ملتے اور کچھ وقت گزارتے مجھے بھی ان مجلسوں میں شرکت کا موقع ملتا تھا۔اس سے میرا مولانا مرحوم سے عزیزانہ اور قدرے بے تکلفی کا ربط قائم ہو گیا، جو ان کے ندوۃ العلماء سے متعلق ہو جانے کے بعد قائم رہا بلکہ پختہ ہوا۔ندوۃ العلماء میں مولانا مرتضیٰ مظاہری بستوی مرحوم بھی آ گئے تھے اور مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی مدظلہ نائب ناظم ندوہ العلماء بھی تھے جن سے ندوۃ العلماء مرحوم کے تعلیم کے زمانہ میں معاصرت و رفاقت رہ چکی تھی چنانچہ مولانا معین اللہ صاحب نے ان کو اپنا معاون بنالیا۔مولانا اس وقت شعبہ کے ناظر تھے، مولانا مرحوم معاون ناظر مقرر ہوئے۔ مولانا مرحوم نرم خو اور خوش اخلاقی کی صفات کے حامل تھے سب سے اخلاق و ہمدردی سے پیش

آتے وہ باوقار طبیعت کے آدمی تھے لیکن ان کا وقار دوسروں پر بار نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ برادرانہ دائرہ میں رہتا تھا، ان میں انتظامی صلاحیت بھی تھی چنانچہ ندوہ کے انتظامی دائرہ میں بھی بعض کام ان کے سپرد کئے جاتے تھے، خاص طور پر جن کاموں کا مزاج علمی ہوتا کچھ عرصہ وہ رواق سلیمانی کے نگراں بھی رہے، مجلس انتظامی ندوۃ العلماء کے مشاورتی جلسوں کی تیاری کے موقع پر بعض کام ان کے سپرد کیے جاتے تھے وہ ندوہ کی نصابی کتابوں کی اشاعت کی فکر کرتے تھے اور ان کے نئے اڈیشنوں کی ضرورت محسوس کر کے اشاعت کی تجویز کرنے کا کام بھی انجام دیتے۔ ندوہ کے لیے حصول تعاون کے جو حضرات بھیجے جاتے ان کے سلسلے کے امور میں متعلقہ حضرات کے مشوروں، پھر ناظم صاحب کی اجازت پر ان کے پروگرام کے طے کرنے اور بھیجنے کے کاموں میں ان کی ذمہ داری ہوتی۔

مولانا مرحوم سنجیدہ طبیعت کے تھے لیکن اس کے ساتھ مزاج میں انبساط رکھتے تھے۔ وہ اپنے رفقاء اور دوستوں سے بے تکلف رہتے تھے۔ ان میں دینداری و دینی وضع کی صفات نمایاں تھیں۔ نماز باجماعت کا اہتمام مسجد کی پابندی کے ساتھ بیماری کے زمانے میں بھی حتی الوسع نبھاتے تھے۔ مولانا عبدالسمیع صاحب کے والد مولانا عبدالحی صاحب ایک معروف عالم کانپور میں قائم معروف ملی و دینی ادارہ کے ناظم اعلیٰ تھے، مولانا مرحوم کو دین وملت کی خدمت کا جذبہ وہیں سے ملا تھا وہ اس میں اپنے والد صاحبؒ کے نائب اور قائم مقام پھر ناظم اعلیٰ ہوئے جس کو ندوے میں مشغول ہوجانے کے باوجود انھوں نے برابر نبھایا اور اس کے تحت نکلنے والے ایک پرچہ کو محکمات کے نام سے نکالتے رہے جو انجمن کے اپنے حلقہ میں زیادہ تر جاتا تھا۔

مولانا مرحوم نے ندوہ کے بعد دیوبند میں تعلیمی زمانہ گزارا غالباً اس زمانے میں مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے پیچھے بار بار نماز پڑھی ہوں گی۔ چنانچہ ان کا لحن ان کے ذہن میں رچ بس گیا تھا جس کا اثر ان کی قرأت سے ظاہر ہوتا تھا حتیٰ کہ بعض وقت بعض لوگوں کو شبہ ہوجاتا تھا کہ قاری طیب صاحب نماز پڑھا رہے ہیں۔

مولانا مرحوم مولانا معین اللہ صاحب ندوی ناظر شعبہ تعمیر وترقی و نائب ناظم ندوۃ العلماء کے تعلیمی عہد میں ساتھی ومعاصر ہونے کے سبب ان سے بہت قریب تھے بلکہ تعلق ایک طرح سے دوستانہ کیفیت کا حامل بن چکا تھا، عمر میں بھی یکسانی تھی لہٰذا مولانا مرحوم کی وفات ان کے لیے خاصی محسوس ہونے والی بات تھی۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ سے مولانا مرحوم عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے کچھ تو کوڑا جہان آباد کے تعلق سے اور کچھ دینی احترام اور قدردانی کی بنا پر اور یہ بات ملاقات پر ظاہر ہوتی رہتی تھی، چنانچہ حضرت مولانا سے اسفار کے موقعوں پر رخصت کرنے کے لیے ملتے اور تعلق خاطر کے ساتھ رخصت کرتے حضرت مولانا کے اس سفر کے موقع پر بھی آکر ملے اور رخصت کیا جب خود ان کے دنیا سے رخصت اختیار کرنے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے کسی کو معلوم نہ تھا ان کو سفر آخرت اسی رات پیش آجائے گا جو رات حضرت مولانا کی لکھنؤ سے دہلی کے درمیان سفر میں گذری اس کی صبح قیام گاہ پہنچنے پر وفات کی رنجدہ خبر ملی چونکہ اس روز جدہ کا سفر تھا اس لیے جنازہ میں شرکت بھی ممکن نہ ہوسکی میں بھی حضرت مولانا کے ساتھ تھا لہٰذا میں بھی محروم رہا۔

اگلی رات ریاض میں گزری اور وہاں مولانا مرحوم کے ایک بڑے بیٹے مولوی عبدالرشید ندوی سے ملاقات ہوئی یہ مرحوم کے پسماندگان سے پہلی ملاقات تھی تعزیت پیش کی۔ فیکس کے ذریعہ دوسرے صاحبزادگان کو بھی لکھنؤ میں بھی تعزیت پیش کی ان کی وفات ندوہ کے کارپردازوں میں ایک قیمتی شخصیت کا یہ خسارہ ہے اور ان کے محبین کے لیے ایک اچھے دوست محبّ اور محترم عزیز کا خسارہ ہے کہ خسارہ ایک دوسری طرف قابل قدر شخصیت مولانا مرتضیٰ صاحب ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء کے انتقال کے بعد ہونے والے خسارہ کے بعد پیش آیا اس لیے اس کا اثر مزید محسوس کیا گیا۔

مجھ کو اپنے دیرینہ تعلقات کی بنا پر تأثرات قلمبند کرنے تھے، سفر کی مشغولیات کی وجہ سے اور پھر کی واپسی پر لکھتا لیکن سفر سے واپسی پر مجھ کو خود اپنے ذاتی گھرانے کی بیماریوں اور حوادث سے گذرنا پڑا اور میں یہ کام فوراً نہ کرسکا، اب اس کو انجام دے رہا

ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے خصوصی جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کے ساتھ خصوصی رحمت ونعمت کا معاملہ فرمائے۔ آمین

مولانا مرحوم نے پسماندگان میں چھ صاحبزادگان چھوڑے، ڈاکٹر عبدالعزیز، مولوی عبدالرشید ندوی، مولوی عبدالجلیل ندوی، اور عزیزان عبدالرحمٰن، عبیدالرحمٰن اور عبدالحی (عرفی) سلمہم، اللہ تعالیٰ ان سب کو ترقی اور اعلیٰ مقامات مرحمت فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد نعمان خان ندوی بھوپالیؒ

مولانا محمد نعمان خان ندوی بھوپالی ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا محمد عمران خاں ندویؒ کے بھائی اور ندوۃ العلماء کے صالح فرزند ورکن مجلس انتظامی تھے، مولانا نعمان خان ندوی ایک بزرگ سیرت اور عالم دین اور دارالعلوم بھوپال میں استاد تھے، انھوں نے فراغت تعلیم کے بعد ہی سے اپنی زندگی تدریس وتعلیم کے کام میں صرف کی، دارالعلوم تاج المساجد میں استاد کے علاوہ نائب مہتمم کے عہدہ پر بھی رہے، اور اپنی ذمہ داریوں کو خواہ بحیثیت استاد کے رہی ہوں یا بحیثیت منتظم کے، فکر وتوجہ کے ساتھ پورا کیا، اور جب خدا کے حضور میں حاضری کا حکم آیا تو باجماعت نماز کے اختتام پر متصلاً دعا کے دوران ہی داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی وفات کا واقعہ ۸؍مئی ۱۹۹۸ء کو پیش آیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

مولانا کی وفات کا یہ انداز لائق صد رشک ہے کہ اپنے مالک حقیقی کے دربار میں اس زندگی کے دوران حاضری کی ادائیگی پوری کرنے پر بلا تاخیر آخرت والی حاضری بھی دے دی، اور اس طرح اپنے رب کے حضور حاضری سے قبل کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی اپنے رب کے ذکر اور اس کی طرف توجہ سے خالی نہیں گزرا، اس طرح زندگی کا اختتام دنیاوی عمل پر ختم نہیں ہوا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو دینی لحاظ سے مزید یہ خوش بختی حاصل ہوئی کہ ان کے دو صاحبزادگان نے جنھوں نے اپنی عین جوانی میں داعی اجل کو جب لبیک کہا تھا تو انھوں نے اپنے ان جواں سال بیٹوں کے داغ مفارقت کو اپنے مالک حقیقی کی مرضی قرار دے کر خاموشی کے ساتھ صبر واستقامت کی مثال اختیار کی اور مزید یہ ہوا کہ ان صاحبزدوں کو بھی اسی طرح کی موت مقدر ہوئی جیسی ان کے بزرگ والد کو بعد میں ملی یعنی نماز سے وابستگی کے دوران بلا توقف اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، ایک صاحبزادہ مولوی منصور نعمانی اور دوسرے مولوی محمود نعمانی ہیں، اول الذکر کا انتقال کئی سال قبل بحالت سجدہ ہوا اور ثانی الذکر کا ابھی صرف کئی ماہ قبل نماز کے ساتھ ہی ہوا،

جواں سال عزیزوں کے انتقال پر صبر جمیل کے ایک موقع سے مولانا مرحوم کو یہ مزید سابقہ پڑا کہ ان کے داماد بھی کم عمری میں داغ مفارقت دے گئے، مولانا مرحوم نے یہ سب حادثے مثالی صبر کے ساتھ برداشت کئے۔

مولانا نعمان خاںؒ اپنے والد کے فرزندوں میں چوتھے فرزند تھے۔ان سے قبل ان کے تین بھائی انتقال کر چکے تھے ان میں ہر ایک عالم اور دین وملت کا کارگزار فرد تھا۔سب بھائیوں نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور دین وملت کی خدمت میں زندگی گزاری۔ان میں سرخیل حضرت مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو ندوۃ العلماء کے مہتمم ہونے کے علاوہ تاج المساجد جیسی عظیم مسجد کے معمار ثانی اور دارالعلوم تاج المساجد کے امیر و مہتمم تھے اور جنھوں نے بحیثیت داعی دین اور ملت اسلامیہ ہندیہ کی کئی پہلوؤں سے خدمت وتقویت میں شہرت پائی، دوسرے بھائی مولانا محمد عرفان خان ندوی ہوئے وہ بھی عالم باعمل اور خادم دین وملت تھے، تیسرے بھائی مولانا سلمان خان ندوی دارالعلوم تاج المساجد کی تعلیمی وانتظامی ذمہ داریوں میں وقت صرف کیا اور اپنے برادر اکبر مولانا محمد عمران خاں کا ہاتھ بٹایا اور دارالعلوم کو ترقی دینے میں اپنی پوری قوت صرف کی، ان بھائیوں میں مولانا محمد نعمان خان ندوی کے انتقال کے بعد اب مولانا محمد لقمان خان ندوی ازہری اپنے بھائیوں میں تنہا نمائندہ رہ گئے ہیں جو ندوی ہونے کے ساتھ اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عمران خان ندویؒ کی طرح ازہری بھی ہیں، اور تاج المساجد بھوپال ہی میں تعلیم وتدریس کے مشغلے میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور دین وملت کو ان کی فکر ومحنت سے برابر فائدہ پہنچے(۱)۔

---

(۱) افسوس کہ مولانا محمد لقمان خاں ندوی بھی اپنے بھائی مولانا محمد نعمان خاں مرحوم کی طرح نماز سے وابستگی کے دوران کہ وہ نماز جمعہ کے لیے ایک خطبہ سے فارغ ہوئے تھے جاں جان آفریں کے سپرد کر گئے۔إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔
ان کا بھی ندوہ سے تعلق بڑا گہرا تھا اور وہ اس کے علمی ودینی پروگراموں میں شرکت کا اہتمام کرتے اور رمضان المبارک کے کچھ دن اپنے استاد اور شیخ ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی خدمت میں رہ کر گزارتے اور ان کے بتائے ہوئے معمولات کی پابندی کرتے اور ندوہ سے تعلق رکھنے والا کوئی ان کے وطن بھوپال پہونچ جاتا تو وہ اس استقبال کرتے اور خود میزبان ہوتے وہ ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی منتخب ہو گئے تھے۔رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وادخلہم فی جنات النعیم۔

مولانا نعمان خان نے اپنے والد مولانا حافظ محمد الیاس خاں بھوپالی کی رحلت کے بعد جو ۱۹۴۷ء سے قبل لکھنؤ میں واقع ہوئی تھی۔ اپنے بڑے بھائی مولانا عمران خان ندوی کی سرپرستی میں ندوہ کی تعلیم مکمل کی۔ ان کی طبیعت شروع سے خوش اخلاقی خدمت خلق اور تواضع کی رہی، عالی خاندان اور عالم دین ہوتے ہوئے اس طرح کی سیدھی سادی زندگی رکھتے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کی خصوصیت وخوبی کو محسوس نہیں کیا جاتا تھا، وہ مجمع میں صرف ایک دیندار مسلمان معلوم ہوتے تھے، وہ علمی حیثیت سے پختہ کار تھے، دارلعلوم تاج المساجد میں ان کو اونچی کتابیں پڑھانے کو دی جاتی تھیں، وہ دینی صلاح وفلاح کی فکر میں بھی ممتاز تھے، اپنی روحانی تربیت کے لیے بھوپال کے شیخ وقت اور ممتاز بزرگ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی عرف پیر ننھے میاں صاحبؒ سے قریبی ربط رکھتے تھے، اور ان کے مشوروں کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ترتیب دیتے تھے۔ پیر صاحب کا بھی ان سے بڑا شفقت ومحبت کا تعلق تھا، پیر صاحب کی وفات کے بعد ان کے بزرگ صاحبزادہ اور جانشین مولانا سعید میاں صاحب مجددی سے ربط رکھتے رہے، چنانچہ ان کی زندگی میں جو باطنی صلاح وخوبی عبادت وعمل کا شوق اور پابندی دیکھی جاتی تھی، اس میں ان کی روحانی تربیت کا بھی بڑا اثر تھا۔

مولانا نعمان خاں رحمۃ اللہ علیہ اپنے بڑے بھائی مولانا محمد عمران خاں ندوی کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن منتخب کئے گئے تھے، ندوۃ العلما سے ان کا تعلق دیرینہ تھا ہی اس نئے تعلق سے مزید اضافہ ہوا۔ وہ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے آخر میں ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ میں پہنچ نہیں پا رہے تھے، اس سال انھوں نے باوجود اپنے ضعف صحت کے شریک ہونے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن جلسہ کے انعقاد کی تاریخ سے پہلے ہی آخرت کے سفر کا وقت آ گیا اور شرکت نہیں ہو سکی ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ نے حسب ذیل الفاظ میں ان کی وفات پر تعزیت کی:

''افسوس کہ آج کی مجلس انتظامیہ کے انعقاد سے تین چار روز پہلے ۸ر مئی ۱۹۹۸ء کو مولانا حافظ محمد نعمان خاں صاحب ندوی بھوپالی کی وفات ہوگئی

،مولانا مرحوم، سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا حافظ محمد عمران خاں علیہ الرحمۃ کے حقیقی بھائی تھے، اور تاج المساجد کی تعمیر وترقی میں اپنے برادر بزرگ کے قوت بازو اور شریک کار رہے، اور دارالعلوم تاج المساجد کی ذمہ داریاں بھی مختلف حیثیتوں سے اٹھاتے رہے، عالم باعمل، مخلص بے ریا، متواضع اور ملنسار بزرگ تھے، ان کی زندگی میں ہی ان کے دو فرزندوں کا انتقال ہوگیا تھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اور ندوہ سے ان کا اور ان کے خاندان کا گہرا تعلق تھا، ان کے تمام بھائیوں، فرزندوں نے ندوہ میں تعلیم حاصل کی، اور ہمیشہ ندوہ کو اپنا ادارہ سمجھتے رہے، اس کی خدمت کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہے تھے۔"

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے خاص جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، اور ان کی وفات سے جو علمی و دینی خسارہ ہوا ہے اس کی ممکنہ تلافی مقدر فرمائے۔ آمین۔"

حکیم افہام اللہ انہونویؒ

ضلع رائے بریلی کے قصبہ انہونہ میں اپنے وقت کے ایک بڑے طبیب حکیم محمد افہام اللہ نے بتاریخ ۶/ اگست ۱۹۹۸ء کو اپنے پروردگار کی دعوت پر لبیک کہا، اور اس جہان فانی سے کوچ کیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وغفرلہ مغفرۃ عظیمۃ، وإنا للّٰہ إلیہ راجعون۔

حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ رائے بریلی کے قصبہ دمدمہ جلال پور کے سادات گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ایک جید حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب تقویٰ وعبادت گزار بھی تھے۔ اپنے وقت کے بزرگوں سے قریبی تعلق رکھتے رہے اور ان کی محبتوں اور دعاؤں سے مستفید ہوئے، موجودہ زمانے میں جب کہ طب یونانی کے ماہر دنیا سے کم ہوتے جارہے ہیں، حکیم صاحب مرحوم اس کی قدر و قیمت نہ صرف یہ کہ قائم رکھے ہوئے تھے، بلکہ ایسے مریضوں کے لیے جو عصری علاج سے تھک کر سرگرداں اور پریشان ہوتے، ان کے لیے رحمت کا فرشتہ بنتے، وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طبیہ کالج کے پرنسپل رہے، اور رٹائرمنٹ کے بعد اپنے وطن انہونہ ہی میں مطب کرنے لگے، اور جلد ہی انہونہ کو حکیم صاحب مرحوم کی اہمیت اور شہرت حاصل ہوگئی، اور حکیم صاحب کے پاس مریض مشکل امراض میں پہنچنے لگے، اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ حکیم صاحبؒ نے الحمدللہ اچھی عمر پائی، لیکن ان کی طبّی اور دینی افادیت کے پیش نظر ہر ایک کی یہ تمنا تھی کہ حکیم صاحب کی زندگی مزید طویل ہو۔

حکیم صاحب تنہا خود ہی حکیم نہ تھے بلکہ ان کا پورا خاندان حکمت سے وابستہ تھا، اور اس کے کئی افراد کو اس فن میں امتیاز حاصل رہا، سب سے پہلے تو ان کے والد ماجد حکیم اکرام اللہ صاحب نامور حکیم ہوئے، اور ان کو متعدد مشکل ترین علاجوں میں کامیابی حاصل

ہوئی اور شہرت ملی، پھر حکیم افہام اللہ صاحب اور ان کے بھائی حکیم اسلام اللہ صاحب حکمت کے راستے سے مشہور ہوئے، پھر حکیم صاحب مرحوم کے دو صاحبزادے حکیم کلیم اللہ صاحب اور حکیم نعیم اللہ صاحب نے اس فن میں اعتماد حاصل کیا۔

حکیم صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے حکیم کلیم اللہ صاحب عالم ربانی حضرت مولانا ابرار الحق حقیؒ کے داماد ہیں، حضرت مولانا سے اس رشتے کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک بزرگ صفات شخصیت ہیں اور کم عمری ہی میں حضرت مولانا ابرار الحق کے دینی اعتماد کے حامل بن کر ان کے خلیفہ ومجاز بیعت ہوئے۔

حکیم صاحب مرحوم کے دوسرے صاحبزادے حکیم نعیم اللہ صاحب اپنے وطن انہونہ ہی میں اپنے والد کے جانشین بنے، جب کہ بڑے صاحبزادے حکیم کلیم اللہ صاحب نے علی گڑھ کو اپنا مستقر بنایا اور وہیں اپنا نجی مطب قائم کیا جو مرجع خلائق بنا ہے، حکیم صاحب مرحوم کا اپنے وقت کے بزرگوں سے گہرا ربط رہا۔ ایک طرف حضرت مولانا ابرار الحق حقی، دوسری طرف حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی تعلق رہا، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی بہت تعلق رہا، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بھی اپنی صحت کے سلسلے میں خصوصی مشورہ وعلاج انھی سے کراتے اور اس کا اچھا فائدہ محسوس کرتے، دونوں کے درمیان اس تعلق علاج کے علاوہ دینی رشتے سے گہرا ربط قائم ہوا۔ حکیم صاحب مرحوم بارہا حضرت مولانا کی صحت کا حال جاننے اور کچھ کرنے کی غرض سے ان کے وطن رائے بریلی تشریف لائے، اور علاج کے علاوہ دینی تعلق سے بھی محبت وربط کا اظہار فرمایا اور متعدد بار لکھنؤ بھی تشریف لائے اور نسخے تجویز کیے بلکہ دوائیں خود تیار کر کے حضرت مولانا کے پاس ارسال کیں۔ حکیم صاحب مرحوم اور ان کے خاندانی بزرگوں کا ہمارے خاندانی بزرگوں سے جو تعلق تھا وہ خوشی اور غمی دونوں موقعوں پر ظاہر ہوتا ہمارے والدہ مرحومہ ہمشیرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے آکر حضرت مولانا کی خدمت میں تعزیت پیش کی اور جب تک بیٹھے رہے

آپ دیدہ رہے اور وہ اشعار بھی پیش کئے جو انہوں نے اس سانحہ سے متاثر ہوکر حضرت مولانا کے لئے کہے تھے اور اس میں ان کی اولاد کا بھی بڑے تعلق سے ذکر کیا ہے یہ اشعار فارسی میں ہیں اور کاروان ادب لکھنؤ کے ایک شمارے میں طبع ہو چکے ہیں۔

حکیم صاحب مرحوم کا بیعت استرشاد کا تعلق مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری ثم الہٰ آبادی سے تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے وہ مجاز طریقت بھی تھے لیکن حکیم صاحب کی طبیعت میں اخفا تھا اس لئے ان کی اس خصوصیت کا علم خاص خاص اہل تعلق ہی کو ہوسکا، حکیم صاحب مرحوم کا اہل دین اور بزرگوں سے تعلق اور ان کی طرف سے جو قدر و محبت ان کو حاصل رہی، اس کی بنا پر حکیم صاحب تعلیم دین کے مرکز عظیم دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے، اور اس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن منتخب کیے گئے تھے اور اس کے سالانہ جلسوں میں بھی تشریف لاتے اور شریک ہوتے تھے۔

حکیم صاحب کے علاج کی اثر پذیری کی شہرت صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہندوستان سے باہر بھی ان کی شہرت ہوئی، چنانچہ حجاز مقدس سے بھی ان کے علاج کے شائقین ان سے ربط قائم کرتے اور علاج کراتے تھے۔

حکیم صاحب اپنی عمر کے آخری حصے میں خاصے علیل رہنے لگے تھے اور کمزوری بہت بڑھ گئی تھی اور کئی جہتوں سے ان کی صحت کی طرف سے تشویش محسوس کی جارہی تھی، بالآخر ندائے حق آ گئی اور حکیم صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے گاؤں بلکہ اپنے مکان ہی کی زمین کے ایک حصے میں اپنی ہی قائم کردہ مسجد کے کنارے آرام گاہ حاصل کی، ان کی نماز جنازہ میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی، مقامی حضرات کے علاوہ بیرونی حضرات نے مختلف جگہوں سے آ کر شرکت کی، جس میں لکھنؤ، ہردوئی، اور الہٰ آباد سرفہرست ہیں، نماز جنازہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی باوجود اپنی پیرانہ سالی اور ضعف صحت کے شرکت فرمائی بلکہ پہلی نماز جنازہ بھی پڑھائی ان

کے ساتھ رائے پور سہارنپور کی بزرگ شخصیت اور خانقاہ رائے پور کے مسند نشیں مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوری مدظلہ بھی تھے جو رائے پور سے حضرت مولانا سے ملنے کے لئے دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ حکیم صاحب مرحوم کو ان کی نیکیوں کا بہت صلہ دے اور پسماندگان کو صبر و رضا بالقضا اجر آخرت حاصل کرنے کی توفیق عطا کرے۔ آمین

پروفیسر ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاںؒ

پروفیسر ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک صالح مسلمان، دل نواز اور اخلاق ومحبت کی حامل شخصیت تھی جس نے چند ماہ پہلے اس دنیائے فانی سے دنیائے باقی کی طرف رحلت کی، ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔

پروفیسر صاحب مرحوم ادھر کچھ عرصہ سے بستر علالت پر تھے ان کی صحت روز بروز گرتی گئی بالآخر وقت موعود آپہونچا اور انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اس طرح وہ عمر کی ۸۵ بہاریں دیکھ کر ۹ر دسمبر ۲۰۰۴ء کو علیگڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے احاطے میں ابدی نیند سوگئے وہ ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے تھے، ان کی زندگی کے دو پہلو بہت ممتاز رہے، ایک تو انسانیت دوستی اور دوست نوازی اور دوسرا پہلو اپنے فن باٹنی (Botany) میں مہارت، جس سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ باٹنی میں پڑھنے والے طلبہ ہی کو فیض نہیں پہنچا بلکہ بین الاقوامی سیمیناروں میں اور اس فن کے خصوصی مذاکروں میں ان کی شرکت اور ان کے علم وتجربہ سے فائدہ پہنچا، اور اس سلسلے میں بین الاقوامی سطح پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا۔ جہاں تک ان کے فن کا تعلق ہے، چونکہ وہ میرا فن نہیں اس لیے اس کے متعلق کچھ زیادہ اظہار خیال نہیں کرسکتا، البتہ ان کا پہلا لائق قدر پہلو یعنی انسانیت دوستی اور دوست نوازی کے اظہار کے مواقع مجھے بار بار دیکھنے کو ملے، ان سے ملاقاتوں میں اور ان سے گفتگو میں اس پہلو کا پورا پورا اظہار ہوتا تھا وہ بڑے وسیع القلب اور خوش مزاج وخوش مذاق شخصیت کے مالک تھے، ان کی اس خوبی کی وجہ سے ان کے ملنے والوں کو ایک خوشی اور انس کی کیفیت محسوس ہوتی تھی، بے تکلف تبصرہ کرنے والے اور حالات پر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے والے اور تجربہ کی بات کہنے والے شخص تھے، ان کے

بے تکلف فقروں میں تنقید کا پہلو بھی ہوتا تھا، لیکن ایسے دوستانہ اسلوب میں کہ جو نصیحت اور خیر خواہی کا ہی انداز لگتا تھا، اس لیے ان کے فقروں کو کوئی برا نہیں مانتا تھا، اور ان کی قدر بلکہ ان کے معمر ہو جانے کے بعد ان کی عظمت کا احساس ہوتا تھا، جس کو کسی معنی میں بزرگی بھی کہا جا سکتا ہے، بزرگی کا مطلب شخصیت میں بڑا پن اور نیکی کی صفت کا پایا جانا ہے، اور یہ بات ان میں نمایاں طریقہ سے محسوس کی جاتی تھی وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے پوری قوت سے کہتے تھے، کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے، حضرت مولانا علی میاںؒ سے ان کا ربط و تعلق کب شروع ہوا، اور کیسے شروع ہوا، اس کو متعین طریقہ سے بتانا مشکل ہے، البتہ جتنا میں سمجھ چکا ہوں اس تعلق کے آغاز میں ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی مرحوم کا دخل تھا وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علم رہ چکے تھے، اسی طالب علمی کے دور میں پروفیسر ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں سے ان کا تعلق بڑھا، اور وہ اپنی علی گڑھ کی آمد میں ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں کے یہاں ہی ٹھہرنے لگے اور مولانا علی میاں ندویؒ کے بھی علی گڑھ کے سفر میں وہاں ٹھہرنے کا ذریعہ بنے اس ٹھہرنے سے ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو انس محسوس ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے بھی ان کی بڑی قدر دانی کی یہ قدر دانی محبت اور قریبی تعلق میں تبدیل ہوگئی اور مولانا کی علی گڑھ کی ہر آمد میں قیام گاہ ڈاکٹر صاحب کا مکان ہی بنتا رہا، اور پھر یہ بات صرف مولانا کے ساتھ ہی مخصوص نہیں رہی بلکہ مولانا کے متعلقین کو بھی یہی انداز اختیار کرنے کا موقع ملا، اور ڈاکٹر صاحب کو اسی پر اصرار رہتا کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم، حضرت مولانا اور ان کے متعلقین ان کے مکان کے علاوہ کہیں اور نہیں ٹھہر سکتے، اس قیام میں ٹھہرنے والے کو صرف قیام ہی کا فائدہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ خاں کی دلچسپ اور مفید گفتگو سننے کا بھی فائدہ ہوتا تھا، جس میں حالات پر تبصرہ اور مختلف معاملات میں دانش مندانہ رائے بھی سننے کا موقع ملتا تھا، اس کے ساتھ ان کے لطیفے اور خوش مذاقی کے جملے لطف پیدا کر دیتے تھے ان باتوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب میں دین کی حمیت اور دینداری کا پاس ولحاظ بہت تھا وہ اس سلسلے میں مفید لٹریچر کا مطالعہ بھی کرتے تھے، اور

علماء سے عقیدت اور قدر کے احساسات بھی رکھتے تھے، جس کا انداز ان کی گفتگو کے مشتملات سے ہوتا تھا، ان کے دینی مزاج اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے تعلق کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ جب انھوں نے اپنی پہلی بیٹی کی شادی کی تو بھائی اور بہن کو بلایا، علی گڑھ سے بھی کسی کو نہیں بلایا، حضرت مولانا کو نکاح کے لیے بلایا اور حضرت مولانا جب پہنچے تو ان سے فرمایا کہ اگر پرائم منسٹر (Prime Minister) بھی آتے تو ہمیں اتنی خوشی نہ ہوتی جو آپ کے آنے سے ہوئی، اس زمانہ میں ایک اچھا کمرہ دس ہزار میں بنتا تھا، تو ایک کمرہ ندوۃ العلماء میں اپنی بیٹی کی طرف سے بنوایا اور ایک بڑی رقم اپنی بیٹی کے کھاتے میں جمع کی، ان کے خورجہ کے عزیزوں کو جب معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اتنے مختصر و محدود پیمانہ پر شادی کی رسم انجام دی ہے تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ ابرار! اگر تم نہیں کر سکتے تھے تو ہم سے کہہ دیتے دو تین لاکھ ہم خرچ کر دیتے، تم نے تو ناک کٹوا دی، ڈاکٹر صاحب نے جواب میں یہ فرمایا کہ ناک بہت بڑی ہوگئی تھی اسی کو کٹوانا تھا، حالانکہ اس زمانہ میں ان کا باغ کئی لاکھ میں فروخت ہوتا تھا، وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور پورے خاندان کو حضرت مولانا سے بیعت کرا دیا تھا وہ حضرت مولانا کے مشوروں کا خیال کرتے تھے، بعض بڑے مناصب سے جن کی انھیں پیش کش ہوئی تھی اس لیے انھوں نے معذرت کر لی کہ حضرت مولانا کا منشاء نہیں تھا۔ (۱)

ڈاکٹر صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد اچھا خاصہ زمانہ گزارا، اس زمانہ میں بھی یونیورسٹی سے ان کا ربط برابر قائم رہا، اور یونیورسٹی کی انتظامیہ کی نظروں میں ان کی بڑی وقعت اور قدر رہی اور ان کے اخلاق اور پھر اپنے علمی فن سے تعلق ان کے مقام و حیثیت کو قائم رکھتا رہا، عمر کے آخری حصہ میں وہ ڈاکٹر صاحب جو اپنی علمی خصوصیات کے ساتھ ایک خوش کلام شخصیت رہے تھے کسی فالجی اثر سے کلام و اظہار خیال سے قاصر ہو گئے تھے، اور اس حالت میں انھوں نے ایک مدت گزاری اور اس میں کبھی کبھی یہ انداز بھی ظاہر ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو بھی جن سے بڑے تعلقات رہے تھے، پہچاننے میں بڑی معذوری محسوس کر

رہے ہوں، آنکھ کی چمک اور چہرے کی بشاشت سے تو وہ کبھی کبھی اظہار کرتے تھے کہ پہچانتے ہیں، لیکن عام طور پر وہ سکوت ہی اختیار کرتے تھے، اور ان کے ملنے والے کو تشفی نہیں ہوتی تھی بہر حال اس دنیا میں میں کسی کو ہمیشہ رہنا نہیں ہے، خواہ کیسی بھرپور صحت ہو اور کیسی ہی سمجھ اور خوش اخلاقی ہو ایک وقت مقرر ہوتا ہے جس میں اس کو اپنے مالک کے پاس جانے کے لیے اس دنیا کو چھوڑنا ہوتا ہے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا جب وقت آ گیا تو وہ بھی رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، ان کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفہ بدلہ دے، اور جو کوتاہیاں ہوگئی ہوں ان کو معاف فرمائے۔

انھوں نے دو صاحبزادوں کی صورت میں اپنی نشانی چھوڑی جن میں بڑے صاحبزادے ڈاکٹر ابصار صاحب مسلم یونیورسٹی میں لکچرر سے پروفیسر کے مقام تک پہنچے اور بعض انتظامی ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد ہوئیں اور وہ محبت اور دوست نوازی میں اپنے والد مرحوم کی خوبیوں کے حامل ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو مزید خوبیوں سے نوازے اور وہ اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ثابت ہوں۔

امام عیدگاہ مولانا ابوطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ

امام عیدگاہ لکھنؤ مولانا ابوطیب احمد میاں فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کی ایک موقر اور محترم شخصیت تھے، اور ان کا خاندانی تعلق فرنگی محل عالم اسلام کی مشہور علوم دینیہ کی درسگاہ کے جلیل القدر بانیوں اور بزرگوں سے ہونے کی بناء پر ان کو بڑے احترام سے کی نظر سے دیکھا جاتا رہا تھا، لکھنؤ کی بڑی اور اصل عیدگاہ کی امامت کی ذمہ داری نے ان کو اہل لکھنؤ اور لکھنؤ کے اطراف کے علاقوں میں مسلمانوں میں اور زیادہ معروف بنادیا تھا، انہوں نے جس اخلاق و کردار کی زندگی گذاری، وہ ان کی محترم شخصیت کی علامت بنی، اولاً ان کا فرنگی محل کے خاندان کے فرد ہونے کا جو تعلق تھا، وہ خصوصیت اور احترام وقدردانی کا باعث تھا، فرنگی محل کے اس خاندان کو استاد الہند علامہ نظام الدین محمد فرنگی محلی بانئ درس نظامی کی وجہ سے خصوصی شہرت ملی، علوم دینیہ کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کے مقرر کردہ نصاب درس کو برصغیر کی علمی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، وہ میزبان رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی بابرکت نسل سے تھے، اسی تعلق سے وہ انصاری کہے جاتے تھے، اس نسبت مبارکہ کی خصوصیت اس خاندان کے سبھی افراد میں جاری رہی، اور احترام کی حامل رہی۔

فرنگی محل دراصل اس حویلی کا نام تھا، جس میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں کوئی اہم فرنگی رہا تھا، اس کے نام سے حویلی منسوب تھی، اور خالی تھی وہ بادشاہ نے حضرت ملا نظام الدین کے والد مکرم مولانا قطب الدین سہالوی کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے ان کو قیام کے لیے پیش کی تھی، جو اسی سابقہ نام سے موسوم ہوتی رہی، ان کے خاندان کی بعد میں بھی اسی میں سکونت رہی، اور ان میں ممتاز اہل علم افراد پیدا ہوتے رہے، اور کئی خاندان میں علم کا چرچا رہا، اور شہرت دور دور تک پہونچی، اس طرح اس کے فرنگی محل نام کے ساتھ علم

کی خدمت کی درخشاں تاریخ جڑ گئی۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ ایک تحریر میں فرماتے ہیں،

''علامہ نظام الدین محمد فرنگی محلی نے اسلامی علوم ومعارف کی حفاظت واشاعت کی خاطر اسلامی مدارس کے لیے ایک نصاب درس ترتیب دیا، جس کا نام درس نظامی مشہور ہوا، اس نصاب کو دنیائے اسلام کے تمام مکاتب فکر کے مدرسوں نے اپنایا، اور تین سو برس سے زائد مدت گزر جانے کے بعد آج بھی برصغیر ہندو پاک، بنگلہ دیش اور عالم عرب کے متعدد مدارس میں داخل ہے، علامہ شبلی نعمانیؒ کے بہ قول ''درس نظامی ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اسی درس کی شاخیں ہیں''۔

علمائے فرنگی محل نے مختلف اسلامی علوم وفنون پر پانچ سو سے زائد کتابیں تحریر کیں، ان کا یہ تحریری سرمایہ اسلام کے کتب خانے کی امتیازی شان ہے، یہی وجہ ہے کہ برس ہا برس گزر جانے کے بعد بھی ان کے علمی مآثر پر تحقیق وتخریج کا کام نہ صرف برصغیر میں بلکہ عالم عرب کی متعدد یونی ورسٹیوں اور دانش گاہوں میں جاری ہے۔

ان علمائے کرام میں استاد الہند علامہ نظام الدین محمد فرنگی محلیؒ بانی درس نظامی، ملک العلماء علامہ عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلیؒ، فخر المتأخرین علامہ ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلیؒ، شمس العلماء مولانا عبدالمجید فرنگی محلیؒ، مولانا قیام الدین محمد عبدالباری فرنگی محلیؒ، مولانا عبدالرشید فرنگی محلیؒ، اور قریبی عہد میں مولانا مفتی محمد رضا انصاری، مولانا ہاشم میاں مولانا ناصر میاں، مولانا فاخر میاں، مولانا مفتی ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ مشہور ہوئے۔

بانی درس نظامی کی چھٹی پشت میں مولانا عبدالرشید فرنگی محلی کے ہاں ۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلی کی ولادت ہوئی، جو میرا بھی سن پیدائش ہے، انہوں نے تسمیہ خوانی کے بعد ابتدائی تعلیم کی تحصیل پھر درس نظامی کی تکمیل فرنگی محل میں کی، بی ایس سی لکھنؤ یونی ورسٹی سے پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اسلامیات میں ایم اے

کیا، ۱۹۴۷ء میں عیدگاہ عیش باغ کے امام اور متولی مقرر کئے گئے، اس وقت ان کی عمر محض ۱۸ برس تھی، اس کم عمری کے باوجود انہوں نے عیدگاہ کی امامت وتولیت کے فرائض نہایت سنجیدگی سے انجام دیئے۔

مولانا فرنگی محلی مرکزی چاند کمیٹی لکھنؤ کے صدر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن اساسی، اسلامک سنٹر آف انڈیا فرنگی محل کے صدر اور متعدد علمی اور ملی تنظیموں اور اداروں کے سرپرست تھے، انہوں نے برسوں رؤیت ہلال کا اعلان کیا، ان کے اعلان کو اس دور کے چوٹی کے علماء کرام مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور دیگر حضرات بڑی اہمیت دیتے تھے، اور اسے تسلیم کرتے تھے۔

لکھنؤ شہر ہی میں ندوۃ العلماء کے ہونے کی بناء پر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کا بھی ربط فرنگی محل کے علماء سے رہا ہے، مولانا طیب میاں سے یہ ربط مزید قریبی ہوا، انہوں نے اپنے دو صاحبزادوں کو ندوہ میں تعلیم دلوائی، اس تعلق سے ان سے ملنا اور مختلف معاملات میں تعاون رہتا تھا، اور خاص ہم آہنگی تھی، جس کو ان کے صاحبزادگان کے ذریعہ مزید تقویت حاصل ہوئی، ان کے صاحبزادگان نے اپنے والد معظم کی سرپرستی میں فرنگی محل کے تعلیمی ماضی کا احیاء کرنے کے لیے ایک مستقل ادارہ قائم کیا، جو ملی خدمات کے ساتھ تعلیمی عمل بھی جاری رکھے ہوئے ہے، مولانا کے صاحبزادگان میں مولوی خالد رشید صاحب ندوی اس سلسلہ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحت کی کمزوری کے موقع پر عیدگاہ کی امامت نائب امام کی حیثیت سے کرتے تھے، اور اب باقاعدہ امام کی حیثیت حاصل ہے، بڑے صاحبزادے مولوی طارق رشید صاحب بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے، اور امریکہ میں رہ کر اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہونچا رہے ہیں، دوسرے صاحبزادے ہیں، نعیم احمد اور ندیم احمد، اللہ ان سب کو اپنی حفظ و

امان میں رکھے۔

مولانا احمد میاںؒ مرنجاں مرنج، وضع دار، بذلہ سنج تھے، کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے، ضرورت مندوں اور بے کسوں کی امداد خوب کرتے تھے، مہمان نواز تھے، نمازوں اور معمولات کے پابند اور خوش اخلاق تھے، حلقہ ارادت وعقیدت کے لیے وقت فارغ کرتے، اور نماز کی خاص طور پر خوب تاکید فرماتے، اور بعد نماز فجر اور مغرب مخصوص اوراد و وظائف کا خاص اہتمام کرتے تھے، اپنے تمام متعلقین کو احکام الٰہی اور سنت نبوی ﷺ پر چلنے کی تلقین کرتے تھے۔

مولانا احمد میاں کو اہلیہ کی وفات کا صدمہ بھی اٹھانا پڑا، جن کا تعلق مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کے خاندان سے تھا، لیکن اس صدمہ کو انہوں نے نہایت صبر و استقامت سے برداشت کیا، وہ خود عرصہ سے عارضہ قلب سے دوچار تھے، اور جو احتیاطیں تھیں وہ کرتے تھے، البتہ دینی وملی پروگراموں کی سرپرستی فرمانے سے گریز نہ کرتے، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے لکھنؤ اجلاس کو بھی ان کی سرپرستی حاصل رہی، اور انتقال سے چند ماہ قبل علمائے فرنگی محل سے متعلق فقہ اکیڈمی انڈیا کے تعاون سے عیدگاہ لکھنؤ میں منعقد سیمنار میں بھی پوری شرکت فرمائی، اس طرح دین کو تقویت پہونچانے والے کام انجام دیتے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوئے، اور ان کا سانحہ وفات ۲۴ ستمبر ۲۰۱۱ء مطابق ۲۵ شوال ۱۴۳۲ھ کو فرنگی محل میں پیش آیا، اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی، مولانا مرحوم کے نہ رہنے سے لکھنؤ کی مؤقر شخصیتوں میں کی ایک بہت اہم شخصیت کے نہ رہنے سے ایک خلاء پیدا ہوا، جس کو سب اہل تعلق محسوس کرتے ہیں۔

(۹) اہل خاندان

(۱) مولانا عزیز الرحمٰن حسنیؒ
(۲) مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ
(۳) والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ
(۴) محترمہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی)
(۵) برادر عزیز محمد میاںؒ
(۶) برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ
(۷) ممانی صاحبہؒ (اہلیہ محترمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ)
(۸) سیدہ حمیرا بی
(۹) سیدہ رقیہ بیؒ
(۱۰) والدہ ماجدہ سیدہ امۃ العزیز صاحبہؒ
(۱۱) اہلیہ مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ
(۱۲) سیدہ فاطمہؒ بی
(۱۳) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
(۱۴) مولانا قاری رشید الحسنؒ الحسینیؒ
(۱۵) مولانا سید محمد طاہر منصور پوریؒ
(۱۶) مولانا سید ابوبکر حسنیؒ
(۱۷) سیدہ امامہ عسنی
(۱۸) مولانا سید محمد اسحاق حسینیؒ
(۱۹) سید حسین حسنیؒ
(۲۰) مولانا سید محمد عامر حسینی ہنسوی
(۲۱) مولوی سید محمد سالم حسینی ہنسویؒ

مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ

مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی دائرہ حضرت شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں مقیم ہمارے حسنی خاندان کے ایک بڑے قابل قدر اور ہمدرد طبیعت رکھنے والے فرد تھے، وہ عالم دین ہونے کے ساتھ شریعت کی پابندی اور حسن سیرت وحسن اخلاق کے اختیار کرنے کی طرف خاندان کے سب اہل تعلق کو متوجہ کرنے والے اور اپنے بعد کی نسل کی ابتدائی تعلیم کی ذمہ داری انجام دینے کا بڑا ذوق رکھنے والے تھے، چنانچہ ان کے بعد کی دونسلوں کے اکثر افراد نے ابتدائی تعلیم ان سے حاصل اور انھوں نے یہ تعلیم محض اپنے جذبۂ ہمدردی اور خاندان کی بہتری اور ترقی کی فکر میں انجام دی، جس میں انھوں نے ایک ہمدرد اور معلم کا طریقۂ کار اختیار کیا، اور جہاں سختی کی ضرورت تھی وہاں سختی اختیار کرتے اور جہاں محبت ونرمی کی ضرورت محسوس کرتے وہاں اسے اختیار کرتے' ان کی اس خدمت سے ان کی تعلیم وتربیت میں رہنے والوں نے بہت کچھ سیکھا اور فائدہ اٹھایا۔

وہ میری والدہ اور میرے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بھی استاد رہے، اور ایسے استاد جو تعلیم کے ساتھ تربیت کی بھی فکر کرتے تھے، اور ہم بھائیوں کو ان کی تعلیم کے دوران میں ان کی سختی میں ہمدردی، خیر خواہی کا جذبہ اور ان کی نرمی میں محبت وشفقت کا اثر برابر محسوس ہوا۔ ہماری والدہ صاحبہ جن کی تعلیم کا زمانہ ظاہر ہے کہ میری نظر میں نہیں ہے لیکن ان سے میں نے جو تذکرہ سنا اس سے بھی اندازہ ہوا کہ انہوں نے بڑے ہمدرد معلم کی حیثیت سے ان کو بھی ابتدائی تعلیم دی، تعلیم وتربیت کے ان کے جذبے کا نتیجہ تھا کہ ان کے بعد والی نسل سے جو وطن میں مقیم تھی ان سے فائدہ اٹھایا، ان کی ہمدردی اور فکرمندی خاندان کے سبھی افراد کے ساتھ تھیں اور ان کی فکر وتوجہ سے سب حسن کردار، عملی لحاظ سے چاق وچوبند اور مستقبل کی تعمیر کی صحیح فکر رکھنے والے بنے، رشتہ داری وہ قریبی رشتہ میں مولانا علی میاں ندوی کے اور میری والدہ

کے چچا تھے، ایسے چچا تھے کہ ان دونوں کے والد مولانا سید عبدالحی حسنی جن کے وہ پھوپی زاد بھائی تھے، اپنے سے بہت قریب محسوس کرتے تھے، اور ان سے وہ اپنے کاموں میں تعاون بھی لیتے تھے، اور وہ مولانا عبدالحی حسنی کو جو ان سے عمر میں بڑے تھے، محبت اور احساسِ تعلق کے ساتھ اپنا تعاون دیتے تھے، ان کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کتب خانے کے ذمہ دار کی حیثیت سے تعلق ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے ان کو مولانا عبدالحی حسنی سے قریب رہنے کا موقع بھی ملا، یہی تعلق تھا کہ جس کی بنا پر ان کو مولانا عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کی ترقی اور لیاقت کی فکر رہتی تھی جو تاحیات قائم رہی، اور یہ ان کے چھوٹے بھی محسوس کرتے تھے، اور ان کا لائق احترام کرتے تھے، ان کی اولاد میں ایک فرزند اور تین صاحبزادیاں تھیں۔ فرزند مولانا سید ابوبکر حسنی جو خال معظم حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے تقریباً ہم عمر تھے، اور اس کی بنا پر دونوں کے تعلیمی دور میں دونوں کی بڑی رفاقت رہی، اور مولانا سید ابوبکر حسنی میں خاص طور پر ان کے والد کی خوبیاں منتقل ہوئیں، اور انھوں نے اپنے والد کے ورثے میں خاندان کی بہبودی اور ترقی اور دین داری کا جذبہ ورثے میں پایا، اور قارئین ان کو عام طور پر جانتے ہوں گے، اس لیے اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں (۱)۔ تین صاحبزادیاں سیدہ صفیہ، سیدہ رضیہ اور سیدہ ولیہ ہوئیں۔ سیدہ صفیہ کا عقد سید محمد ثاقب کانپوری مرحوم سے ہوا جو ملت کی فلاح و بہبود کی فکر رکھنے والے معروف شاعر تھے سیدہ رضیہ کا عقد میرے حقیقی پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ حسنی مرحوم سے ہوا جن کے ایک داماد مولانا سید محمد الحسنی مرحوم اور دوسرے سید ابوطاہر حسینی ہسوی ہوئے، تیسری صاحبزادی سیدہ ولیہ کا عقد ہمارے والدہ پھوپھی زاد بھائی ماموسید محمد یامین حسنی سے ہوا جن کے بیٹے مولوی سید محمد خالد حسنی ندوی ہیں۔

مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی میں صلاح وتقویٰ اور دینداری کا خاص طور پر بہت اہتمام تھا، اور انھوں نے اسی خصوصیت کی بنا پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ علیہ سے بیعت واسترشاد کا تعلق قائم کر لیا تھا، اور وقفہ وقفہ سے وہ برابر ان کی خدمت میں جا کر استفادہ کرتے تھے، اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ان کا خصوصی لحاظ رکھتے تھے،

یہ تعلق ان سے منتقل ہوکر مولانا ابوبکر حسنی صاحب میں بھی آیا تھا، اور وہ سلسلہ قائم رہا، نمازوں کا اہتمام اور مسجد کے معاملات کی فکر اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی، اور دوسروں کو اس کی طرف توجہ دلاتے تھے، وطن دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد کے وہ رضا کارانہ منتظم بن گئے تھے، جماعت کا اہتمام، امامت اور نمازیوں کی راحت کی فکر رکھتے تھے، اور اس کے لیے انھوں نے خود سے نمازیوں کو راحت پہنچانے سے خصوصی انتظامات کیے، رمضان کے مہینے میں ان کا اہتمام بڑھ جاتا تھا، اعتکاف کرتے تھے، جب کہ آبادی کی کمی کی وجہ سے نمازیوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی اور اعتکاف کرنے والوں کی تعداد اور بھی کم تھی، وہ بڑے غیرت مند اور بلند ہمت شخص تھے، حالات کے نشیب وفراز سے بددل نہیں ہوئے،

ہندوستان میں آزادی کے قریب اور آزادی کے متصلاً بعد مسلمانوں کے معاملے میں حالات کی جو سختی پیدا ہوئی اس کا اثر ایسے شرفاء پر بہت پڑا، جن کا سلسلہ ذمہ داری کا رہا تھا، تو مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کو بھی اس سے سابقہ پڑا، غیرت مندی اور حمیت کے ساتھ انھوں نے اس کا مقابلہ کیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے صاحبزادے کے ایک باوقار منصب کے حاصل کرنے کے بعد ان کو اس کا صلہ کسی حد تک حاصل ہوا۔

انھوں نے اپنی فکرمندی اور سب اہل تعلق کی بہبودی کا جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا، اسی کی وجہ سے پورے خاندان میں سب کے ہمدرد اور خاندان کے ذمہ دار ہونے کا مقام حاصل ہوگیا تھا، وہ اپنے بڑوں میں سے دو بڑوں کی بہت قدردانی واحترام کے ساتھ ذکر کرتے تھے: ایک اپنے ماموں زاد بھائی مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور دوسرے خالہ زاد بھائی سید خلیل الدین احمد حسنی جو میرے دادا تھے وہ ان کے حسن عمل، معاملہ فہمی اور صلاح وخوبی کا ذکر بہت اہتمام سے کرتے تھے اور ان دونوں کو انسانی خوبیوں کے لحاظ سے معیار اور نمونہ قرار دیتے تھے، اور اپنے چھوٹوں کو نصیحت کرنے میں ان کا حوالہ دیتے تھے، مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب کی اہلیہ یعنی مولانا ابوبکر صاحب کی والدہ ہسوہ فتح پور کے حسینی واسطی سادات کے ایک عالم باعمل فرد مولانا شاہ ابوالقاسم (متوفی ۱۳۲۹ھ) خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی

صاحب زادی اور میرے والد کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں، اس رشتے سے وہ میرے پھوپھا ہوتے تھے، اور مولانا عبدالحی حسنی کے تعلق سے میری والدہ اور میرے ماموں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے چچا ہوتے تھے، ان رشتوں کے قرب کی وجہ سے میرے بھائیوں کے ساتھ ان کا بڑا مشفقانہ تعلق تھا، اور ہم لوگوں کی کسی بھی قابل گرفت بات کو وہ نظر انداز نہیں کرتے تھے، بلکہ تنبیہ کرتے تھے، اور یہ سلسلہ انھوں نے آخر تک قائم رکھا، اس سے ہم کو اور ہماری نسل کے افراد کو بلکہ ہمارے بڑوں یعنی والدہ اور ماموں وغیرہ کو ان کی فکر سے فائدہ پہنچا، اور یہ سب ان کا عمل ان کی دینداری اور نیک جذبے کی بنا پر تھا، اس کا صلہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت ملنے کی امید ہے، بلکہ صلہ رحمی اور خیر طلبی اور سب کی بہبودی اللہ تعالیٰ کے بہت قبولیت کا درجہ رکھتی ہے، ان کی شخصیت بڑی باوقار اور قابل عزت واحترام تھی۔

اور اسی کے ساتھ ساتھ دنیاوی معاملات اور دینی معاملات میں ان کو بڑی سمجھ اور دور اندیشی کی خصوصیت حاصل تھی، ان کے انتقال کو بھی خاندان کا ایک بڑا خسارہ سمجھا گیا ان کے سانحۂ ارتحال ۱۹۵۸ء کو رائے بریلی میں پیش آیا اور تدفین ان کی خواہش کے مطابق مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے قریب اس احاطہ میں ہوئی جس میں حضرت شاہ علم اللہ ان کی اہلیہ صاحبزادے اور عالی مرتب پوتے حضرت شاہ محمد عدل بھی آرام فرما ہیں ان کا سانحۂ وفات ایسے وقت پیش آیا جب کہ اس پہلے قریبی مدت میں ایک ہی خاندان کے متعدد لوگ دنیا سے رخصت ہوئے جن میں ہماری بڑی ممانی صاحبہ اہلیہ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور ان کی بہن اہلیہ مولانا عزیز الرحمٰن حسنی اور ان کے بھائی سید احمد میاں وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور اس خاندان کے مرشد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا حادثۂ وفات بھی ہے اس لئے پے در پے ان صدمات نے پورے خاندان کو بہت متاثر کیا اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کی خوبیوں کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا کرے اور ان سب کو اور مولانا عزیز الرحمٰن حسنی کی صاحبزادے اور صاحبزادیوں کو بھی کہ وہ بھی اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے ہیں اپنا قرب خاص عطا فرمائے۔

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ

۷ رمئی ۱۹۶۱ء کو ہمارے مختصر خاندان کے لیے وہ حادثہ پیش آیا جس نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، یہ ہمارے بڑے ماموں مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کا سانحۂ وفات تھا، اس کا اثر اس لیے بھی زیادہ ہوا کہ ان کی وفات کے وقت ان کے چھوٹے بھائی خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سفر پر تھے تدفین کے مرحلہ کے بعد سفر سے واپس ہوئے، اللہ تعالیٰ اس خلا کو جوان کی وفات سے ہوا ہے پُر فرمائے اور ان کی مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عصر حاضر کی ایک ایسی جامع شخصیت تھی جس نے دین و دنیا کو بہت متوازن طریقہ سے جمع کیا اور دونوں علوم میں دمہارت حاصل کی، دینی علوم انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں، پھر دارالعلوم دیوبند میں حاصل کئے، اور ان کی تکمیل کے ساتھ طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی، پھر عصری تعلیم کی طرف توجہ کی، اور سائنس میں بی ایس سی (B.S.C) تک، پھر میڈیکل تعلیم ایم بی بی ایس (M.B.B.S) تک حاصل کی، اور اس دنیاوی تعلیم میں بھی وہ پوری مدت اپنی اسی وضع قطع اور دینی کردار پر قائم رہے، جو دینی تعلیم حاصل کرنے والے کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے، اسی کے ساتھ وہ تحصیل علم کے دوران طالب علمانہ انضباط و نظم وضبط کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کا طریقہ سال کے تمام دنوں میں یکساں محنت کرنے کا رہتا تھا، چنانچہ امتحان کے زمانہ میں ان کو تیاری کرنے کے لیے عام دنوں کے وقت سے زیادہ صرف نہیں کرنا پڑتا تھا، اور وہ اس کے قائل بھی نہ تھے کہ دوران سال تعلیمی محنت کم کی جائے، پھر اس کی تلافی امتحان کے زمانہ میں کی جائے، ان کا طریقہ تعلیمی مشغولیت کو رات میں زیادہ حصہ دینے کا بھی نہیں

تھا، وہ دن کو ضرورت کے مطابق علم کی مشغولیت میں گذارتے، اور رات میں جسم کو اس کی ضرورت کے مطابق راحت دینے کے قائل تھے، رات کو زیادہ بیداری میں گزارنا صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس کی وہ دوسروں کو بھی تاکید کرتے تھے، چنانچہ ان کا حصول علم ایک متوازن تسلسل کا حامل رہا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ امتحان کے موقع پر ان کے علم میں پختگی ظاہر ہوتی تھی، اور وہ امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کرتے تھے، ان کو بی۔ایس۔سی۔ کے امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے پر تمغۂ امتیاز بھی ملا تھا، اور جب انھوں نے ایم بی بی ایس کر کے علاج و معالجہ شروع کیا تو طبی کام میں ان کی مہارت ظاہر ہوئی، اور ان کی تشخیص و علاج کا لوگوں کو بہت اچھا تجربہ ہوا۔

تحصیل علم میں علوم کا تنوع اور جامعیت ان میں بڑے اچھے انداز میں آئی کہ اولاً علوم دینیہ کی تکمیل اور اس کے ساتھ طب یونانی کی تعلیم، پھر علوم عصریہ کی تعلیم اور سائنس میں بی ایس سی، پھر میڈیکل تعلیم اور اس کی تکمیل، اس طرح انھوں نے علوم کے مختلف انواع جمع کر لیے، پھر عملی طور پر ان سب علوم سے فائدہ اٹھایا، اور فائدہ پہونچایا، یہ ایک بہت کم واقع ہونے والی بات ہے، اور اس میں یہ اضافہ کہ ایلوپیتھک علاج میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ہومیوپیتھک کا بھی مطالعہ کر کے اس کے علاج کو بھی اپنایا، چنانچہ وہ مریضوں کے لیے دوا تجویز کرنے میں تینوں طریقۂ علاج پر نظر رکھتے تھے، اور ایلوپیتھک علاج کرتے ہوئے وقتاً فوقتاً دیگر طریقۂ علاج کی ضرورت محسوس کرنے پر اس کی دوا بھی تجویز کرتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے جو تنوع طالب علمی میں حاصل کیا اس کی وجہ سے ان کی تعلیم کی تکمیل ذرا دیر میں ہوئی، تکمیل تعلیم سے ذرا قبل ان کے والد کا انتقال ہو گیا، یہ ۱۹۲۳ء کی بات ہے جب کہ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت ۲۹/۳۰ تھی، اور ابھی وہ ایم بی بی ایس سے فراغت کے مرحلہ کو نہیں پہنچے تھے، اس لیے ان کے سامنے زندگی کے اقتصادی تقاضے کا مسئلہ آ گیا، ایک طرف چھوٹا بھائی جس کی عمر صرف نو سال کی، دوسری طرف والد

صاحب کا اقتصادی ذریعہ منقطع ہوجانا، اور کوئی دوسرا قابل ذکر ذریعہ نہ ہونا، ایسی صورت میں ڈاکٹر صاحب نے شریفانہ وضع داری پوری قائم رکھتے ہوئے حکمت سے کام لیا، اور تعلیم سے جلد فراغت کر کے اقتصادی ذریعہ اختیار کرنے کی طرف توجہ دی، اور اس کو انھوں نے خوبی کے ساتھ کیا، یہ سب ایسے متوازن اور باوقار انداز میں تھا کہ جلد ہی وہ نیک نامی جوان کے والد کو حاصل تھی ان کو بھی حاصل ہوگئی۔

اللہ کی طرف سے ان کو دست شفاء بھی حاصل ہوا کہ عام طور پر ان کی تشخیص برحق اور علاج کو کارگر سمجھا جانے لگا، اور مشکل امراض میں بھی ان کی تجویز کو بہتر پایا جاتا تھا، اور بتدریج ان کو نہ صرف علاج والے حلقوں میں بلکہ اہل شہر میں، اور خود ان کے خاندان میں بڑی عزت وقدر سے دیکھا جانے لگا، ندوۃ العلماء کی وہ سربراہی جو بطور ناظم ان کے والد کو حاصل ہوئی تھی وہ بھی ان کے سپرد ہوئی۔

کردار وصفات کے لحاظ سے ان میں شائستگی، حسن اخلاق، کم گوئی، توجہ و ہمدردی کی صفات تھیں، اور ظاہر و باطن دونوں ایک متدین عالم دین کا تھا، مغربی تہذیب وتمدن کی کمزوریوں اور فائدوں سے وہ واقفیت رکھتے تھے، لیکن اس میں احتیاط اور کھلے ذہن کا رویہ رکھتے تھے، اس کی علمی ترقی وافادیت سے فائدہ اٹھاتے، لیکن اس کی تہذیبی کمزوریوں سے اپنے دامن کو صاف اور بے داغ رکھتے تھے اور اس کے سامنے کسی طرح کی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے، وہ زندگی کے ہر مسئلہ میں شریعت کے حکم کو دیکھتے اور مسلمانوں کے معاملات سے دنیا میں جہاں بھی ہوں دلچسپی رکھتے تھے، اور ان کے حالات سے واقف ہونے کی کوشش کرتے، اور ان کی خیر خواہی کی کوئی شکل قابل عمل ہوتی تو کرتے، چنانچہ حرمین شریفین میں قائم دینی مدرسوں کو مالی مدد بھجوانا، فلسطین اور الجزائر میں دشمنان اسلام سے گلو خلاصی کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان سے ہمدردی کا اظہار، اور ہندوستان میں اصلاح ودعوت کا جو کام انجام پا رہا تھا اس کی حمایت کرنا اور اظہار قدردانی کرنا، یہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اہم خصوصیات میں تھا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، انھوں نے نصاب تعلیم میں بعض ایسی اصلاحات بھی کرائیں جو وسعت علمی اور حسن کردار کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تھیں، اور ندوۃ العلماء کے مقاصد کے مطابق تھیں۔

عربی زبان کی مروجہ تعلیم کے سلسلے میں ان کا ایک خیال یہ تھا کہ اس کی تعلیم میں الفاظ وعبارت اور اس کے قواعد کے درمیان مناسبت اور ترتیب موزوں نہیں رکھی جاتی ہے، اور اس میں طالب علم کی نفسیات اور استفادہ وحصول کی فطری صلاحیت کی رعایت نہیں کی جاتی، اور اس کے اولین مرحلہ میں ہی قواعد کا بھاری بوجھ ڈال دیا جاتا ہے جس کی بنا پر عربی کا طالب علم پریشانی اور اکتاہٹ میں پڑ جاتا ہے، اور متعدد طلبہ ہمت ہار کر شروع کے مرحلہ میں ہی عربی تعلیم سے منہ موڑ لیتے ہیں، ان کے نزدیک زبان کی عبارت کو مقدم ہونا چاہئے، اور قواعد کو ذرا تاخیر سے اور قابل برداشت حد تک رکھنا چاہئے، انھوں نے اپنے اس اصول کو ندوہ ہی پر لازم نہیں کیا، بلکہ خود اپنے صاحبزادے پر اس کو عمل میں لائے، اور اس کے فائدہ کی مثال سب نے یہ دیکھی کہ عربی دانی اور عربی مضمون نگاری وترجمہ میں ان کے صاحبزادے مولانا محمد الحسنی کم عمری ہی سے اتنے فائق ہوئے کہ ان کے زمانہ میں برصغیر میں ان جیسے عربی میں اہل قلم بہت گنے چنے ہوئے، ندوۃ العلماء کی حد تک انھوں نے نحو وصرف کی تعلیم میں تسہیل وتدریج کو لازم کیا، تاکہ طلبہ اکتائے بغیر عربی کی تعلیم حاصل کرسکیں، ان کی ان دونوں باتوں پر عمل کے نتیجے بہت اچھے ظاہر ہوئے۔ وہ فقہ کے نصاب میں بھی ایسا کرنا چاہتے تھے ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہوسکا البتہ ان کے بعد ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی نظامت میں یہ کام انجام پایا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعلیمی وتربیتی نقطۂ نظر صرف نظریاتی نہ تھا، بلکہ عملی طور پر اس کو انھوں نے جاری کیا، اس پر عمل خود اپنے گھر سے کیا، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ اپنے اکلوتے صاحبزادے پر اس کا اجراء کیا۔ خود ان کو تعلیم دی اور بعض کتابیں گھر پر ہی اپنی نگرانی میں بعض اساتذہ سے پڑھوائیں اور حدیث کی اونچی کتابوں کی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ

العلماء بھیجا۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک نقطۂ نظر یہ تھا کہ تعلیم کے معاملہ میں اصل مقصد استعداد کا پیدا کرنا اور حصول علم ہے، وہ کہتے تھے کہ مرحلۂ تعلیم کے اختتام پر حصول سند کی اہمیت جتنی ہوگئی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اصل زور استعداد بنانے پر دینا چاہئے، ان کا یہ خیال اس حد تک قوی تھا کہ خود اپنے بیٹے کے لیے انہوں نے درجات میں نام لکھا کر پڑھنے کو اہمیت نہیں دی، بلکہ مختلف فنون مختلف اساتذہ سے پڑھوانے اور صرف پڑھنے کو کافی سمجھا، چنانچہ ان کے صاحبزادہ کو کوئی سند حاصل نہیں ہوئی لیکن علمی استعداد پختہ تھی، اور علمی وادبی کارکردگی میں اتنی فوقیت حاصل ہوئی کہ ہندوستان سے لے کر ممالک عربیہ کے حلقوں میں بھی ان کی تحریری وفکری صلاحیت کی قدر کی جاتی تھی، اور وہ حضرت مولانا علی میاں ندوی کے علمی و ادبی مقام میں جانشیں کی حیثیت حاصل کر لینے کے راستہ پر آ گئے تھے۔

خود مولانا علی میاں بھی جو کہ ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، لیکن عمر میں تقریباً ۲۲ سال کا فرق تھا، والد کے انتقال پر مولانا علی میاں صرف نو سال کے تھے، اور تعلیم وتربیت کے آغاز میں تھے، والد کے انتقال پر یہ بڑے بھائی ان کے لیے والد کے قائم مقام ہوگئے تھے، یہ قائم مقامی ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھی کی، اور مولانا علی میاں کو ایک کامیاب طالب دین اور ممتاز صلاحیت کا حامل فرد بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی، اور اس کا مولانا علی میاںؒ کی عظیم شخصیت بننے میں ایک قابل قدر حصہ ہے جس کا اعتراف خود مولانا علی میاں کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کا دور نظامت ندوہ کے لیے ملک کے مشکل حالات میں تھا، آزادئ ملک کی جدوجہد، پھر ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات اور تبادلۂ آبادی جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں میں اہل علم وصلاحیت افراد کی ایک بڑی تعداد کا ترک وطن، نیز وسائل ومال کی کمی، یہ وہ معاملات تھے جن سے علمی اداروں کے بقاء کے لیے خطرات پیدا ہوگئے تھے، لیکن الحمدللہ باعزیمت افراد نے ہمت نہیں ہاری، بلکہ

حکمت و برداشت کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں پر قائم رہے، حتی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد آئی، اور یہ ادارے قائم رہے، بلکہ بتدریج ان کے لیے نئی راہیں کھلیں، اس سلسلہ میں اداروں کے ذمہ داروں کی کوششیں قابل داد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے دور نظامت کی ان مشکلات میں اپنے رفقاء کے ساتھ کوشاں رہے، اور بے ہمت نہیں ہوئے، اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری کو اس کے وقار کے ساتھ پورا کیا۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ عصر جدید کی ترقیات اور علمی تحقیقات سے واقف تھے، اور دینی علوم کی باقاعدہ تحصیل کی بناء پر اسلامی تقاضوں اور دینی تربیت و دعوت کی ذمہ داری بھی سمجھتے تھے اس لیے ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ دینی و دنیاوی دونوں تعلیم و نصاب تعلیم کے مفید عناصر کو یکجا کرنا امت کی نئی نسلوں کی تربیت کے لیے ضروری ہے، ڈاکٹر صاحب اور ان سے متفق الرائے ان کے رفقاء کے اس خیال کا اثر خود ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کی تشکیل میں ملتا ہے، چنانچہ انہوں نے جن افراد کی تعلیم کی پوری ذمہ داری ان پر تھی ان کے نظام تعلیم میں جدید و قدیم دونوں طریقوں کو اپنایا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ بھی تھا کہ مضامین تعلیم بیک وقت بکثرت نہ ہونے چاہئیں، ان کی کثرت سے طالب علم کی تعلیمی یکسوئی متاثر ہوتی ہے، ممکنہ حد تک یکے بعد دیگرے ہونا چاہئے، چنانچہ انہوں نے اسی کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ ان کے تعلیمی سلسلہ میں معاملہ کیا، پھر اپنے صاحبزادہ مولانا سید محمد الحسنی کے معاملہ میں بھی یہی کیا، اور یہ مفید ثابت ہوا، دونوں کی علمی صلاحیتوں میں اس طریقۂ تعلیم کی افادیت دیکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ اپنی ڈاکٹری پریکٹس کی مشغولیت کی وجہ سے دوسری مشغولیتوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوسکتے تھے، لیکن پھر بھی ان کا مطالعہ دونوں اقسام علم یعنی علوم اسلامیہ اور علوم دنیویہ میں برابر جاری رہتا تھا، اور وہ اس کے ذریعہ جدید حالات میں امت مسلمہ کے صلاح و فلاح کی تدابیر کو سمجھنے میں مدد لیتے تھے، اور اپنے تعلق والوں کو اس کے مطابق مشورے بھی دیتے تھے، اس کی مثال یہ ہے کہ مسلمانوں میں اصلاح و ارشاد کے کام

کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے عہد کی دعوت وتبلیغ کی کوشش جو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جاری کی تھی وہ ان کی نظر میں بہت برمحل اور مفید تھی، وہ اس کی حمایت کرتے تھے، اور لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے تھے، اور اسی کے ساتھ علمی میدان میں ایسا لٹریچر تیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے جس کے ذریعہ مسلمانوں اور خاص طور پر نئی نسل کو اسلامی فکر و کردار کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے، اسی کے ساتھ وہ عہد حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان علمی موضوعات کو شامل نصاب کرنے پر زور دیتے تھے جن سے موجودہ حالات میں مسلمانوں کو واسطہ پڑسکتا ہے، مثلاً تاریخ، جغرافیہ اور تمدنی واجتماعی مضامین، اسی کے ساتھ وہ مروجہ زبانوں کو بھی اہمیت دیتے تھے، انہوں نے خود بھی حسب موقع اس میں حصہ لیا، چنانچہ عالم اسلام کے جغرافیہ پر خود ایک کتاب تیار کی، پھر اپنے بھانجے راقم السطور کو جس نے کو ان ہی کی تربیت ونگرانی میں تعلیم حاصل کی عالم اسلام کے جغرافیہ پر ایک ایسی کتاب تیار کرنے کی تلقین کی، جس میں صرف مقامات کا جغرافی تعارف نہ ہو، بلکہ اس میں سیرت نبوی اور ثقافت اسلامی کے سمجھنے میں جن باتوں سے مدد مل سکتی ہو ان کو بھی نمایاں کیا جائے، چنانچہ اس پر کتاب جغرافیہ ممالک عربیہ کا حصہ اول (جزیرۃ العرب) ان کی زندگی ہی میں تیار کیا گیا، جس کو انہوں نے دیکھا اور قیمتی مشورے دیئے، جو اس میں شامل کئے گئے۔

ڈاکٹر صاحب کو امت مسلمہ کے ان عناصر کے سلسلہ میں بھی جو دنیا کے دور دراز حصوں پر بسے ہوئے ہیں حالات جاننے اور یہ کہ ان سے کیا ہمدردی کی جاسکتی ہے، اور ان کی رہنمائی اور اخلاقی مدد کیا کی جاسکتی ہے، اس کا برابر خیال رہتا تھا، انہوں نے بین الاقوامی ڈائرکٹری (اسٹیٹس مین ایر بک) منگوا کر اس میں مختلف ملکوں کے حالات دیکھے، اور ان سے فائدہ اٹھایا، اور اس کے بعض مقامات پر نوٹ بھی چڑھایا، اس کی مثال یہ ہے کہ نیپال کے تذکرہ کے صفحات کے حاشیہ پر وہاں کے مسلمانوں کے متعلق اپنی وہ معلومات بھی درج کردیں جو ان کو نیپال کے ایک عالم کے ذریعہ جنہوں نے ندوہ میں تعلیم حاصل کی تھی، معلوم ہوئی

تھیں۔ وہ آزادیٔ فلسطین کی کوششوں سے دلچسپی لیتے تھے، اور وسط ایشیا کے ممالک میں بسے ہوئے مسلمانوں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مرکز اسلام حجاز کے معاملات سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے، شاہ ابن سعود نے جب اپنی انقلابی کوشش سے حجاز پر اقتدار حاصل کیا تھا اس کے معاً بعد ڈاکٹر صاحب کو حج کا موقع ملا تھا، وہ وہاں شاہ ابن سعود سے بھی ملے، اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو کچھ مفید مشورے بھی دیئے، اور جب ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پہلا حج کیا تو ڈاکٹر صاحب نے وہاں کے دینی اور اجتماعی مصالح کی تقویت کے تعلق سے ان کو ہدایات اور مشورے دیئے، پھر ۱۹۵۰ء میں جب مولانا علی میاں صاحب نے دوبارہ حجاز کا سفر کیا اور اس میں مصر و سوڈان و شام کے سفر کا بھی قصد کیا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کی اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے خصوصی رہنمائی کی اور مدد بھی کی۔ اور عالم عربی کے اس دورہ کو بہت ضروری اور مفید قرار دیا، اور اس کی تفصیلات دورہ کے دوران خط و کتابت کے ذریعہ اور دورہ کے بعد زبانی معلوم کرتے رہتے تھے، مولاناؒ کو اس سے بڑی مدد ملی، اور ان کا دورہ بہت مفید رہا۔

ڈاکٹر صاحب کو نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت اور اس کی مفید اور صحیح ذہن سازی کی طرف خصوصی توجہ تھی، اس کے لیے وہ عملی طور پر بھی جو کر سکتے تھے وہ کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے ان طبقات کے لیے جو اپنے حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع مہیا ہونے کی فکر کرتے، اور اپنے خاندان کے بچوں کے معاملہ میں تو بہت ہی فراخ دل تھے، خاندان کے جن بچوں کو لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنا ہوا، ان سب نے ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ان کے خود اپنے بچوں کی طرح تعلیم حاصل کی، اور اعزہ کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ بے تکلف آ کر قیام کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس فراخ دلی کا معاملہ خاندان سے باہر ان لوگوں کے لیے بھی تھا جو اہل دین میں شمار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی اسی خوش اخلاقی کا معاملہ رہتا تھا، چنانچہ علماء و صلحاء کی آمد بھی ہوتی، اور ان کی میزبانی بھی ہوتی، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تو ڈاکٹر صاحب کا ارادت کا تعلق بھی تھا، چنانچہ وہ لکھنؤ جب بھی تشریف لاتے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ہی قیام ہوتا، ڈاکٹر صاحب اس کو اپنے لیے عزت کی بات سمجھتے، دیگر صلحاء وعلماء کے ساتھ بھی اسی سے ملتا جلتا معاملہ رکھتے، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے جو لکھنؤ ہی میں تھے ڈاکٹر صاحب کا بہت تعلق تھا، اور مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازین میں تھے ڈاکٹر صاحب بہت دوستانہ اور مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی لکھنؤ آمد پر ڈاکٹر صاحب سے ملنے تشریف لائے، اور ڈاکٹر صاحب ان کی مجلس میں برابر جاتے تھے، مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو آخر میں اپنا معمول بنالیا تھا کہ ہر جمعہ کو آتے اور نماز ساتھ پڑھتے، پھر دوپہر کا وقت ایک ہی کمرہ میں ساتھ گذارتے، اس طرح سے ان کے ساتھ جلدی جلدی ملنا جلنا ہوتا، علاج کی ضرورت پڑتی تو ان ہی سے علاج کراتے، کوئی دیگر معاملہ ہوتو آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ لیتے ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد مولانا عبدالباری ندوی نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت تعلق خاطر کا مضمون لکھا، جس کا نام تھا: "إن هذا إلا ملك كريم"(۱)۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بڑی صفت تھی بخل اور اسراف دونوں سے پورا گریز۔ وہ اپنے تمام کاموں بلکہ اپنی تمام ضروریات میں اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ کوئی خرچ اسراف کے دائرہ میں نہ آئے، زندگی کو مناسب معیار سے قائم رکھنے میں بھی ہر طرح کے غلو سے اجتناب کرتے، اپنی اور اپنے بچوں اور گھر والوں کی ضرورتوں پر صرف اتنا ہی خرچ کرتے جتنا حد کفایت کے اندر ہوتا، لیکن مہمانوں اور اہل ضرورت کے لیے ہمدردی رکھتے اور مدد کرتے، البتہ اپنی ضروریات کے معیار کو ایسا بلند نہیں بنایا تھا کہ وہ اپنی نظر ہی میں نہیں بلکہ دوسروں کی نظر میں بھی ذرا بھی اسراف محسوس کیا جاتا، لیکن حقوق کی ادائیگی اور دینی تقاضہ پر خرچ کرنے میں فیاضی کا معاملہ تھا، دینی مقاصد کا کوئی چندہ ہو، اور اعزہ کے ساتھ صلہ رحمی کا موقع ہو، اور اہل وعیال کی واقعی ضرورتیں ہوں ان میں بلا دکھاوے اور ریاء کے صرف

کرتے، مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے مدرسوں کو چندہ بھیجتے، الجزائر کی آزادی کی کوششیں ہوں یا فلسطین میں یہود سے گلوخلاصی کی کوششیں ہوں جب بھی ضرورت دیکھی چندہ سے تعاون کیا۔ اور خود اپنی اولاد کو بھی رغبت دلائی کہ وہ بھی حسب گنجائش چندہ میں حصہ لیں۔

صلہ رحمی کا یہ حال تھا کہ جس کا رشتہ جتنا قریب ہوتا اس کی اتنی ہی زیادہ فکر کرتے، اور عمومی طور پر ہر رشتہ دار کے ساتھ کم از کم مہمان داری کا رویہ رکھتے، چنانچہ ان کا گھر تمام اہل خاندان کے لیے لکھنؤ میں ہمہ وقت ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اعزہ اپنے کام سے لکھنؤ آتے تو اپنی مرضی کے مطابق مدت قیام اختیار کرتے، اور مہمان بلکہ گھر کے افراد کی طرح رہتے، اور یہ بات خود ان کے والد ماجد مولانا عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے چلی آرہی تھی جس کو ڈاکٹر صاحب نے پوری فراخ دلی کے ساتھ قائم رکھا۔

صفائی معاملات اور احتیاط ان کے مزاج میں اعلیٰ سطح کی تھی، وہ ندوۃ العلماء کے سربراہ (ناظم) تھے، اور ان کا دفتر نظامت شہر کے اندر ان کے مکان سے متصل مکان میں تھا، وہ دفتر جاتے یا دفتر کے کاغذات ان کے پاس آتے، جن پر وہ ہدایات اور منظوری لکھتے، اس کے لیے ایک دوات اور قلم ان کے پاس گھر میں بھی تھا جس کو وہ نظامت کے کام کے لیے استعمال کرتے تھے، لیکن احتیاط یہ تھی کہ کسی دوسرے کام میں اس کو استعمال نہ کرتے، اور کسی کو اس کی اجازت بھی نہ دیتے کہ وہ اپنے ذاتی کام میں اس کو لائے، میں نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا۔ اور اسی طرح ندوۃ العلماء کے استعمالی سامان سے بھی ذاتی فائدہ اٹھانے سے بچتے تھے۔ ایک بار جب بیماری کی وجہ سے ان کو کچھ دنوں کے لیے کرسی کی ضرورت پڑی، اور وہ دارالعلوم کے مہمان خانہ کی کرسیوں میں تھی تو اس کو مستعار منگوایا، اور اگرچہ وہ ندوۃ العلماء کے مہمانوں اور اس کے ذمہ داروں کی سہولت کے لیے تھی، اور ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سربراہ ادارہ تھے، لیکن اس کو کرایہ کے سامان کی حیثیت دیتے ہوئے اس کا کرایہ ادا کیا، بلا معاوضہ اس کو استعمال میں نہیں رکھا۔

ایک بار دارالعلوم میں کسی چیز کا معائنہ کرنے آئے، اس سے واپسی کا وقت تقریباً

وہی تھا جو تعلیم کے اختتام کا تھا، میں نے ان کو واپسی کے لیے رکشا پر تنہا بیٹھے دیکھا، دار العلوم کے مہتمم صاحب پاس میں کھڑے کچھ بتا رہے تھے، مجھے خیال آیا کہ جگہ خالی ہے، مجھے بھی وہیں جانا ہے، لہٰذا میں اس سے فائدہ اٹھالوں، ان کی شفقت معلوم تھی، میں اس مقصد کے لیے قریب گیا کہ وہ خود کہیں گے کہ ساتھ چل سکتے ہو، لیکن انہوں نے خود نہیں کہا، بلکہ مہتمم صاحب کو جو سامنے کھڑے ان کو رخصت کر رہے تھے استفساری نظروں سے دیکھا، مہتمم صاحب نے فوراً کہا کہ یہ بھی بیٹھ جائیں، وجہ یہ تھی کہ سواری کا کرایہ دار العلوم کی طرف سے دیا جاتا تھا، کیونکہ وہ دار العلوم کے کام سے آئے تھے، لہٰذا کمال احتیاط میں اس خالی جگہ کو اپنے عزیز کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ خود نہیں کیا۔

اسی طرح تقریباً ایک سالہ تعلیمی مدت کے لیے دار العلوم دیوبند میں میرے پڑھنے کو طے کیا تو ہدایت کی کہ وہاں سے وظیفہ لینے کی ضرورت نہیں، میں ماہانہ صرفہ بھیجتا رہوں گا، چنانچہ ماہانہ صرفہ برابر وہ بھیجتے رہے، اور میرے کھانے کا بار وہاں کے مطبخ پر نہیں ڈالنے دیا، حالانکہ وہاں عام طریقہ تھا کہ پڑھنے والوں کو وظیفۂ طعام ملتا تھا، یہاں لکھنؤ میں بھی میں اور میرے علاوہ ان کے سب قریبی عزیز لڑکے سب ان کے گھر پر رہکر ہی ندوہ روزانہ جاتے اور تعلیم حاصل کرتے تھے، اس طرح انہوں نے اپنے عزیزوں کا بار بھی ندوہ پر ڈالنے نہیں دیا۔

زندگی کے دیگر اجتماعی معاملات میں بھی ان کا رویہ اسی طرح نیک نفسی اور ہمدردی کا تھا، اور اپنے انفرادی معاملات میں ان کا رویہ ایمان و اعتماد علی اللہ کا رہتا تھا، ایک بار محلّہ کے اندر ہی وہ ایک مریض کو دیکھ کر آئے، مجھ سے کہنے لگے کہ آج ایک خاص بات یہ پیش آئی کہ کل میں محلّہ میں ایک مریض کو دیکھنے گیا، اور اس کے مرض کو سمجھ کر اس کی جو کارآمد دوا تھی، اسے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر استعمال کرائی، اور الحمد اللہ اس سے اس کو پوری شفاء ہوئی، آج ایک دوسرا مریض بالکل اسی مرض کا پھر میرے سامنے آیا تو میں نے گذشتہ روز کے تجربہ کی بناء پر امید رکھی کہ وہی دوا فائدہ کرے گی، لیکن اس سے فائدہ نہیں ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ آج شاید مجھے اپنے تجربہ اور دوا پر بھروسہ ہو گیا تھا، اس لیے اللہ نے دکھایا

کہ کام اللہ کے بھروسہ پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اس کو ضرور سامنے رکھنا چاہئے۔

اسی طرح ایک بار میں نے ایک اردو اخبار کا زمزم کی طبی خوبیوں پر شائع مضمون لے جا کر ان کو دیکھنے کے لیے پیش کیا کہ اس کا طب سے اور دین سے تعلق ہے، لیکن انہوں نے اس کو بغیر دیکھے یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ زمزم کو ہم صرف اس کی دینی حیثیت کی بنا پر اہمیت دیتے ہیں، طبی مصلحت کی بنا پر نہیں دیتے۔ ان کی یہ ایک اہم صفت تھی کہ وہ زندگی کے تمام معاملات میں دینی اور شرعی ہدایتوں اور حیثیتوں کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے، اور اسی کا سب کو مشورہ دیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں خیر وخوبی کی یہ باتیں اور اسی طرح کی دوسری متعدد اچھی باتیں اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آئی تھیں، وہ اپنے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں اپنے والد صاحب کے ایسے فرمانبردار فرزند رہے تھے کہ دوسروں میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کے والد کے ایک محبّ اور دوست نے ڈاکٹر صاحب کے والد کی زندگی میں ہونے والے ایک واقعہ کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بہن (کاتب سطور کی والدہ) اپنی سسرال رائے بریلی سے اپنے والدین کے پاس آئی ہوئی تھیں، ان کو رائے بریلی واپس جانا تھا، ڈاکٹر صاحب اس وقت میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور ان کا امتحان ہو رہا تھا، ان کے والد صاحب کے علم میں امتحان کی بات نہیں تھی، والد صاحب نے بلا کر کہا کہ اپنی بہن کو رائے بریلی پہنچا دیں، اس وقت کے مواصلات ایسے تھے کہ وہاں آنے جانے میں تقریباً دو روز صرف ہو سکتے تھے، اور ڈاکٹر صاحب کا امتحان کا پرچہ چھوٹ رہا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ فرمانبرداری تھی کہ امتحان کی بات نہیں کہی، اور تعمیل حکم پر تیار ہو گئے، اس کا پتہ ڈاکٹر صاحب کے والد کے ان محبّ و دوست کو چلا، وہ فوراً گئے اور جا کر والد صاحب کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ عبدالعلی نے مجھے یہ نہیں بتایا، اور ان کے جانے کی بات واپس لے لی۔

ڈاکٹر صاحب میڈیکل کالج سے پڑھ کر آتے اور ان کے والد اگر کوئی ایسا کام بتادیتے جس میں کہیں جانا ہوتا یا کچھ مشقت ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کیسے ہی تھکے ہوتے ذرا بھی تکلف ظاہر نہ ہوتا، فوراً اس کام کے لیے چلے جاتے، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی نیکیاں اور سعادت مندیاں تھیں کہ جن کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کو اپنی عملی زندگی میں معاشی خوش حالی بھی حاصل ہوئی، لوگوں کی نظروں میں نیک نامی اور شہرت وعزت بھی حاصل ہوئی، اور ان کی آل اولاد کو بھی صلاح وفلاح کی نعمت ملی، اور ان نیکیوں کا صلہ انشاء اللہ آخرت میں اور بھی زیادہ ملے گا۔

حدیث شریف میں نیکی کی طرف دوسروں کو لانے کا ذریعہ بننے کا بڑا اجر بتایا گیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ذریعہ اللہ تعالیٰ کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دیدے تو تمہارے لیے یہ سرخ اونٹوں کے حاصل ہونے سے بہتر ہے۔ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس پہلو سے بھی حصہ وافر ملا، انہوں نے تعلیم وصلاح وہدایت سے دور لوگوں کو دین کی طرف لانے کے لیے جو کوششیں کیں ان سے کئی افراد نہ صرف یہ کہ کفر سے نکل کر اسلام کے دائرہ میں آئے، بلکہ دینی تعلیم حاصل کر کے علماء کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ اور کتنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کی، اور مدد دی جس سے وہ تعلیم یافتہ اور دین دار بنے، اور خود اپنے چھوٹے بھائی کی تعلیم وتربیت کی جو فکر وسرپرستی کی جس کے ذریعہ ان کے صرف ایک عام تعلیم یافتہ شخص بننے کے بجائے مفکر اسلام اور ممتاز داعی ورہبر دین بننے میں خصوصی مدد ملی، پھر ان کے بھانجوں کو جن میں یہ خاکسار بھی ہے دین وعلم دین سے تعلق قائم ہونے کی جو عزت ملی اس میں خصوصی حصہ ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، کیونکہ ہم بھائیوں کی پوری تعلیم ونگرانی ان کی اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (جن کی تعلیم کا زمانہ بھی ان ہی کی سرپرستی میں گزرا تھا) کی نگرانی وسرپرستی میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی طرف سے دوسروں کے ساتھ ہمدردی ان کے ڈاکٹری کے پیشہ کے ذریعہ بھی ہوتی تھی، اور عام زندگی کے مواقع پر بھی ہوتی تھی، اور اس

میں وہ شرعی ذمہ داری کو ہی بنیاد بناتے تھے، چنانچہ صلہ رحمی میں قریب ترین عزیز کو غیر قریب ترین سے زیادہ حق دیتے تھے، اور پڑوسی کو شریعت کے حکم کے مطابق اپنی ہمدردی کے زمرہ میں پوری طرح رکھتے۔ اپنے والد کے دوستوں کو حدیث شریف کے حکم کے مطابق اپنے اخلاق ولحاظ کا مخلصانہ حق دیتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان کی کمزوری اور علالت کا دور چل رہا تھا، جس میں وہ صبح بہت سویرے کسی سے ملتے نہیں تھے، ان کی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کو اس وقت بڑی زحمت ہوتی تھی، ہم لوگوں کو یہ معلوم تھا، اسی دوران ایک صبح سویرے ان کے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک تعلق والے صاحب آئے جو وقتاً فوقتاً آیا بھی کرتے تھے، کوئی خاص بات نہ تھی، انہوں نے سویرے ہی مجھ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو بتادو کہ میں آیا ہوں، میں نے کہا کہ ابھی وہ اس حال میں نہیں ہیں، تھوڑی دیر کے بعد میں بتادوں گا، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد ان کو اطلاع دی، انہوں نے ان کو بلالیا، اور دریافت کیا کب آنا ہوا؟ انہوں نے بتایا کہ صبح سویرے۔ فرمایا کہ ہم کو اطلاع نہیں کی، انہوں نے کہا کہ رابع سے کہا تھا، چنانچہ مجھ کو طلب کیا، اور فرمایا: تم نے کیوں نہیں اطلاع کی؟ کیا تم کو ان کا تعلق معلوم نہیں؟ یہ اشارہ والد صاحب سے ان کا تعلق ہونے کا تھا، کیونکہ اس تعلق کے بغیر کوئی اور صاحب ہوتے جن سے ملنے کی ذمہ داری شرعی طور پر نہ ہوتی تو اس کے ساتھ اپنی سہولت کے لحاظ سے ہی معاملہ کرتے، اس کے ساتھ عزیز وقریب جیسا اخلاق نہ برتتے، چنانچہ کوئی عام آدمی جب ان کی طرف سے یہ فرق دیکھتا تو اس کو ان کے اس طریقہ کو نہ جاننے کی وجہ سے غلط فہمی ہوتی، اور بعض وقت اس فرق پر تعجب بھی ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب شریعت کے طے کردہ اخلاق وصفات کی حتی الوسع پوری پابندی کرنے کے ساتھ وضع قطع میں بھی اس کی پوری پابندی کرتے، انہوں نے دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسکول وکالج ویونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ اندازہ کرلیا تھا کہ انگریزی نظام تعلیم میں پڑھنے کے بعد اخلاق وصفات پر ایک اثر ضرور پڑتا ہے، جس کے

نتیجہ میں ذہن کی تشکیل دین کی اہمیت کے ساتھ اس طرح نہیں ہوتی جس طرح دینی ومشرقی ماحول میں ہوتی ہے، وہ اس کا ذکر کرتے تھے، اور باوجود دین وشریعت پر پورے عامل ہونے کے ایک بار یہ تک کہا کہ مجھ پر بھی اس کا اثر پڑا، اس طرح وہ یہ توجہ دلاتے تھے کہ جدید نظام تعلیم سے استفادہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے ماحول کو ایسا بنانا ضروری ہے کہ ذہن کی اسلامی خصوصیت پر کوئی اثر نہ پڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے دین ودنیا کو اور قدیم وجدید کو اور علم وعمل کو اپنی زندگی میں اس طرح بہم آمیز کرلیا تھا کہ بڑی حد تک انہوں نے اس کا ایک غیر معمولی نمونہ پیش کردیا، جو ایک طرف علوم دینیہ پر عبور رکھنے والے عالم اور دوسری طرف علوم جدیدہ کے ماہر تعلیم یافتہ تھے، اور اس طرح انہوں نے یہ دکھادیا کہ آدمی عزم وبلند ہمتی اور اخلاص عمل سے کام لے تو وہ اس جامعیت کو پیش کرسکتا ہے، جس کی تلقین اسلام کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی میں علم کو عملی شکل دینے کی طرف توجہ رہتی تھی، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ زندگی کے جائز اور لازمی تقاضوں کو پورا کرنے میں انہوں نے اپنے کو دوسروں کا محتاج نہیں بنایا تھا، اپنی صحت کے زمانہ میں جو کام دوسرے لوگ کرسکتے ہیں وہ اپنی صحت وقوت کے زمانہ میں خود بھی کرلینے کی صلاحیت پیدا کرتے تھے، ان کی زندگی میں عملی پہلو کا بڑا لحاظ تھا، وہ دوسروں سے بھی یہ چاہتے تھے کہ علم کو عمل سے جوڑیں، اور زندگی میں خود کفالتی اور حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کریں، ایک بار انہوں نے اپنی ایک صاحبزادی سے فرمایا کہ شیروانی جس کو سمجھا جاتا ہے کہ درزی کے علاوہ کوئی سی نہیں سکتا تم سی کر دیکھو، اور ان سے ایک شیروانی سلوائی، جو استعمال بھی ہوئی، یہ ایک بار ہی کیا، لیکن اس طرح یہ ذہن بنایا کہ کسی کام میں جو زندگی کی ضرورت کا ہے، محض دوسروں کا دست نگر ہونا صحیح نہیں ہے۔

شریعت کے احکام پر عمل کرنے میں خود بھی نمونہ بنتے تھے، اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے تھے، شادیوں میں رسم ورواج کے سخت مخالف تھے، اور حدیث شریف میں آئے ہوئے طریقہ پر عمل کی کوشش کرتے تھے، چنانچہ اپنی صاحبزادیوں کی شادیوں میں سادہ طریقہ

سے نکاح پر عمل کرتے رہے تھے، اور دامادوں کے انتخاب میں دین سے تعلق ہی پر اکتفا کیا، اور دنیاوی توقعات پر نظر نہیں ڈالی، حالانکہ ایک مقبول اور خوش حال ڈاکٹر کی حیثیت سے دنیاوی راحت اور عزت کے پہلو کو ترجیح دیتے تو تعجب نہ تھا، چنانچہ انہوں نے کسی بیٹی کے نکاح کے وقت اس کا خیال نہیں کیا کہ اختیار کردہ داماد کے اقتصادی توقعات مبہم ہیں، نکاح سے قبل اپنے ہونے والے داماد کے سرپرست سے کہہ دیتے کہ برات نہیں آئے گی، یا اس طرح کا کوئی اہتمام نہ ہوگا، اسی طرح داماد وغیرہ کے لیے کسی کپڑے جوڑے کا بھی مطلق انتظام نہ کرتے، اور اس سلسلہ میں عزیمت یہاں تک دکھائی کہ اپنے بیٹے محمد میاں کی شادی کے موقع پر جب کہ وہ اپنی بہنوں کے درمیان تنہا تھے یہ فرمایا کہ برات نہیں جائے گی، اور بیٹے سے کپڑے اور جوتے کے سلسلہ میں فرمایا کہ کوئی اہتمام نہ ہو، جو سادہ سے سادہ انتظام ہو وہ کیا جائے، فرماتے: دکھاوے اور اظہار شان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بھائی اور بیٹے بیٹی سے تعلق ومحبت کے جو جائز اور فطری تقاضے ہیں وہ پوری طرح محسوس کرتے تھے، اور اس کا عملاً اظہار کرتے تھے، اور اس کے لیے ضرورت کا خرچ کرنے میں بالکل کوتاہی نہیں کرتے تھے، ان کو اپنے بیٹے اور اپنے بھائی سے جو محبت تھی وہ بعض وقت صاف ظاہر ہو جاتی تھی، لیکن اس میں ایک دوسرے کے معاملہ میں بے انصافی نہیں ہوتی تھی۔

انگریزی تعلیم بھرپور طریقہ سے حاصل کرنے کے بعد جب کہ ان کے زمانہ میں انگریزی تمدن وترقیات سب مشرقی ملکوں کے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں، اور انگریزی تہذیب کے سامنے مرعوبیت عام تھی، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دینی تعلیم اور مشرقی وشرعی وضع اور اسلامی حمیت اور دینی خیالات پر قائم رہنا اور عمل کرنا ایک غیر معمولی بات تھی، جب کہ مغربی تعلیم وتمدن اور ترقیات اور ان کی مختلف پہلوؤں میں فائدہ مندیوں سے وہ پوری طرح واقف تھے، ان کے سمجھنے میں کمی نہیں رکھتے تھے، اس طرح دین ودنیا کی خوبیوں کو انہوں نے باہم جمع کر لیا تھا، اور اسلام کے بتائے ہوئے طریقے وطرز عمل کو اچھی طرح اختیار کیا تھا۔

مذکورہ بالا پہلوؤں کی خوبیوں کے حامل ہونے کی بناء پر یہ بات ظاہر وباہر ہو جاتی ہے

کہ ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی متنوع صفات کی اور متوازن شخصیت ہمارے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے اہم نمونہ کی حیثیت رکھنے والی شخصیت تھی، اسی کے ساتھ ساتھ وہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے حضرات کے لیے بھی قابل تقلید ہے، ندوۃ العلماء نے اپنے قیام کے وقت تعلیمی و تربیتی حکمت عملی سے ایسے افراد تیار کرنے کو مقصد بنایا تھا جو عہد حاضر کی دشواریوں اور تقاضوں سے بھی واقف ہوسکیں، اور دینی قدروں اور شرعی ہدایتوں کے بھی پورے پابند ہوں، نئے حالات وترقیات سے مرعوب نہ ہوں، اور اسلامی فکر وکردار کو ہر عہد کے لیے سودمند اور لائق اتباع سمجھتے ہوں۔ اور یہی فکر وکردار وہ فکر وکردار ہے جس کی نمایاں جھلک ڈاکٹر صاحب میں پائی جاتی تھی۔ ہر کام میں تصحیح نیت کا اہتمام اور سنت وشریعت کا پاس ولحاظ ڈاکٹر صاحب کی ایسی صفات تھیں جس نے ان کے اندر مقناطیسیت وجاذبیت پیدا کردی تھی، اور ان سے ملنے والا ان سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا اور بعض بڑے علماء وفضلاء ان کو دیکھ کر بے ساختہ کہہ اٹھتے کہ یہ تو فرشتہ صفت انسان ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک اچھی مثالی زندگی گزار کر مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں ستر سال کی عمر میں انتقال کیا، امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی نے لکھنؤ میں اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے رائے بریلی میں ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور تکیہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے سرہانے سپرد خاک ہوئے۔

رحمة الله تعالیٰ رحمة الصديقين والشهداء والصالحين والمقربين۔

ڈاکٹر صاحب کے سانحہ وفات سے جو ۷ رمئی ۱۹۶۱ء کو پیش آیا، ہم لوگ اپنے ایک مشفق مربی وسرپرست سے محروم ہوگئے جنھوں نے ہم لوگوں کی قدم قدم پر علمی فکری اور دینی رہنمائی کی، وہ ہمارے ماموں تھے اس لیے یہ سانحہ ہمارے لیے ذاتی طور پر ایک عظیم سانحہ ہے(۱)۔

والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ

ہمارے دادا سید خلیل الدین حسنی رحمۃ اللہ علیہ مولوی سید رشید الدین (برادر اکبر حضرت سید شاہ ضیاء النبی حسنیؒ) کے بڑے بیٹے تھے، اور ایک باوجاہت اور بااثر ورسوخ شخصیت کے حامل تھے اور اپنے دینی جذبے اور کچھ خاندانی اثرات کی وجہ سے وہ عقیدۂ توحید میں بڑی صلابت رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو اپنے عہد کے علماء اور مشائخ طریقت میں عالم ربانی ومربی جلیل حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (م۱۳۲۳ھ) سے بڑی عقیدت ومحبت تھی، اور اسی تعلق سے وہ اپنے عزیز قریب اور ماموں زاد بھائی مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (م۱۳۴۱ھ) کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں دہلی اور اس کے اطراف دوآبہ کے سفر میں ساتھ ہوئے اور انھوں نے اپنے خاندان کے جلیل القدر مرشد ومصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی، جو منظور ہوئی، اور اس طرح وہ حضرت گنگوہیؒ سے اپنی عقیدت ومحبت کو عملی شکل میں بھی لے آئے اور بیعت ہوگئے ان کا نام بھی انھوں نے اسی تعلق سے رشید احمد رکھا تھا۔

والد صاحب کی ولادت ان کے اپنے آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں ۲۰/صفر ۱۳۱۰ھ-۱۳/دسمبر ۱۸۹۲ء منگل کو ہوئی تھی، ان کی بڑی بہن جو اُن سے تقریباً ۱۴/۱۵ سال بڑی تھیں وہ بھی تنہا تھیں اور ایک عرصے کے بعد والد صاحب کی ولادت ہوئی تو پورے خاندان میں بڑی خوشی کی بات محسوس کی گئی، اپنے والد کی وہ بھی تنہا نرینہ اولاد تھے، اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ سننے بولنے کی صلاحیت ان کے لیے مقدر نہ ہو اور وہ اس صلاحیت کے بغیر دنیا میں زندگی گزارنے کی ذمہ داری انجام دیں، اور الحمدللہ ان کی دیگر صلاحیتیں سننے بولنے کی صلاحیت نہ ہونے کے باوجود اس طرح کام کرتی رہیں کہ سننے

بولنے کی صلاحیت نہ ہونے کی کمی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا، ان کو بچپن میں حرف شناسی اور تحریر کی گھریلو مشق کرادی گئی تھی، ان کے والد سید خلیل الدین صاحب نے جو کہ آنریری مجسٹریٹ تھے ان کو تعلیم دینے کے لیے مستقل استاد رکھا ان استاد نے انہیں قرآن شریف کی تعلیم دی، اور اردو و انگریزی بھی سکھائی، ابتدائی تعلیم دینے میں مولانا فخر الدین خیالی (جد بزرگوار حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) اور ہمارے دادا مولوی سید خلیل الدین صاحب کی کوششوں سے ان کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ قرآن مجید کی تلاوت کرسکیں، چنانچہ وہ قرآن شریف کی تلاوت اکثر کرتے، اور نماز کی سورتیں، تسبیحات زبان سے ادا کرتے، لکھنے کی بھی ان کو مشق ہوگئی تھی، چنانچہ جب ان کو مرکّب اور واضح بات کہنی ہوتی تو اس کو تحریر سے ادا کرتے تھے، تحریر صاف ستھری تھی، خط شکست میں نہیں تھی، اور اس کی ان کو ایسی مشق ہوگئی تھی کہ کاغذ نہ ہوتا تو انگلی سے پیٹھ پر اس طرح لکھتے کہ پیٹھ والا بات کو سمجھ لیتا، ورنہ الفاظ کی منھ سے ادائیگی میں ہونٹوں کے تغیرات کو دیکھ کر دیکھنے والے کو ان الفاظ کو سمجھنے میں مدد ملتی، جو ان کے ہونٹ سے ادا ہوتے، اور ہاتھ کے اشاروں سے بات پوری طرح واضح ہوجاتی، اخلاق و معاملات میں بہت متوازن اور معقول انداز نظر آتا، پڑھنے کی صلاحیت کی وجہ سے ان کو مطالعے کا بھی شوق تھا، خاص طور سے صلحاء اور علماء کے تذکرے کا اور اصلاحی کتابوں کے مطالعے کا، اس لیے ان کے دل میں اہل دین کی محبت اور عظمت کا احساس اور حسن خلق، مروت، سخاوت اور غرباء اور مساکین سے ہمدردی اور اعانت کا جذبہ غالب تھا، نماز باجماعت کا بڑا اہتمام تھا اور ان سے ملنے والے ان کے اخلاق اور طرز معاملہ سے بہت متاثر ہوتے، متعدد آدمیوں کو ان سے ملاقات کے بعد تعریف کرتے سنا گیا کہ بڑے بااخلاق اور مہمان نواز شخصیت رکھتے ہیں، ان کی اس خصوصیت کا لوگ تذکرہ کرتے کہ دسترخوان پر ایک ایک مہمان پر نظر رکھتے ہیں اور یہ ان کی اپنی فکر کی بات تھی کہ انھیں اصلاحی تعلق بھی قائم کرنے کی فکر ہوئی، اور وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری سے بیعت بھی ہوگئے اور ان کے تعلیم کردہ معمولات پر عمل

پیرا بھی رہے۔

وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بہنوی تھے اور خالہ زاد بھائی بھی تھے، اور ایک واسطے سے چچازاد بھائی بھی تھے، لیکن عمر میں ۲۰/۲۲ سال بڑے تھے مگر مولاناؒ کے دینی وعلمی مقام کا لحاظ کرتے ہوئے ان کا خیال رکھتے تھے، اور ان کے مہمانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور خود بھی ان کی مہمان نوازی کی طرف توجہ کرتے تھے، اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت ان کے سپرد کردی تھی، اور یہ بات اس دور میں مشکل بات تھی، کیوں کہ معاشی اور دنیاوی زندگی کو انگریزوں کے اقتدار واثر کی بنا پر اس وقت کے شرفاء کے خاندان کے اکثر افراد زیادہ اہمیت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور دینی تعلیم کو دنیاوی اعتبار سے ناکامی کی علامت سمجھا جاتا تھا، والد ماجدؒ سننے اور بولنے کی صلاحیت نہ ہونے کی بنا پر اولاد کی دنیاوی اور معاشی بہتری کے زیادہ قائل ہونے کے لائق تھے، اور ہر باپ اپنی اولاد کے مستقبل کی کامیابی کا خواہش مند ہوتا ہے، اور اگر اس کی کچھ معذوری ہو تو اس کا یہ چاہنا بڑھ جاتا ہے، لیکن انھوں نے اس کی پروانہیں کی، اور دینی تعلیم جو اس زمانے میں دنیوی اعتبار سے ناکامی کی علامت سمجھی جاتی تھی، اپنی اولاد کے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو کہ اس وقت ندوے کے ناظم بھی تھے اور ان سے بے تکلف اور ہم عمر تھے، اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی جو اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہم استادوں میں تھے کے اختیار میں دے دی اور اس طرح مجھ کو اور میرے بھائیوں کو دینی تعلیم کی راہ اختیار کرنے کی سعادت ملی، بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ نے ندوے کی تعلیم کے ساتھ مظاہر علوم سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی سرپرستی میں رہ کر بھی تعلیم وتربیت حاصل کی، اور میں نے بھی کچھ دن مظاہر العلوم میں اور تقریباً ایک تعلیمی سال دارالعلوم دیوبند میں لگایا لیکن میری تعلیم کا بڑا حصہ ندوے کا رہا اور یہیں سے تکمیل کی، چھوٹے بھائی مولوی محمد واضح سلمہٗ نے ندوے میں ہی رہ کر تعلیم مکمل کی اور دعوتی تقاضوں کو سامنے رکھ کر کچھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کی، سب سے بڑے بھائی سید محمود حسن مرحوم تھے جنھوں نے

۲۰/۲۱ سال کی عمر میں ایک بیماری کے نتیجے میں انتقال کیا، وہ بھی تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے تھے، لیکن پے در پے بیماریوں کی وجہ سے وہ تعلیم مکمل نہ کر پائے تھے، مگر ذہین تھے، اور والد صاحبؒ کی بہت سی خصوصیات ان میں پائی جاتی تھیں، عین جواں عمری میں ان کا سانحۂ وفات والد صاحب اور والدہ صاحبہ دونوں کے لیے ہی بڑے صدمے کا تھا، مگر دونوں نے ہی نہایت صبر وتحمل سے اس صدمے کو برداشت کیا، والد صاحب کو ایک بیٹی کو وفات کا بھی صدمہ اٹھانا پڑا تھا جس کا نام رابعہ تھا۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی ملنے پر حکومت ہند نے کئی انقلابی اقدامات کیے، ایک اقدام زمینداری کے خاتمے کا اعلان تھا اس سے مسلمانوں کے خاندان خاص طور پر زیادہ متاثر ہوئے، ہمارا خاندان بھی زمینداری کا رہا تھا، دنیاوی لحاظ سے وہی ذریعہ معاش تھا، زمینداری ختم ہونے سے دشواریاں سامنے آئیں، ان دشواریوں کی بھی ہمارے والدین محترمین نے پروا نہیں کی، اور ہم لوگوں کے لیے وہی راستہ پسند کیا جو ہمارے ماموؤں نے ہم بھائیوں کے لیے اختیار کیا تھا۔ ہماری والدہ صاحبہ نے اس سلسلے میں بڑے حوصلے اور ہمت کا ثبوت دیا، اور تکلیفیں برداشت کیں، اور ان کا والد صاحب کو مطمئن رکھنے اور ان کی رائے بنانے میں بڑا کردار رہا، والد صاحب نے بخوشی اس کو قبول کیا اور اپنی تکلیفوں کا شکوہ نہیں کیا۔ ان کی یہ خصوصیت ہم لوگوں کو نظر میں آتی کہ وہ دین داری کو پسند کرنے والے اور خود اس پر عمل کرنے والے تھے، اپنی وضع قطع میں دینی عمل اختیار کرنے میں وہ پوری طرح پابند تھے، اور آخر میں تو مسجد سے اتنا گہرا تعلق ہو گیا تھا کہ وہاں وقت پر اذان ہونے اور نمازیوں کے وقت پر پہنچنے کی فکر کرتے تھے، رات کے وقت خود چراغ جلاتے اور اگر صفائی کی ضرورت ہوتی تو خود صفائی کرتے اور اپنی اولاد کو مسجد اور نماز باجماعت کے اہتمام کی تاکید کرتے اور وقتاً فوقتاً ہم لوگوں کو دینی معاملے میں باعمل رہنے کی تاکید کرتے تھے، وہ سب کے ساتھ خیر خواہانہ رویہ رکھتے تھے، اور رشتہ داروں، قرابت داروں کے ساتھ ان کی قربت داری کا جو حق ہے پورے اخلاق کے ساتھ ادا کرتے، ان کا

بازار جانے اور خاندان کے لوگوں کی ضرورت کا سامان لانے کا معمول تھا اور اس خدمت پر خوشی کا اظہار کرتے، سخت گرمی اور سردی کے موسم میں اس میں کوئی تردد نہ ہوتا۔

والد صاحب کی بہن بتول بیؒ (والدہ ماجدہ برادر معظم سید حسن مجتبیٰ وڈاکٹر سید حسن ثنیٰ وسید محمد مسلم حسنی رحمہم اللہ) چونکہ عمر میں خاصی بڑی تھیں اور والد صاحب کو اپنی والدہ کے انتقال کا صدمہ بچپن میں ہی اٹھانا پڑا تھا اس لیے بہن کی شفقتیں ماں جیسی ملیں، ان کی یہ بہن ماں کی طرح رویہ رکھتی تھیں، اور وہ خاندان کی بڑی سمجھ دار اور دین دار خاتون تھیں، ان کے ساتھ والد صاحب کو اپنی خالہ صاحبہ خیر النساء بہتر رحمہا اللہ کی بھی شفقت ملی، وہ بھی بڑی فکرمندی کا رویہ رکھتی تھیں، ان کی یہ خالہ جو بعد میں ان کی ساس بھی بنیں اور اپنی دینی خدمات، مناجاتوں اور ارشاد وتربیت اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی والدہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشہور ہوئیں، اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی مگر علم وعمل میں بڑی فائق خاتون تھیں، ان کی عمر والد صاحب کی بڑی بہن کی عمر کے تقریباً برابر تھی بلکہ ان کی یہ بہن اپنی خالہ سے ایک سال بڑی تھیں، اس طرح والد صاحب کو بہن اور خالہ کی محبت وشفقت اور توجہ سے گھر کے اندر ماں جیسی شفقت ملی، اپنے نانا اور پورے خاندان کے بزرگ وسرپرست اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے سلسلے کے مشہور بزرگ شاہ ضیاء النبی حسنی (م ۱۹۰۶ء) کا بھی انھوں نے زمانہ پایا، اس طرح ان کے برکات سے بھی والد صاحب مستفیض ہوئے، دادیہالی رشتے سے والد صاحب حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی کے پوتے بھی ہوتے تھے کہ ان کے حقیقی بڑے بھائی مولوی رشید الدین حسنی والد صاحب کے دادا تھے، ان سب خاندانی نسبتوں کا اثر تھا کہ والد صاحب کی طبیعت میں خوبیاں جمع ہوگئی تھیں، جن کو ان کے ملنے والے محسوس کرتے تھے اور ان کا چرچا کرتے تھے۔ والد صاحب اگر سنتے بولتے ہوتے تو یہ خوبیاں اور بھی زیادہ اجاگر اور نمایاں ہوتیں، اللہ نے ان کا فائدہ ان کی اولاد کو پہنچایا، اور انھوں نے اپنی اولاد کو جس راہ پر ڈالا تھا، اللہ نے ان کی اولاد کو جس راہ پر رکھا، پھر انھوں نے اپنے پوتوں کے لیے بھی یہ راہ پسند کی اور پوتیوں کے لیے بھی کہ

جنھوں نے بیٹی کی کمی پوری کی، گھر کے دینی وعلمی ماحول میں..... جوان کی خالہ صاحب سیدہ خیرالنساء بہتر مرحومہ (م ۱۹۶۸ء) کی کوششوں سے قائم تھا، اوران کی سرپرستی میں ان کی ذی علم وعمل صاحبزادی امۃ اللہ تسنیم صاحبہ (م ۱۹۷۶ء) تعلیم وتربیت کا نظام قائم کیے ہوئے تھیں، اسی ماحول سے اپنی پوتیوں کو فیض یاب کرایا، اوراللہ نے دینی فکروں کے ساتھ خوشحالی بھی عطا کی اور لوگوں کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ یہ اپنی اولاد کو خالص دینی تعلیم دلا کر دوسروں کا دست نگر کررہے ہیں، اللہ نے خصوصی فضل فرمایا اوران کی نیت وارادے کا فائدہ ان کی اولاد کو اللہ نے خوب عطا کیا۔

انھیں بیت اللہ شریف کی زیارت اور روضۂ اقدس پر حاضری کا بڑا شوق تھا جو بے چینی کی حد تک پہنچا تھا، اللہ نے ان کے ارادے کو بھی قبول کیا، باوجود کبرسنی اور ضعف وعلالت کے صحت وقوت اور بہت حوصلے کے ساتھ مناسک حج پورے کیے، میرے لیے یہ سعادت کی بات تھی کہ میں ان کے اس مبارک سفر میں ساتھ تھا، اس طرح مجھے ان کی اس خصوصیت کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، دوبارہ حج کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن پھر صحت اس قابل نہ رہی، چند سال اور حیات رہے، البتہ صحت کمزور ہوتی چلی گئی، انتقال سے چند سال پہلے موتیابند کا آپریشن کرایا، اس کے بعد اضمحلال آیا اور بیماریاں بڑھتی گئیں، زیادہ کمزوری لاحق ہوگئی، اورانتقال سے چند ماہ پہلے بالکل صاحب فراش ہوگئے، لیکن اللہ کا ان کے ساتھ خاص فضل یہ تھا کہ زبان پر کلمہ طیبہ برابر جاری رہتا۔ تسبیح پر درود شریف، استغفار بکثرت پڑھتے، کہتے تھے دن میں کئی کئی سو بار پڑھ لیتا ہوں، علالت میں نماز کا ایسا اہتمام تھا کہ شروع بیماری میں جمعہ کو سائیکل پر مسجد جاتے، پھر اس سے بھی معذور ہوئے اور آخر وقت تک نماز کا اہتمام کیا، بعض بعض دفعہ ایک ایک وقت کی نماز کئی کئی بار پڑھی، سخت تکلیف کے باوجود نماز کا تقاضا کرتے، اور تیمّم کرتے اور دیر تک نماز پڑھتے رہتے، آخرت کے حالات معلوم کرتے رہتے، جنت کے ذکر پر خوشی کا اظہار کرتے، اور اللہ سے اسے طلب کرتے، دوزخ سے پناہ مانگتے، بڑے صاحبزادے برادر معظم مولانا

سید محمد ثانی حسنیؒ (مصنف کتاب: ''خانوادہ علم الٰہی'') جوان کی برابر خدمت میں تھے کچھ وصیتیں فرمائیں، جن میں نیک زندگی گزارتے رہنے کی تلقین کی، غریبوں سے حسن سلوک، عزیزوں اور بھائیوں سے صلہ رحمی کو کہا، اور انتقال سے دو روز قبل کہا کہ ''گواہ رہو کہ مجھے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے، اور میں غریبوں سے محبت رکھتا ہوں، انتقال کے وقت خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ قریب تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ۳/شعبان المعظم ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۲/اگست ۱۹۷۵ء میں ۸۳ سال کی عمر میں اپنے مستقر پر تکیہ کلاں رائے بریلی میں دس بجے دن میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور والد صاحب کو انجام بخیر ہونے کی بہت رہا کرتی تھی، عیادت کرنے والوں اور اپنی اولاد سے اکثر اسی فکر کا اظہار فرماتے، اللہ نے ان پر فضل فرمایا۔

والد صاحبؒ دین کی محبت کی وجہ سے اخیر عمر میں فرماتے تھے کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہماری اولاد نے دین کی تعلیم حاصل کی اور وہ خدمت دین میں مصروف ہیں، وہ فرماتے کہ اگر کوئی اچھی خوشی کی بات ہو تو ہمیں بتادیا کرو تاکہ خدا کا شکر ادا کریں، تمھاری ترقی اور اچھے کام سے ہمیں خوشی ہوتی ہے، خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ جب میرے اسفار ہوتے تو فرماتے کہ ہمیں تفصیل سناؤ، ہمیں اس سے خوشی ہوتی ہے۔

غسل دینے میں مشہور عالم دین مولانا منظور نعمانیؒ شریک رہے، خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً وغفر له مغفرة تامةً وأدخله فی الجنة۔

محترمہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی)

ہمارے مختصر سے خاندان کے لیے جو حادثے زیادہ صبر آزما رہے ان میں ایک خالہ صاحبہ محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا حادثۂ وفات بھی ہے جو لکھنؤ میں پیش آیا، وہ اچانک سخت علیل ہوئیں، علاج کے لیے جو کوششیں بس میں تھیں کی گئیں، وقت موعود آچکا تھا، انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، یہ واقعہ ہم سب کے لیے خصوصاً ان کی ہمشیرہ صاحبہ جو ہماری والدہ ہیں اور بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کے لیے بڑا سخت ہے، یوں ان کو پورے خاندان میں ہردلعزیزی حاصل تھی اور ان کے تعلیمی وتربیتی کردار نے ان کی مقبولیت اور بڑھادی تھی۔

ولادت اور نشو ونما

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی متوازن ستودہ صفات شخصیت نے خاندان کے تمام افراد نیز دیگر اہل تعلق میں ایک محبوبیت حاصل کرلی تھی۔ ان سے مل کر مسرت اور انس محسوس کیا جاتا تھا اور ان کی محبت وتربیت سے سیرت کی تعمیر ہوتی تھی، تکیہ شاہ علم اللہؒ میں تقریباً ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئیں، اور نشو نما علمی ودینی ماحول میں ہوا۔ والد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء اور بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ صاحب کی شفقت اور سرپرستی میں تربیت ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی عالی صفات والدہؒ کی تربیت ومحبت سے پوری طرح مستفید ہوئیں، اسی ماحول میں ان کا علمی شوق پروان چڑھا اور دینی ذوق کی نمو ہوئی اور وہ ایک مربّیہ اور عالمہ کی حیثیت سے خاندان میں نمایاں ہوئیں۔

ادبی ذوق

شادی اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید ابوالخیر صاحب حسنی مرحوم سے ہوئی، جو

ایک عالم اور ادیب تھے۔ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کا یہ دور جو خاوند کی رفاقت میں گزرا علمی لحاظ سے مضمون نگاری اور ادبی اشتغال کا دور تھا، انھوں نے اس زمانے میں بکثرت مضامین لکھے، جو عام طور سے مسلم خواتین کے لیے اصلاحی و دینی موضوعات پر ہوا کرتے تھے۔ یہ مضامین اکثر و بیشتر رسالہ ''مسلمہ'' جالندھر میں شائع ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب یہ رسالہ پاکستان منتقل ہو گیا تو موصوفہ کا تعلق بھی اس رسالہ سے باقی نہیں رہا، لیکن جلد ہی ان کے بھانجے مولانا محمد ثانی حسنیؒ نے مسلم خواتین کے لیے ایک رسالہ اپنی اور موصوفہ کی ادارت میں نکالنا شروع کیا جو الحمدللہ تا حال جاری ہے، یہ رسالہ ان کے تحریری و ادبی ذوق کی تسکین کا باعث بنا۔ شروع شروع میں وہ اس سے خاص علمی دلچسپی لیتی تھیں، لیکن جیسے جیسے نگاہ کمزور ہوتی گئی یہ دلچسپی محدود ہوتی گئی البتہ مضامین کی صورت میں ان کا تعلق اس رسالہ سے برابر جاری رہا۔ مضامین کے ساتھ ساتھ نظموں اور مناجاتوں کا بھی سلسلہ رہا جو کتابچوں کی شکل میں علاحدہ سے شائع ہوئیں۔

ریاض الصالحین کا ترجمہ ''زادِ سفر''

امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ نے جن کو خاندان کے اکثر بڑے چھوٹے ''عائشہ بی'' کے نام سے موصوف کرتے تھے اپنی عمر کے آخری تیس سال اپنے بھائیوں کے ساتھ گزارے۔ اسی زمانہ میں ان کو اپنے برادر خورد مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ صاحب کے ہمراہ ۱۹۴۷ء میں حج و زیارت کی بھی سعادت حاصل ہوئی جس میں ان کے ساتھ ان کی والدہ صاحبہ اور بھانجے مولانا محمد ثانی حسنیؒ بھی تھے۔ اس حج و زیارت کا تذکرہ انھوں نے ہمیشہ لطف لے کر کیا، دوران حج میں متعدد مناجاتیں اور نعتیں بھی کہیں۔ جن میں ان کے دل کی تڑپ اور دینی جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ امۃ اللہ تسنیم صاحبہؒ کا یہ تیس سالہ دور علمی اور تعلیمی مشغولیت میں گزرا خاندان کے اس دور کی نئی خاتون نسل ان کی شاگرد ہے، انھوں نے اپنی ابتدائی عمر میں خود اپنی ذاتی دلچسپی سے عربی پڑھی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں اور پھوپھا مولانا سید طلحہ حسنی صاحب مرحوم سے جب اور جس قدر وقت ملتا تعلیم میں استفادہ کرتی

رہیں۔اس کے نتیجہ میں ان کی عربی اتنی بہتر ہوگئی تھی کہ انھوں نے کئی عربی کتابوں کے ترجمے کئے۔اور خاندان کی متعدد بچیوں کو ابتدائی عربی کی تعلیم دی۔ان کے ترجموں میں اہم ترین ترجمہ احادیث کے مشہور مجموعہ ''ریاض الصالحین'' کا ترجمہ ہے۔اس کتاب میں احادیث کا انتخاب تربیت اخلاق وتعمیر وسیرت کے موضوع تک محدود رکھا گیا ہے۔یہ انتخاب مشہور محدث وشارح ''مسلم'' امام نوویؒ نے کیا ہے۔محترمہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی) نے اس کتاب کا ترجمہ دوجلدوں میں کیا جس کا نام ''زادِسفر'' رکھا جو'' مکتبہ اسلام'' سے کئی بار طبع ہوکر مقبول ہوا۔رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی اس کے معتدبہ نسخے خرید کر تقسیم کرائے۔سعودی ریڈیو نے اپنی اردو سروس سے اس کتاب کی مترجم احادیث بالاقساط نشر کیں۔مرحومہ اپنے اس تصنیفی کام کو آخرت کے لیے بڑا سرمایہ سمجھتی رہیں۔امید ہے کہ یہ ان کے لیے عرصہ دُراز تک صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔مرحومہ نے اس کتاب کے ترجمہ میں بڑی محنت و دل سوزی سے کام لیا کیوں کہ نہ صرف یہ کہ معیاری عربی کا سوال تھا جس کے لیے ماہرانہ علمی قابلیت کی ضرورت تھی بلکہ معاملہ حدیث شریف کا تھا جس میں بڑی امانت داری کی ضرورت تھی چنانچہ انھوں نے اپنا یہ ترجمہ اولاً اپنے فاضل بھائیوں کو دکھایا اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب مرحوم کے پاس بھیج کر لفظ لفظ سنوایا۔دونوں حیثیتوں سے تصدیق ہونے کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے اس کے لیے مقدمہ حاصل کیا جس سے ترجمہ کی اہمیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

علمی وتحریری سرمایہ

مرحومہ کے دیگر مطبوعہ تصنیفی کاموں میں بچوں کے لیے قصص الانبیاء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ''ہمارے حضور'' نیز صحابیات کے حالات پر بچیوں کے لیے متعدد کتابیں ہیں۔

مرحومہ نے جو زمانہ اپنی درمیانی عمر میں علمی وتحریری ذوق و دلچسپی میں گزارا، اس میں بھی ان کے عالی ذوق کا خاصہ ثبوت ملتا ہے۔انھوں نے اس دور میں مضامین لکھے،

نظمیں کہیں، انھوں نے بیت بازی کے نام سے ایک کتاب لکھی، اس کتاب میں انھوں نے مستند اساتذہ شعرار دو کے کلام سے ایک انتخاب تیار کیا جو چند بیت بازی کرنے والی خواتین کی زبان سے ایک ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ بیت بازی بیک وقت افسانوی لطف کی بھی حامل ہے اور تربیت ذوق شعری کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح ''انجام بخیر'' کے نام سے انھوں نے رسالہ ''مسلمہ'' میں بالاقساط ایک سلسلہ لکھا جو بیک وقت ادبی چاشنی بھی رکھتا ہے اور اصلاحی اہمیت بھی ان کا ایک دوسرا سلسلہ ''میری بے زباں استانیاں'' کے نام سے بالاقساط اسی رسالہ میں شائع ہوا جس سے ان کتابوں پر روشنی پڑتی ہے جن سے مرحومہ نے فائدہ اٹھایا اور ان کی علمی زندگی کی نمو میں ان کا بڑا حصہ ہے یہ غیر مطبوعہ مجموعہ نیز مختلف پرچوں میں مرحومہ کے شائع شدہ مضامین نوجوان خواتین کی علمی و اخلاقی تربیت کا اچھا سامان رکھتے ہیں۔

جذبۂ خدمت

اپنی والدہ کے ضعف کے زمانہ میں چونکہ مرحومہ ان کے ساتھ رہیں اس لیے ان کو اپنی والدہ کی خدمت کا بیش بہا موقع حاصل ہوا۔ اور اس موقع سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا، وہ اپنی والدہ کے لیے ہمہ وقت سہارا تھیں۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتیں، استنجے اور وضو میں مدد کرتیں، رات کو قریب ہی رہتیں جب اور جو ضرورت ہوتی مدد کرتیں، دو دن کی بھی جدائی ان کے لئے ناقابل عمل سمجھی جاتی۔ چنانچہ اپنی والدہ کی وفات کے بعد انھوں نے ایک خلا محسوس کیا۔ لیکن وہ خاندان کی نظر میں اپنی والدہ کی جانشین ثابت ہوئیں۔ خاندان کے افراد ان کے ساتھ بھی اسی طرح کی محبت و احترام سے پیش آتے جس طرح ان کی مرحوم والدہ جناب خیر النساء بہتر صاحبہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔

اصلاحی مشاغل

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا تعلق رکھتی تھیں اور ذاکر و شاغل

تھیں۔ لایعنی معمولات سے مکمل پرہیز کرتیں اور غیر مفید مجالس میں بالکل شرکت نہ کرتیں اپنے امکانات و وسائل کے مطابق مرحومہ نے اصلاح و دعوت کے عملی کام سے بھی دلچسپی لی۔ وہ ہر ہفتہ خواتین کا اجتماع کرتیں اور اس میں اصلاحی و دعوتی مضامین پڑھ کر سناتیں اور کبھی کبھی کسی عالم دین سے ان کے لیے واعظ کہلواتیں، اس اجتماع سے خاندان نیز قرب و جوار کی خواتین نے خاصا فائدہ اٹھایا، اور ماحول میں دینی جذبہ بیدار کرنے میں مدد ملی۔

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی اولاد بچپنے میں ہی انتقال کر گئی تھی۔ ان کی یہ محبت بھی ان کے بھانجوں بھتیجوں پر صرف ہوئی۔

آج ان کی جدائی کو خاندان کے سب بڑے ایک عزیز بہن کی اور سب چھوٹے ایک مشفق خالہ و پھوپھی کی اور گرد و پیش لوگ ایک نیک اور مربی بی بی کی جدائی محسوس کر رہے ہیں اور سب غمزدہ ہیں۔ ان کا سانحۂ ارتحال ایسے وقت پیش آیا جب ہم لوگ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ کامیاب اور تاریخی جشن کی مشغولیتوں سے فارغ ہو کر بحسن وخوبی اس کے انجام پا جانے پر خوشی منا رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ خالہ صاحبہ کی علالت نے سنگینی اختیار کی اور پھر ۲۸ر جنوری ۱۹۷۶ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

ان کا سانحۂ انتقال ایک ایسے وقت پیش آیا جب ہم لوگ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ کامیاب اور تاریخی جشن تعلیمی کی مشغولیتوں سے فارغ ہو کر بحسن وخوبی اس کے انجام پا جانے پر خوشی منا رہے تھے اور اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ خالہ صاحبہ کی علالت نے اختیار اور پھر ۲۸/ جنوری ۱۹۷۶ء کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔

اللہ تعالیٰ ان کا بدل عطا فرمائے۔ اور ان کی مثال بار بار پیدا کرے۔ آمین۔

برادر عزیز محمد میاںؒ

عزیز بھائی محمد میاں (جو محمد الحسنی کے نام سے معروف ومشہور تھے) کو آج بجائے سلمہ کے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، یہ اندازہ نہ تھا کہ اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں گے، اور ہمارے خاندان کا یہ عزیز ترین رکن اور ہماری جماعت کا یہ ممتاز فرد دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوجائے گا۔ انا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

محمد میاں مرحوم ابھی جوان ہی تھے، لیکن انھوں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں خاصا تحریری وفکری کام انجام دیا، ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ فکر وادب کا جتنا ذخیرہ اس نوجوان قلم نے اب تک پیش کیا ہے آئندہ متوقع عمر میں کم از کم اتنی ہی مقدار کا ضرور اضافہ کرے گا، لیکن تقدیر الٰہی میں ان کی عمر مختصر تھی۔

محمد میاں نے شمسی تاریخ سے ۴۴ سال اور قمری تاریخ سے ۴۵ سال کی عمر پائی، اس میں سعی وعمل کی ۲۵ سالہ عمر انھوں نے ساری کی ساری خدمت، دعوت فکر اسلامی میں گزاری۔ ان کا قلم اس پوری مدت میں جوش وجذبہ کے ساتھ رواں دواں رہا، ان کا ذہن رسا، ہمت بلند، ذوق ستھرا اور ادراک قوی تھا، وہ عمر کے آخری دن تک لکھتے اور کام کرتے رہے اور جب گھنٹوں کی علالت کے بعد اس دنیا سے اچانک رخصت ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک انہونی تھی جو پیش آ گئی، جو سنتا تعجب کرتا، اور رنج سے مغلوب ہوجاتا، لوگ کہتے کہ ابھی کل تک تو صحت ونشاط کے عالم میں ملاقات ہوئی تھی، ابھی کل تک ان کو مرنجاں مرنج دیکھا اور پایا تھا، لیکن واقعہ واقعہ تھا، قضا وقدر کا معاملہ، اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ للہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شیئ عندہ بأجل مسمی، اللہ ہی کا ہے جو اس نے لیا اور اس نے دیا اور ہر شے اس کے یہاں ایک مدت کے ساتھ ہے۔

محمد میاں اپنی کئی بہنوں کے درمیان تنہا بھائی تھے اور سب بہنوں سے چھوٹے

تھے، لہٰذا ان کی پیدائش نہ صرف ان کے والدین بلکہ ان کی بہنوں اور ان کے اہل تعلق کے لیے بے حد مسرت کا باعث تھی چنانچہ ان کے نشو ونما کا زمانہ والدین کی خصوصی شفقت اور بہنوں کی خصوصی محبت میں گزرا، لیکن اس کے باوجود نشو ونما کے زمانے میں بھی ان کی عادات وصفات پسندیدہ رہے۔ ان کے بڑوں کے دل میں ان کی محبت نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہا، اپنے والدین کی سب سے چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ سے محمد میاں کو کم عمری ہی میں اپنے والدین کے انتقال کا غم سہنا پڑا۔ والدہ کے انتقال کے وقت وہ صرف ۲۲ سال کے اور والد کے انتقال پر ۲۶ سال کی عمر کے تھے۔ اس طرح نوعمری میں ان پر گھریلو ذمہ داری کا بڑا بوجھ پڑ گیا۔ انھوں نے اس سلسلے کی ذمہ داری کو خوبی کے ساتھ اٹھایا اور اپنے والدین کے خلف الصدق ثابت ہوئے۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا نصف حصہ ان کے عظیم والد ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی اور تربیت میں گزرا یہ ان کے نشو ونما کا دور تھا، اس میں ان کے علم وادب اور بنیادی اخلاق وافکار کی بنیاد پڑی ان کی تعلیم وتربیت کا بیشتر کام ان کے فاضل والد نے خود اپنے تجربوں کی روشنی میں اور خصوصی اہتمام سے انجام دیا، انھوں نے عربی تعلیم کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا تھا، انھوں نے صرف ونحو کے بجائے خود زبان ہی کو اصول اور زبان ہی کو اساس بنایا۔ ان کی نظر میں زبان کو فطری طریقہ سے سکھانے کا یہی صحیح طرز تھا انھوں نے محمد میاں کو اس طرز کے ذریعہ عربی دانی اور عربی نگاری کی کامیاب منزل تک پہنچا کر اپنے اصول کی کامیابی کا ثبوت فراہم کر دیا، محمد میاں کی عربی صلاحیت کی ساری اساس اسی مذکورہ بالا طرز پر ہی قائم تھی جس کی صحت وتاثیر کا خراج ان کو سارے عالم عربی سے ملا۔

محمد میاں کے فاضل والد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب جنھوں نے علوم دینیہ کی مکمل تعلیم حاصل کرنے کے بعد عصری تعلیم میں بھی نمایاں معیار سے کامیابی حاصل کی تھی، علم وتربیت کا بہت اچھا تجربہ وذوق رکھتے تھے، انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ دنیاوی نظام تعلیم مسلمانوں کے انسانی ودینی کردار وشخصیت کو ایک ضرر پہنچا دیتا ہے جس کا مکمل ازالہ زندگی بھر

نہیں ہو پاتا، اور یہ کہتے تھے کہ یہ ضرر مجھ کو بھی ہوا ہے، میں باوجود کوشش کے اب تک اس کو دور نہیں کر سکا ہوں، چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے کو جوان کے اختیار میں تھے، عصری علوم کی درس گاہوں میں نہیں بھیجا اور مادی مستقبل کی فکر سے بے نیازی اختیار کی، تعلیم کے حصول میں ان کا نقطۂ نظر علم کی فکر کا زیادہ اور سند کی پروانہ کرنے کا تھا، چنانچہ ان نظریات پر عمل انھوں نے خود اپنے بیٹے پر پورے اخلاص سے کیا، حالانکہ ایک کامیاب ایم، بی، بی ایس ڈاکٹر ہونے کے ناطے وہ بہتر سے بہتر مادی تعلیم دلا سکتے تھے، یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ مذکورہ بالا طرز عمل کی وجہ سے محمد میاں کی تعلیم بالکل نئے طریقہ سے ہوئی جس میں کسی تعلیم گاہ میں نام کے اندراج وسند کے حصول سے بالکل بے نیازی تھی، اسی طرح محمد میاں کے اخلاق ونیک نفسی میں ان کے والد کی تربیت وتوجہ کا بڑا حصہ ہے۔ متعدد خوبیاں اپنے والد سے ورثہ میں پائیں اور متعدد صفات وخصائص ان کے والد کی خصوصی تربیت کا نتیجہ ہیں۔

محمد میاں کی شعوری عمر کا بقیہ نصف حصہ ان کے فاضل یگانہ چچا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سرپرستی اور رہنمائی میں گزرا۔ انھوں نے اپنے عم معظم سے بہت سی باتیں اخذ کیں، طرز زندگی میں ان کا نمونہ اختیار کیا، تصنیف وتالیف وادب کی راہ سے دین ودعوت دین کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا۔ محمد میاں کی زندگی کے مادی تکفل کے لیے ڈاکٹری پیشہ اور طبی مشغولیت آبائی ورثہ تھا، خاندان کے بزرگ بھی ان کی معاشی زندگی کے لیے یہی راہ پسند کرتے تھے، اور اسی کو تجویز کرتے تھے، لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کس کی تجویز واصرار کو منظور نہیں کیا، بعض تعلق والوں کی ناگواری برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگئے، لیکن یہ قبول نہیں کیا، کہ وہ کوئی ایسا کام اختیار کریں جس کی مشغولیت ان کو علم وادب کی دعوتی راستہ پر گامزن ہونے سے، مانع بنے۔

محمد میاں نے اپنے عم معظم کے طریقہ کو ایسے ذوق وشوق سے اختیار کیا کہ تعبیر وزبان میں ان کے مثنّٰی بن گئے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحبؒ کی تحریر وزبان میں خواہ عربی ہو یا اردو محمد میاں کی تحریر وزبان کا جوڑ بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ فکر سے فکر تحریر سے تحریر مل

گئی ہے، ایسی یکسانیت کہیں اور نظر نہیں آتی، انھوں نے اپنے عم معظم کی جن عربی کتابوں یا مضامین کا اردو میں اور جن اردو کتابوں یا مضامین کا عربی میں ترجمہ کیا ہے لوگ یہ بتانے ہی پر مان سکے کہ وہ ترجمہ ہے ورنہ وہ اصل مصنف کی عبارت ہی سمجھی جاتی تھی اس طرح پر وہ اپنے مفکر وداعی عم معظم کے لیے بڑے اچھے معاون اور کامیاب نائب ثابت ہوئے اور ان کے دعوتی ادبی کاموں میں بڑی تقویت کا باعث بنے۔

محمد میاں کی رحلت صرف ایک ایسے بھائی یا دوست یا محبّ کی رحلت نہیں، جو کم عمری میں اس دنیا سے رخصت ہوکر دلوں کو ملول کر گیا ہو بلکہ یہ رحلت اس داعی کی ہے جو اپنی طاقتور مؤثر تحریروں سے مسلمان ذہنوں کی آبیاری کرتا تھا، وہ مسلمانوں کی ذہنی وعملی بے راہ روی کو چوٹ پہنچاتا اور صحیح ذہن واخلاق کا محل بناتا تھا، وہ ایک طرف غلط ذہنی رجحانات پر حملہ کرتا تھا دوسری طرف نوجوان مسلم نسل کے لیے فکری رہنمائی کی راہیں بناتا تھا، اس کے قلم کی جولان گاہ اردو اور عربی دونوں تھیں لیکن عالم عربی میں محمد میاں کو جو شہرت حاصل ہوئی اور وہاں ان کے مضامین کی جو قدر ہوئی وہ اردو کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عظیم ہے، محمد میاں نے ۱۹۵۵ء میں اپنے بعض دوستوں کی رفاقت میں عربی ماہنامہ ''البعث الاسلامی'' کا اجرا کیا، یہ ہند وپاک میں اپنے معیار کا پہلا عربی رسالہ تھا، پرچہ نکالنے والے کی ہمت تھی کہ عربی صحافت کے بالکل اجنبی ماحول میں اس نے ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ مندانہ اقدام کیا، وسائل کی کمی اور حالات کی ناسازگاری کے باوجود عربی صحافت کے اس پودے نے درخت بننا شروع کیا اور چند سال ہی میں محمد میاں کے مضامین کی گونج عالم عربی میں سنائی دینے لگی اور ''البعث الاسلامی'' نے جو شہرت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس پرچہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ندوہ العلماء نے اس کو اپنا ترجمان بنالیا اور آج جب کہ اس عربی ماہنامہ کی عمر کے ۳۳ سال گزر رہے ہیں اس کا روح رواں اس دنیائے فانی سے دار باقی کو رحلت کر گیا۔ ''البعث الاسلامی'' کی شہرت ومقبولیت میں ان افتتاحیوں کا بڑا دخل ہے جو محمد میاں نے ۳۳ سالہ مدت میں تحریر کیے۔ البعث میں ان کے قریبی رفیق وشریک کار مولانا

سعید الرحمٰن صاحب ندوی رہے جن پر اب البعث الاسلامی کے کام کا بار بڑھ گیا (۱) ہے۔

محمد میاں کے لکھے ہوئے مذکورہ بالا افتتاحیوں کا جو پہلا مجموعہ "الإسلام الممتحن" کے نام سے سال گزشتہ مصر سے شائع ہوا، اس نے موجودہ عالم اسلام کی مؤثر کتابوں کی صف میں ممتاز جگہ بنائی ہے، مضامین کا دوسرا مجموعہ بھی "الاسلام بین لاونعم" کے نام سے اشاعت کے لیے ناشر کے پاس بھیجا جا چکا ہے، محمد میاں نے البعث الاسلامی کے علاہ عربی پندرہ روزہ الرائد کے لیے بھی بالتسلسل مضامین لکھے جو عالم عربی میں شائع ہونے والے رسالوں اور اخباروں میں بار بار نقل کیے گئے اور ان کے اثرات وطاقت کو محسوس کیا گیا، اس اخبار کے بھی اجرا کے وقت سے محمد میاں نے اس سے دلچسپی رکھی اور معاونت کی اور اس کی ترقی وتحسین کے سلسلے میں بڑا تعاون کیا۔ الرائد میں محمد میاں صفحہ اول پر الاضواء کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے تھے جو دلچسپ اور مؤثر ہوتا تھا، انھوں نے اس کے لیے آخری بار ایک بہت اچھا اور فکر انگیز مضمون (۲) تحریر کیا تھا، جو ان کے انتقال کے بعد بلکہ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ شائع ہوا۔

اردو میں محمد میاں کے قلم کا اصل میدان ندوۃ العلماء کا پندرہ روزہ "تعمیر حیات" ترجمان بنا۔ وہ اس کے اجرا کے وقت سے عرصہ تک اس کے فعال مدیر رہے، وہ اس کو اپنے طاقتور مقالوں کے ذریعہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک مدد پہنچاتے رہے۔ "تعمیر حیات" کے علاوہ ہفت روزہ "ندائے ملت" میں بھی محمد میاں کے مضامین شائع ہوتے رہے جن سے ندائے ملت کے قارئین کو فکری واسلامی غذا ملتی رہی، اس کے لیے بھی محمد میاں نے اپنی زندگی کے آخری دن تک مضامین لکھے، ان کا آخری مضمون اس میں ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ خواتین کے رسالہ ماہنامہ "رضوان" لکھنؤ میں وہ مستقل مضمون لکھتے، اس میں ان کا طریقہ سادہ اور عام فہم ہوتا، کسی ایک آیت کو عنوان بنا کر وہ اس پر لکھتے، جو تصحیح عقیدہ اور اصلاح اعمال کے کام کے تعلق سے ایک مفید سلسلہ تھا، اس رسالے کے اجراء میں برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے ساتھ انھوں نے بھی جوش وجذبہ سے کام لیا تھا،

اور پھر اپنے تحریری تعاون سے اس کو تقویت پہنچائی تھی۔

محمد میاں کی تصنیفات اور ترجموں میں ان کی تصنیفی صلاحیت اور زبان کی خوبی نے پڑھنے والوں سے خوب داد لی، انھوں نے رائے بریلی کے سادات حسنی (تکیہ کلاں رائے بریلی) کے مورث حضرت شاہ علم اللہ حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح لکھی، جو اپنے وقت کے نہایت متبع سنت عالم تھے اور ان کا شمار مجددی شیخ حضرت سید آدم بنوریؒ کے کبار خلفاء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بانیِ ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ایک وقیع سوانح بھی مرتب کی۔ انھوں نے ندوۃ العلماء کے جشن تعلیمی کی روائداد ''رودادِ چمن'' بڑے اثر انگیز انداز میں مرتب کی جوان کے زورِ قلم اور خوبی کی ایک اچھی مثال ہے۔ ان کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں۔ ان کے ترجمے اردو سے عربی اور عربی سے اردو دونوں زبانوں میں ہوئے، ان میں سے بعض ترجمے مستقل تصنیف کی حیثیت کے مالک ہیں، تصنیف و ترجمہ ملا کر محمد میاں کی ۱۹ کتابیں ہیں۔

محمد میاں کو نوجوان مسلم نسل میں زندگی کا صحیح شعور پیدا کرنے اور ان کو دعوت اسلامی کے لیے متحد کرنے کا بے حد جذبہ تھا، اس سلسلے میں ان کا ذہن نئی اسکیمیں سوچتا جن کے بنیادی اشارے وہ اکثر صفحہ قرطاس پر بھی لے آتے، ان کے ذہن میں ایک ایسی تربیت گاہ کی بھی ضرورت ابھرتی رہتی جس کے ذریعہ نئی نسل میں صحیح دینی شعور، حقائق زندگی کا صحیح فہم، تجرباتی علوم میں امتیاز و کمال اور دعوت اسلامی کا جذبہ اور حکیمانہ مہارت پیدا کیا جانا آسان ہوا، اس سلسلے میں عربی کے پندرہ روزہ الرائد میں، ان کا آخری مضمون ''جامعۃ البعث الاسلامی'' ان کے مطمح نظر کی پوری تصویر پیش کرتا ہے، ندوۃ العلماء کی تحریک کو انھوں نے اپنی تحریروں میں بہت سراہا ہے اور اس سے بڑی توقعات قائم کی ہیں، انھوں نے اپنی کئی کتابوں میں اس کے پیغام اور کام کی وکالت اور مؤثر ترجمانی کی ہے، ان کی اس کے سلسلے میں یہ تمنا رہی کہ اس کے بانیوں کے تیار کیے ہوئے نقشہ کے وہ پہلو بھی نافذ العمل ہوں جو مختلف موانع اور دشواریوں کے باعث ابھی تک عمل میں نہیں آسکے۔

محمد میاں کے ذوق میں نفاست اور اپج تھی، ان کی نظر تنسیق و ترتیب وحسن و جمال کی طرف باآسانی پہنچتی، نئی اسکیم ترتیب دینے میں ان کا ذہن بہت اچھا چلتا تھا، ان کی یہ خوبی ان کے رفقاء اور دوستوں کو معلوم تھی چنانچہ ایسے موقوں پر ان کے مشوروں سے بہت فائدہ حاصل ہوتا تھا۔

محمد میاں نے آج سے پندرہ بیس سال قبل نوجوانوں کی دعوتی وحدت کے خاطر ایک بین الاقوامی ادارہ کی تشکیل بھی کی تھی جس کا نام انھوں نے "الرابطة الإسلامية الدولية" LCIO رکھا تھا۔ اس ادارہ نے ایک سہ لسانی پندرہ روز بھی نکالنا شروع کیا تھا جو صحیح الفکر مسلم نوجوانوں میں جذبہ یک جہتی پیدا کرنے میں اچھا ذریعہ بنا تھا۔ یہ ادارہ متعدد دشواریوں کی بنا پر زیادہ ترقی نہ کرسکا۔ اور حالات کے تقاضے نے اس کے کام میں افسردگی پیدا کردی۔

محمد میاں اخلاق ومحبت میں اپنے تمام ہم عمروں میں ممتاز اور نمایاں تھے، کسی شخص سے ان کی کشمکش یا لڑائی نہ تھی، وہ اس طرح کے کسی امکان سے بہت دور تھے، اگر کسی وقت ایسی کوئی صورت پیدا ہونے لگتی تو اس سے بہت خوبی کے ساتھ بچنے کی تدبیر اختیار کرلیتے خواہ اس سلسلے میں ان کو اپنے جائز فائدوں سے دست بردار ہونا پڑتا، بعض وقت ان کو اپنے جائز احساسات وجذبات کا خون کرنا پڑتا، یہ ان کی افتادِ طبع تھی دراصل وہ اس کے قائل تھے کہ

آسائش دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

غریبوں، حاجت مندوں کی مدد وہ اخفاء کے ساتھ کرتے رہتے حتی کہ متعدد ضرورت مندوں کی ان سے غیر محسوس طریقہ پر وابستگی ہوگئی تھی، اعزا کے ساتھ ان کا معاملہ اسلام کے صلہ رحمی کی تعلیمات کے مطابق تھا اور یہ بات انھوں نے اپنے والد اور دادا سے ورثہ میں پائی تھی اور خود ان کے عم معظم کا طرز عمل ان کے لیے نمونہ تھا، اپنے چھوٹوں کے ساتھ ایسا خاطر وشفقت کا تعلق رکھتے، جس میں بے تکلفی اور خوش طبعی کا رنگ چھایا رہتا، اور اپنے بڑوں کے ساتھ خواہ وہ ان سے دو چار سال ہی بڑے ہوں، محبت واحترام کا رویہ رکھتے

تھے، یہ احترام خشک احترام نہ ہوتا، بلکہ اس میں انس وانبساط کی آمیزش ہوتی، چنانچہ خاندان کے چھوٹے وبڑے سب ان سے خصوصی انس ومحبت ولحاظ کا معاملہ رکھتے تھے۔

محمد میاں نے بزرگوں کے واقعات اور دل میں دینی گداز پیدا کرنے والی کتابوں کا مطالعہ کچھ عرصہ سے بڑھا دیا تھا۔ اس مطالعہ سے نیز اہل دل کے پاس وقتاً فوقتاً جانے سے ان کی زندگی میں تقویٰ، مالی معاملات میں احتیاط اور لوگوں کے ساتھ غیر ضروری اختلاط سے پرہیز بڑھ گیا تھا، سخاوت کا مزاج شروع ہی سے تھا، اس نئے رنگ کے بعد مال کی بے وقعتی اور دوسرے کی مدد کا رجحان زیادہ ہوگیا تھا۔

چند سال قبل ہی سے دنیا سے بے رغبتی کا اثر غالب ہونا شروع ہوگیا تھا، اس سلسلے میں کئی سال پہلے انھوں نے لکھنؤ قیام کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کر کے اپنے بزرگوں کے وطن مالوف تکیہ کلاں رائے بریلی جا کر یکسوئی کا قیام اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن جب ان کے عم معظم، خال مخدوم ومکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان کی لکھنؤ ہی میں رہ کر اپنی دعوتی وتحریری کوششوں کو قائم رکھنے کی تاکید کی تو انھوں نے اطاعت کے جذبہ سے اپنا فیصلہ بدلا۔

محمد میاں میرے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، وہ مجھ سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے لیکن کم عمر ہی سے ان کا میرا ساتھ رہا تھا جس کی وجہ سے نیز ان کے انبساط ومحبت کے طرز کی وجہ سے میرا ان سے صرف برادرانہ ہی نہیں، بلکہ ایک طرح سے دوستانہ تعلق بھی پیدا ہو گیا تھا، پھر دینی فکر ونظر اور علمی وادبی ذوق میں توافق کی وجہ سے مزید ربط وبے تکلفی وانس قائم ہوگیا تھا۔ چنانچہ ایک نہایت مختصر بیماری کے بعد جب انتقال ہوا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ واقعہ پر کیسے یقین کیا جائے، اور کیسے اس تصور کو حقیقت مانا جائے کہ محمد میاں اب ہمارے درمیان نہیں رہے اب کیسے ہمارے فکر وذوق کی دلکش محفلیں آباد رہیں گی، اب کیسے ہماری عربی تحریر وادب کی دلچسپیاں قائم رہیں گی، اب کیسے ذوق وشوق کی تازگی باقی رہے گی، محمد میاں اپنے ہم ذوق رفقاء کے لیے شمع انجمن تھے، یہ شمع اب خاموش ہے۔ ۱۳ جون

سے ان کو پیٹ میں معمولی درد کا احساس ہوا، اس کے لیے انھوں نے دوا استعمال کی، لیکن اس درد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، ان کے خالہ زاد بھائی مولانا سید ابوبکر حسنی موجود تھے، انھوں نے مختلف معالجین سے رجوع کیا جن میں ایک ایلو پیتھک ڈاکٹر نیز حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی تھے، ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب جب سہ پہر کے وقت آئے تو ان کے اتفاق وتائید سے اسپتال لے جانا طے ہوا، تاکہ بتدریج کم ہوتی طاقت کو سنبھالنے کی کوشش کی جاسکے، اسپتال میں کوشش کی گئیں لیکن تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد شب بدھ ۱۳ جون (۱۹۷۹ء) سوا نو بجے دل کی حرکت بند ہوجانے پر وہ اس دار فانی سے دار بقاء کو رحلت کر گئے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔

محمد میاں نے اردو عربی میں مضامین اور کتابوں کی شکل میں علمی یادگار چھوڑی ہے، اسی کے ساتھ ان کی سعادت مند اولاد ان کی بڑی یادگار ہے۔ ان کے تین بیٹوں میں سے بڑے بیٹے عزیز القدر مولوی سید عبداللہ حسنی ندوۃ العلماء میں تعلیم سے فراغت حاصل کر چکے ہیں، ان کے علمی وادبی ذوق میں ان کے والد کے اثرات نمایاں ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی اولاد کو ان کا نعم البدل بنائے اور ان کی اولاد کی والدہ کو صبر وہمت اور استقامت عطا فرمائے اور دینی جدوجہد کے میدان میں ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کو دور فرمائے (آمین) (۱)

(۱) وہ اب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد حدیث اور عربی جریدہ ''الرائد'' کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں، اور اپنی عملی مشغولیات کے ساتھ دعوتی کاموں میں بھی مصروف ہیں، ان کے دونوں چھوٹے بھائی مولانا عمار محمد عبدالعلی حسنی اور مولانا بلال عبدالحی حسنی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد اب تعلیم وتدریس کا کام انجام دے رہیں ہے۔ مولانا عمار حسنی صاحب نے حفظ قرآن کی سعادت بھی حاصل کی، اور مدرسہ مظہر الاسلام بلوچپورہ لکھنؤ کے مہتمم ہیں۔ مولانا بلال صاحب اپنے تصنیفی وتحقیقی ذوق کے ساتھ دعوت وصلاح کے کام سے بھی مناسبت رکھتے ہیں، اور رائے بریلی میں رہ کر اپنی صلاحیتوں سے دوسروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں اور دارعرفات (مرکز الامام ابی الحسن الندوی) رائے بریلی کے مدیر اور مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کے نائب ناظم ہیں ان کی والدہ اہلیہ مولانا سید محمد الحسنی بھی وفات پا چکی ہیں ان کا سانحۂ وفات اپریل ۱۹۹۳ء کو پیش آیا اور مولانا محمد الحسنی کی بھی بہنیں بھی اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکیں ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کے ساتھ عفو ودرگذر کا معاملہ فرمائے اور راضی ہو۔ (م)

برادرِ معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی

یہ لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے کہ بہ یوم سہ شنبہ ۲۱ ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ مطابق ۱۶/ فروری ۱۹۸۲ء کو برادرِ معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی بانی مدیر رسالہ ''رضوان'' اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

برادرِ معظم کی عمر وفات کے وقت ۵۷ سال کی تھی اور عام خیال کے مطابق ابھی اس حادثے کی کوئی توقع نہ تھی، لیکن مقدرات کا علم صرف خدا کو ہے اور وہی اپنی مصلحتوں کو جانتا ہے اور وہ قادر مطلق اور مالک الملک ہے۔ سب مخلوقات، انس وجن اس کے بندے اور ملک ہیں اس دنیا میں سب اس کی امانت ہیں جب جس امانت کو وہ چاہے واپس لے سکتا اور لیتا ہے ایک مسلمان کو صبر ورضا بالقضا پر عمل ہونے ہی کا حکم ہے اور اس کے لیے یہی صحیح وطیرہ عمل ہے۔ فللّٰہ ما اعطی ولہ ما أخذ وکل شیئ عندہ بأجل مسمی۔

برادرِ معظم کی وفات کا سانحہ ایک اچانک پیش آنے والا اور بڑا رنجدہ واقعہ ہے اور نہ صرف قریبی عزیز بلکہ تمام متعارف اشخاص نے اس حادثہ کو بہت محسوس کیا اور برابر محسوس کر رہے ہیں، وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہماری اجتماعی وعملی زندگی کے کئی گوشوں میں اس حادثہ سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا جلد پُر ہونا دشوار ہے۔ مولانا مرحوم کے اخلاق و ہمدردی، خدمت وتعاون اور اجتماعی زندگی کے مختلف ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کی وجہ سے ایک وسیع حلقہ میں ان کو مقبولیت حاصل تھی۔ اور بہت سے کاموں کا ربط وتعلق ان سے ہو گیا تھا اور ان کاموں کی انجام دہی کی طرف سے دوسروں کو یکسوئی ہو گئی تھی۔

مولانا میرے بڑے بھائی تھے، مجھے ان کی شفقت ومحبت کا حصہ وافر حاصل تھا، وہ میرے اور میرے چھوٹے بھائی عزیزی مولوی محمد واضح حسنی ندوی سلمہٗ نیز دیگر افراد خاندان کے ساتھ ایسی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے جو ایک باپ کی محبت کے مماثل تھی۔

ہمارے والد سید رشید احمد حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جس کو ابھی صرف ۷ سال ہی گزرے ہیں کہ برادرِ معظم نے ان کی محبت وشفقت کو اپنی ذمہ داری بنالیا تھا۔اور بہت سے موقعوں پر ان سے شفقت ومحبت کی جھلک برادر معظم کے معاملہ میں ملی تھی۔ان کی شفقت ومحبت ہی کا اثر تھا کہ گھر کے سب بچے ان کو میاں کے نام سے خطاب کرتے تھے اور خاندان کا ہر ایک فرد ان کو سب کا محبّ وشفیق وہمدرد سمجھتا تھا۔

برادرِ معظم مولانا محمد ثانیؒ صاحب نے زیادہ تر تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی ۔درمیان میں ایک سال لاہور رہ کر مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔ایک سال جامعہ مظاہر العلوم میں رہ کر دورہ حدیث کیا۔اس طور پر وہ تین تعلیم گاہوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ندوۃ العلماء ،شعبہ علوم مشرقیہ لاہور یونیورسٹی اور مظاہر العلوم سہارن پور،تعلیم سے فراغت کے بعد تبلیغ و دعوت میں مسلسل کئی ماہ صرف کئے اس میں امیر جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد یوسفؒ صاحب کاندہلوی کے ساتھ مختلف تبلیغی دوروں میں رہے۔اس طرح پر ان کا تعلق نہ صرف یہ کہ دعوت وتبلیغ سے قائم ہوا بلکہ اس کام کے سربراہوں سے بھی قریبی ربط رہا،چنانچہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی وفات کے بعد ان کی صحیح اور اہم سوانح حیات بھی مولانا محمد ثانی صاحبؒ نے تیار کی۔ اس سوانح میں صرف شخصی حالات ہی نہیں ہیں بلکہ تبلیغی کام کی تاریخ وتعارف بھی آ گیا ہے،وہ تبلیغی کام میں برابر شریک ہوتے تھے وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔دینی اور اجتماعی موقعوں پر تقریر کرتے ان کی تقریریں مؤثر ہوتی تھیں۔

جامعہ مظاہر العلوم میں تعلیم کے دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی سے استفادہ وارادت کا تعلق ہوا تھا۔یہ تعلق بڑھتا رہا حتیٰ کہ حضرت شیخ نے برادر معظم مرحوم کو خلافت سے نوازا،وہ دینی زندگی میں برابر ترقی کرتے رہے،ان کی اس خصوصیت کو سب نے سراہا اور ان کو اس سلسلے میں بڑوں کا اعتماد حاصل ہوا۔انھوں نے تعلیم سے فراغت کے بعد معاش کے لیے ملازمت کے بجائے دینی کتابوں کی تجارت واشاعت کا کام اختیار کیا تھا اس کے لیے ''مکتبۂ اسلام'' کے نام سے ادارہ قائم کیا جس سے حدیث شریف کا ذخیرہ ''زادسفر''،

انبیاء علیہم السلام کے حالاتِ زندگی کے سلسلے میں بچوں کی قصص الانبیاء، دعاؤں کا مجموعہ ''دعائیں'' اور علمائے صالحین کی سوانح اولین اشاعت پانے والی کتابیں تھیں۔

بچیوں اور مسلم خواتین کی دینی تربیت کے لیے ماہنامہ ''رضوان'' نکالا جس کی ادارت خالہ صاحبہ مرحومہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ عرف ''عائشہ بی'' جو کہ ادبی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر تصنیف وتالیف کا پہلے سے ذوق رکھتی تھیں، رسالہ 'رضوان' میں معاون بنیں۔

رسالہ رضوان نے اپنے میدان کار میں بڑی خدمت انجام دی اور بیش قیمت اور مفید مضامین اور اداریئے شائع کئے اور برابر شائع کر رہا ہے۔

مولانا مرحوم کی اپنی وطن کی ذمہ داریوں نے خاص طور پر والد صاحبؒ کی وفات کے بعد خاندان کے معاملات کی انجام دہی کی ذمہ داری نے رائے بریلی زیادہ رہنے پر مجبور کیا۔ دوسری طرف ان کے صاحبزادے عزیزی سید محمد حمزہ حسنی ندوی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور صلاحیت کا ثبوت دے رہے تھے لہٰذا مکتبہ اسلام اور رسالہ ''رضوان'' دونوں کی ذمہ داریوں میں نہ صرف ہاتھ بٹانے لگے بلکہ دونوں کی باقاعدہ ذمہ داری سنبھالنے لگے اور برادر معظم رحمۃ اللہ علیہ کا لکھنؤ کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ان کا زیادہ تر قیام رائے بریلی رہنے لگا۔ اور جلد ہی رائے بریلی کے دینی وملی اسلامی اداروں اور انجمنوں میں برادر معظم کا تعاون ورہنمائی حاصل کی جانے لگی اور وہ اپنی علمی وتنظیمی صلاحیتوں سے ضلع میں دینی وعلمی کاموں کی رہنمائی اور سرپرستی کرنے لگے۔

اور اب جب کہ ضلع کے کئی دینی وعلمی حلقوں میں مولانا کی رہنمائی وسرپرستی ایک اہم ضرورت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور آئندہ کاموں کی ترقی کی سبیل نکل آئی تھی، اچانک ایک مختصر علالت کے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اور ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا جلد پُر ہونا دشوار ہے۔ مولانا رائے بریلی کے مدرسہ فلاح المسلمین واقع امین نگر تیندوا کے ناظم تھے۔ انھوں نے دوران قیام رائے بریلی میں اس کو ترقی دی اور فکر وتوجہ سے اس کو فائدہ پہونچایا۔ وہ رائے بریلی دینی تعلیمی کونسل اور رفاہی سوسائٹی رائے بریلی کے صدر تھے

اور صوبہ کی دینی تعلیمی کونسل اور مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، اور مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور کے وہ معتمد تعلیم تھے، اس کے گھر سے قریب ہونے کی وجہ سے دیکھ ریکھ کے زیادہ مواقع تھے، جس سے وہ فائدہ اٹھاتے، اور یہاں کے اساتذہ وطلبہ آپ کی شفقت وعنایت سے علمی وروحانی استفادہ کرتے۔

مولانا کی اہم تصنیفات میں سوانح مولانا محمد یوسف صاحبؒ کاندھلوی کے علاوہ مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی سوانح ''حیات خلیل'' شامل ہے۔ ان کے علاوہ سفرنامۂ حجاز، حالات حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، صادقین صادقپور اور مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حالات پر کتابچے اور اپنی خاندانی شخصیات کے حالات پر ایک ضخیم کتاب خانوادۂ علم الٰہی ہے اور بعض دیگر رسائل ومضامین کے مجموعے بھی ان کی تصنیف ہیں، جن میں بعض شائع ہوسکیں اور بعض قلمی ہیں۔

تصنیفی کام کے علاوہ مولانا ایک بڑے خوش گو شاعر تھے لیکن انھوں نے اپنی شاعری کو دعاؤں، مناجاتوں اور دینی اداروں کے لیے ترانوں پر محدود رکھا یہ مناجاتیں، دعائیں اور ترانے بڑے مؤثر اور بلیغ ہیں۔ ان کی بڑی قدردانی ہوتی ہے۔ خاص طور پر ندوہ کا ترانہ تو بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے اور مولانا کے حسن ذوق کو بہت سراہا گیا ہے۔ خاندان میں بھی برادر معظمؒ نے اپنی وسیع ہمدردی، تعاون اور محبت وصلہ رحمی سے ایک عام اور بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ اسی لیے ان کی وفات کو خاندان کا ایک بڑا خسارہ محسوس کیا گیا۔ والدہ صاحبہ مدظلہا کے لیے یہ حادثہ بڑا رنجدہ حادثہ ہے ان کو اس عمر میں اس سے جو صدمہ پہنچا، وہ محتاج بیان نہیں۔

خالِ معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے لیے بھی یہ صدمہ بڑا صدمہ ہے۔ ابھی صرف ڈھائی سال قبل مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک جواں سال اور غیر معمولی صلاحیت کے حامل بھتیجے عزیزی سید محمد الحسنیؒ نے ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا تھا اور اب یہ ایک باصلاحیت بھانجے نے توقع کی عمر سے قبل مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال کیا۔ اللہ

تعالیٰ کی مشیت میں کسی کو کیا چارہ۔

مولانا محمد ثانی صاحبؒ کو سڑک کے ایک کتے نے کھرونچے لگا دیئے تھے جس کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ زہر اندر اندر ترقی کر کے جب اپنے آثار ظاہر کرنے لگا تو علاج سود مند نہ ہو سکا۔ اور سہ شنبہ ۱۶ر فروری ۱۹۸۲ء، ۲۱ر ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ دن میں بوقت ۱۱ بجے مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور روضۂ حضرت شاہ علم اللہؒ تکیہ کلاں رائے بریلی میں ایک خاصے بڑے مجمع کی موجودگی میں اپنے عزیز بھائی محمد میاں مرحوم کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ ندوۃ العلماء میں ان کی نماز جنازہ عالم جلیل مولانا محمد منظور نعمانی نے اور رائے بریلی میں خال مکرم ومحترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی، پسماندگان میں ان کی اہلیہ دختر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ (۱) اور فرزند عزیز القدر مولوی سید محمد حمزہ حسنی سلمہ اور ایک دختر (سیدہ امامہ حسنیؒ) ہیں۔

ممانی صاحبہ مرحومہ

(اہلیہ محترمہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۸ء کو اہلیہ صاحبہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی دامت برکاتہم کا ایک طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ مرحومہ کی عمر انتقال کے وقت ۷۴ سال کی تھی۔ وہ ایک عبادت گزار، رحم دل، غریب پرور خاتون تھیں ان کے دادا حضرت شاہ سید ضیاالنبی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ایک مصلح داعی، عالم و بزرگ تھے، جن کا فیض یوپی کے مشرقی اضلاع اور اس کے آگے بھی پہنچا، جس کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ کے وہ حقیقی نانا تھے، ان کی صاحبزادی یعنی مولاناؒ کی والدہ صاحبہ سیدہ خیرالنساء بہتر صاحبہ میں بھی ان کے اثرات آئے تھے جو ان کی عبادت سبک نفسی، حسن تربیت کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

مولاناؒ کی مرحومہ اہلیہ صاحبہ اپنی انھی پھوپھی کے پاس آئیں اور ان کے عمر کے اختتام تک ان کے ساتھ رہیں جن سے انھوں نے مزید اچھے اثرات قبول کئے۔ نانا سید عبدالرزاق کلامی بھی برگزیدہ شخصیت تھے جنھوں نے واقدی کی فتوح الشام کو صمصام الاسلام کے نام سے منظوم کیا، جس کے ایک زمانے تک گھر گھر پڑھے جانے کا رواج رہا، کہ اس کے اشعار دینی حمیت وغیرت کو ابھارنے میں مہمیز کا کام دیتے تھے۔ وہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے سید حمیدالدین کے پوتے تھے اور مولانا سید عبدالعلی نصیرآبادی کے داماد تھے۔

مرحومہ کا نام سیدہ طیب النساء تھا۔ ان کو پورے خاندان میں بلکہ خاندان سے باہر بھی ننھی بی کے نام سے جانا جاتا تھا، اور ان کی تواضع، غربا پروری، عبادت گزاری اور شوق نماز

---

(۱) سیدہ خدیجہ حسنی نے بھی ۳/ اگست ۱۹۹۹ء کو دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں ستر سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کے عم معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی اور وہیں آبائی قبرستان میں مدفون ہوئیں، ممانی صاحبہ اہلیہ حضرتؒ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد ان کے گھر کے انتظام وانصرام کو وہ دیکھنے لگی تھیں، اور اس سلسلے میں خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا انھیں اعتماد حاصل تھا۔ رحمھا اللہ تعالی رحمۃ واسعۃ۔

بہت معروف تھا، نماز کے معاملہ میں تو غیر معمولی حال تھا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی فکر وانتظار، اذان کے بارے میں پہلے سے بار بار سوال، یہ ان کی ایسی عادت تھی جس سے ہر کس وناکس واقف ہوگیا تھا۔ اور دیگر خاندانی خصوصیات عبادت وتلاوت کا شوق، دعا ومناجات کا اہتمام، داد ودہش وغیرہ تھیں، عشاء کی نماز اور کھانے سے فراغت کے بعد وہ مجلس جمانے کو بہت ناپسند کرتیں، الّا یہ کہ کوئی دینی مذاکرہ ہو۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سے بیعت کا تعلق تھا۔ آخر عمر میں بھول بہت بڑھ گئی تھی، بعض وقت ایک نماز کو بھول کر کئی نماز پڑھ لیتی تھیں۔ اور بتانے پر بھی مشکل سے مانتی تھیں کہ یہ نماز ادا کر چکی ہیں۔ فضول باتوں سے احتراز، چھوٹوں پر شفقت، ایثار وسخاوت ان کے نمایاں اوصاف تھے، بعض قیمتی تحائف ان کے پاس آئے، مگر انھوں نے خود استعمال میں لانے کے بجائے دوسرے کو دینا پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حج بیت اللہ شریف کی سعادت بھی ۱۹۴۷ء میں عطا کی تھی اور مکہ معظمہ میں ایک مدت حرم شریف کی بالائی منزل پر اور مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے چند قدم کے فاصلے پر جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں قیام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔

مرحومہ کو برسہا برس سے جسمانی کمزوری اور صحت کی بعض دیگر بیماریاں تھیں ان کو اس کے دورے بھی پڑ جاتے تھے جن میں وقتی طور پر غفلت اور قلبی تکلیف ہو جاتی تھی، اور اس سے بہت کمزوری ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ مرض ان کا قدیمی مرض تھا۔ اور تقریباً لاعلاج محسوس کیا جاتا تھا۔ اس کی وقتی دوائیں وہ لیتی تھیں۔ اور وقتی فائدہ ہو جاتا تھا۔

آخر عمر میں عمومی کمزوری بے حد بڑھ گئی تھی پھر اس میں کئی بار چلتے چلتے گر گئیں چوٹیں آئیں، بالآخر ایک بار پیر کے اوپری حصہ کی ہڈی ٹوٹ گئی، اور وہی ان کی وفات کا سبب بنی۔ جنازہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور جو شریک نہیں ہو سکے، انھوں نے خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خطوط بھیج کر تعزیت کی۔ دنیا کے مختلف ملکوں سے بڑی تعداد میں خطوط آئے، اور جگہ جگہ مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت ورفع درجات کا اہتمام ہوا، اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے اور مرحومہ کے ساتھ مغفرت اور رفع درجات کا معاملہ فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

سیدہ حمیرہ صاحبہ

دختر مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلیؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء)

مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی سب سے بڑی صاحبزادی سیدہ حمیراء صاحبہ اہلیہ برادر محترم جناب سید محمد مسلم حسنی کا انتقال لکھنؤ میڈیکل کالج میں تقریباً ۲۰ روز زیر علاج رہنے کے بعد تیس ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۱/ جون ۱۹۹۴ء کو ہوا، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون ۔ اور یکم محرم الحرام ۱۴۱۵ھ کو آبائی قرستان تکیہ کلاں رائے بریلی میں مدفون ہوئیں، ان کے عم محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس طرح ان کی ۴۷ سالہ زندگی جو بہت سی خوبیوں سے مزین تھی اختتام پذیر ہوئی۔ عیدالاضحیٰ کی نصف رات گزرنے کے بعد برین ہیمرج کے صدمہ سے وہ کوما میں چلی گئیں، اس وقت یا معبود، یا معبود کے الفاظ ان کی زبان پر تھے، اور وصیت کے یہ الفاظ تھے کہ بڑوں کی عزت کرنا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، نمازوں کی پابندی کرنا (روایت سید محمود حسن سلمہٗ مرحومہ کے پوتے جو اس موقع پر موجود تھے)۔

نماز عید کے بعد ان کے عم مکرم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کو لکھنؤ کے لیے بڑی فکر و تشویش کے ساتھ رخصت کیا، جہاں وہ زیر علاج رہیں، بیچ میں کچھ افاقہ ہوا تھا مگر پھر صحت ابتر ہوگئی، اس کے بعد پھر بہتری نہ آسکی۔

مرحومہ بڑی سوجھ بوجھ، ہمدرد طبیعت، رحمدلی گوناگوں صفات اور بڑے حوصلہ وہمت کی خاتون تھیں، ان کی تربیت ان کے حوصلہ مند متدین والدین کی سرپرستی میں ہوئی تھی جس سے ان میں مذکورہ بالا صفات پیدا ہوئیں۔

ان کے والد رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے عالم دین، اور عقیدہ وعمل میں بڑے پختہ صاحب عزم انسان تھے انھوں نے دینی تعلیم پوری طرح حاصل کرنے کے بعد کالج کی تعلیم حاصل کی اور اس زمانہ میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی جب اس تعلیم کو بہت تھوڑے لوگ حاصل کرتے تھے تعلیم کا معیار بلند تھا اساتذہ عموماً انگریز یا بلند پایہ علمی مقام رکھنے والے ہندوستانی ہوتے تھے مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ نے دینی اور دنیاوی دونوں ماحول میں وقت گزارا تھا اور دونوں حلقوں سے فائدہ اٹھانے کی جو باتیں تھیں وہ حاصل کی تھیں، ان کی ان خصوصیات کا علم ان کے حالات میں لکھے گئے مضامین سے حاصل کیا جاسکتا ہے، البتہ یہاں یہ بات لکھنے کی ہے کہ ان کی تربیت کا اثر ان کی اولاد پر پوری طرح پڑا، ان کے ایک صاحبزادہ سید محمد الحسنی مرحوم تھے باقی اولاد میں صرف صاحبزادیاں ہیں جن میں سب سے بڑی سیدہ حمیراء صاحبہ تھیں، ان کے شوہر خاندان ہی کے ایک فرد سید محمد مسلم حسنی ہیں جنھوں نے یوپی گورنمنٹ میں پی ڈبلیو ڈی محکمہ میں ملازمت کی اور اس سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے صاحبزادگان میں سید حسن حسنی، سید حسین حسنی اور ڈاکٹر سید احمد حسنی ندوی ہیں، تینوں صاحبزادگان اخلاق ودینداری میں معروف ہیں، آخر الذکر طبیب اور رائے بریلی میں میڈیکل آفیسر ہیں اور ثانی الذکر دہلی کے سعودی سفارتخانہ میں ملازم ہیں اور اول الذکر لکھنؤ میں دواؤں کی فرم رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو صاحبزادیاں ہیں، جو مولوی سید احمد علی ندوی ٹونکی اور سید محمد ابوعاصم حسوی کو منسوب ہوئیں۔

مرحومہ نے اپنے بچوں کی تربیت اچھے ڈھنگ سے کی جس کے اثرات ان کے سب صاحبزادگان اور صاحبزادیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بڑوں کی عزت واحترام اور چھوٹوں پر شفقت، غریبوں کا خیال، مہمانوں کی ضیافت کا انھیں بڑا خیال رہتا تھا، اس کے ساتھ رشتہ داریوں کا پاس اور پڑوسیوں کا لحاظ رکھنے والی خاتون تھیں۔

وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی بھتیجی تھیں، اور بحیثیت

بڑی بھتیجی کے حضرت مولانا کو ان سے اچھا ربط و تعلق رہا، چنانچہ ان کی علالت سے حضرت مولانا کو بڑی تشویش ہوئی اور انتقال سے صدمہ ہوا۔

مرحومہ کے انتقال سے حضرت مولانا کے علاوہ خاندان کے چند در چند افراد کو خصوصی صدمہ پہنچا کیونکہ مرحومہ سے حقیقی رشتے خاصے افراد سے تھے ان کی چار بہنیں ہیں جن کی اولاد کی وہ بڑی خالہ تھیں بھائی مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کے تینوں عالم بیٹوں کی حقیقی پھوپھی تھیں، ان کے علاوہ متعدد افراد کی حقیقی چچی تھیں، اس طرح وہ اپنے انتقال سے ایک وسیع کنبہ کو سوگوار بنا گئیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور کوتاہیوں کو معاف کرے۔ (آمین)

رفیقۂ حیات (سیدہ رقیہ بی)

سیدہ رقیہ بی بنت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو کہ میری رفیقۂ حیات تھیں، وہ اپنے میں چوتھے نمبر پر تھیں اور ۱۳۳۱ھ میں ان کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے تعلیم اپنے گھر ہی پر حاصل کی تھی، ان کو اور ان کے بہن بھائی کو ایک بزرگ وداعی شخص مولوی عبداللہ صاحب پڑھانے کے لیے گھر آتے تھے، وہ اور ان کی بہنیں اپنی کم عمری کے زمانے میں ان سے تعلیم حاصل کرتی تھیں، اور کچھ بڑی ہونے کے بعد اپنے والد بزرگوار سے عربی اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، اور اس طریقے سے ضروری علمی صلاحیت پیدا کی، ان کے والد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور چچا مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی مربیانہ وعلمی شخصیت ہونے کی صورت میں ان کے زیر تربیت گھر کا ماحول علمی اور دینی تھا، جس کا فائدہ ان کو اور ان کی بہنوں اور بھائی کو حاصل ہوا۔ ان سے تین بہنیں بڑی اور ایک چھوٹی تھیں اور آخر میں ایک بھائی تھے، سید محمد الحسنی مرحوم، جنھوں نے علمی لحاظ سے امتیاز حاصل کیا، اور دعوت وفکر اسلامی کے موضوع سے ان کی تحریروں نے خراج تحسین حاصل کیا، ان کی عربی اور اردو دونوں تحریریں اپنی اپنی جگہ پر اہل زبان کی تحریروں سے کم نہیں تھیں، بلکہ امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔

رقیہ بی کا ذہن اور فہم کو اس علمی ودینی ماحول سے بڑی مدد حاصل ہوئی، اور اچھے ذوق کی تشکیل ہوئی۔ انھوں نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اپنے ہی دائرے کے اندر محدود رہتے ہوئے شعر گوئی بھی کی، اور مضمون نگاری بھی کی، ان کے کئی مضامین اس وقت کے دینی پرچوں میں شائع بھی ہوئے، جو اصلاحی نقطۂ نظر کے حامل تھے، اور اچھے اسلوب میں تھے، شادی ہوجانے کے بعد گھریلو مشغولیت کی وجہ سے انھوں نے مضمون نگاری کی طرف توجہ کم کردی، پھر بھی ''رضوان'' لکھنؤ میں ان کے مضامین شائع ہوتے، جسے ان کے گھر کے ہی افراد نکال رہے تھے۔ ان کا یہ ذوق ان کے چھوٹوں میں بھی منتقل ہوا، انھوں نے مفید مطالعے کا سلسلہ برابر جاری رکھا، اور دعوتی، فکری، تاریخی مضامین اور کتابوں کے

مطالعے کے ساتھ وہ گہرے علمی مضامین ومقالات کا بھی مطالعہ کرتیں، اور حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھتیں اور اس سلسلے کا بھی مطالعہ کرتیں، اور یہ مطالعہ برائے مطالعہ نہ ہوتا، بلکہ وہ اچھے نقطۂ نظر حاصل کرنے کا فائدہ اٹھاتیں، پھر ان مسائل ومباحث پر گفتگو کے دوران ان کا اظہار رائے بہت اچھا ہوتا تھا، تعلیم کے موضوع پر اور احساس کمتری کے اسباب اور اس کے علاج پر ان کے طاقتور مضمون شائع ہوئے، جو ''رضوان'' میں شائع بھی ہوئے۔ مطالعے کے سلسلے میں وہ اپنے چھوٹوں کو مشورہ دیتیں، ان کے ایک چھوٹے اموی وعباسی تاریخ کا زیادہ مطالعہ کررہے تھے ان کو انھوں نے حدیث وسیرت کے مطالعے کی ترغیب دی، کیوں کہ ابتدائی نقوش سیرت کے ہی پڑنے چاہیے، اس سے زندگی کا صحیح رخ متعین ہوتا ہے۔

مطالعے کے ساتھ وہ دعا ومناجات میں بھی خاصا وقت صرف کرتیں، اور اولاد کی تربیت اور گھر کے معاملات سے دلچسپی رکھتیں۔ ان کو اپنے بھائی اور بہنوں اور ان کی اولاد سے بڑا تعلق تھا، اخلاق وہمدردی کا اچھا جذبہ تھا، جس کا تجربہ ملنے والوں اور تعلق رکھنے والوں اور تعلق والوں کو ہوتا رہتا تھا، حقیقت پسندی، ہمدردی، تعاون کا جذبہ انھوں نے اپنے والد سے ورثہ میں پایا تھا کہ ان کے والد ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اس صفت میں بہت بڑھے ہوئے تھے، وہ جذبات سے زیادہ حقیقت پسندی اور دینی ہدایات کو ترجیح دیتے تھے، کم گو تھے، لیکن عملی انسان تھے، حالات سے واقف ہونے اور سمجھنے کی ان کو خاص توجہ اور خاص فضلاجیت تھی، اور وہ حالات صرف اپنے ماحول کے نہیں بلکہ پوری عالم اسلام کے جاننے کی فکر رکھتے تھے، اور ان حالات میں کچھ کرنے کا تقاضا ہوتا اس کی طرف بھی توجہ کرتے، چنانچہ مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ کو اپنی گنجایش کے بقدر مالی مدد بھیجتے، اور عالم عربی کے دوسرے حالات میں جو فکرمندی اور مشورہ ان کے اختیار میں ہوتا وہ کرتے تھے، اور ان کی اس دلچسپی میں ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی پوری طرح بلکہ عملی طور پر شریک تھے، انھوں نے اسلامی ضرورتوں کے تحت چندے کا موقع آنے پر چندہ بھجوانے کا نظم کیا، اور اس میں اپنی صاحبزادیوں کو بھی رغبت دلائی اور ان کو بھی شریک کیا، اس طریقے سے ان کی صاحبزادیاں اور صاحبزادے مسلمانوں کے مسائل سمجھنے اور اپنی اپنی حد

تک فکر کرنے میں متوجہ رہتے تھے، اسی ماحول میں رقیہ بی کا بھی نشو ونما ہوا، انھوں نے اس کے اثرات اپنے میں جذب کیے تھے، جو ان کی گفتگو اور مضامین سے ظاہر ہوتے تھے۔ انھوں نے طبیعت میں نرمی اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھا، اور خاندان کے لوگوں اور ملنے والوں کے قابل مشورہ معاملات میں اپنے مشوروں سے تعاون بھی کیا، جس میں ان کی سمجھداری اور خوش اخلاقی کا پورا اظہار ہوتا تھا۔

اپنے گھر میں انھوں نے شروع میں اپنے والدین کی اور پھر جب شادی ہوگی تو اپنی ساس کی بڑی خدمت کی اور ان کی محبت وشفقت حاصل کی اور دعائیں لیں۔

میرے ساتھ ان کا تعلق ۳۳ سال پر محیط رہا، اسلامی اصول کے مطابق تھا اور انھوں نے شوہر بیوی کے درمیان جو بہتر انداز اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے رکھا گیا ہے ہمیشہ اختیار کیا، اور ان معاملات میں جو ان کے سامنے آتے، ان کا مفید مشورہ ہمیں حاصل ہوتا، اور ان سے وہ تقویت حاصل ہوئی، جس کی ان جیسے رفیقۂ حیات سے توقع کی جاسکتی تھی۔ ان کو آخر میں پیروں کی تکلیف نے مریض کر دیا تھا، اور اس کی دواؤں کے اثر سے معدے کو بھی نقصان پہنچا تھا، جو آخر میں اتنا بڑھ گیا، جو علاج کے باوجود دور نہیں ہوسکا، اور ان کی رحلت کا مقرر وقت ان کی ۶۴ سال کی عمر میں آ گیا، اور وہ یادیں چھوڑ کر آخرت کی طرف رحلت کر گئیں، ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کی ۱۸/ تاریخ تھی۔

اپنی والدہ زہریٰ بی بنت مولانا سید ابوالقاسم حسینی ہسویؒ اور بڑی بہن سیدہ حمیرہ حسنی کے قریب آبائی قبرستان تکیہ کلاں رائے میں مسجد کے شمال مغربی جانب مدفون ہوئیں۔ نماز جنازہ ان کے چچا خال معظم مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کے مرتبے بلند کرے اور خصوصی مغفرت وراحت واسعہ کا معاملہ فرمائے۔ انھوں نے اپنے پیچھے تین بچیاں میمونہ، آمنہ، ہاجرہ چھوڑیں، جو بالترتیب مولوی محمد حمزہ حسنی، مولوی عبداللہ حسنی اور مولوی جعفر سلمہم کے منسوب ہیں۔ بارک اللہ فیہم۔

والدہ ماجدہ سیدہ امۃ العزیزؒ صاحبہ

سیدہ امۃ اللہ العزیز صاحبہ جو مشہور مورخ اور عالم دین مولانا حکیم سید عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی بڑی صاحب زادی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی بڑی بہن تھیں، مورخہ ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ کی شب میں سینے کی تکلیف کے نتیجہ میں انتقال فرما گئیں، "انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

والدہ مرحومہ بڑی خلیق، ملنسار اور ہر ایک کے لیے خواہ عزیز ہو خواہ مہمان ہو خوش اخلاقی اور محبت و تعلق کا برتاؤ کرنے والی تھیں، خاندان کے بڑے چھوٹے ان سے مل کر خوش ہوتے اور ان کی ملاقات سے قوت محسوس کرتے اور ان کی دعا حاصل کر کے اطمینان قلب حاصل کرتے۔

مرحومہ کی تربیت ایسے گھر میں ہوئی تھی جس میں ان کے والد والدہ بڑے بھائی ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ اور چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دونوں صالح بزرگ کا درجہ رکھتے تھے، ان سے اوپر ان کے نانا مولانا شاہ ضیاء النبی صاحبؒ اور مولانا حکیم فخر الدین صاحب اپنے وقت کے بزرگوں میں تھے۔ ان کی والدہ صاحبہ سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ ممتاز خصوصیات و نیک صفات کی حامل تھیں، ایک طرف وہ عبادت و نیک عملی میں دوسری طرف ہنر مندی اور عملی صلاحیت میں، تیسری طرف علم دوستی و ادبی صلاحیت میں امتیازی خصوصیات رکھتی تھیں دین و دنیا کی سمجھ اور حسن عمل ان میں جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے ایک طرف بچیوں کی اصلاح و تربیت پر کتاب حسن معاشرت تحریر کی جس میں بچیوں کے لیے کردار و اخلاق، دینداری، حسن سیرت و ہنر مندی کے سبق دیئے، دوسری کتاب "ذائقہ" میں گھریلو کاموں کے سلسلے میں مختلف و متنوع کھانوں کے طریقے بتائے، دوسری طرف دعا و مناجات پر مؤثر نظمیں کہیں جو "باب رحمت" کے نام سے کتاب کی صورت میں شائع ہوئیں۔ جس کے پر

اثر اشعار پسند کیے گئے انھوں نے اپنے صاحبزادے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کی بہت توجہ وفکر مندی سے تربیت کی، اپنے فرزند کے لیے انھوں نے جو فکر مندی، توجہ اور دعا کی اس کے اثرات حضرت مولانا کی حسن سیرت واخلاق بزرگی و دینداری، اخلاص وجذبہ عمل، دین کی سربلندی اور امت اسلامیہ کی صلاح وفلاح کے لیے دردمندی، وفکر مندی میں دیکھا جاسکتا ہے، وہ خود بزرگ تھیں اور بزرگ باپ حضرت شاہ ضیاء النبی حسنیؒ کی صاحبزادی تھیں۔ زیر تذکرہ امۃ العزیز صاحبہ ان کی بڑی بیٹی تھیں، بیٹی شادی سے قبل اپنی ماں کی خصوصی تربیت و نگہداشت میں رہتی ہے لہٰذا امۃ العزیز صاحبہ کو ان کی تربیت کا حصہ وافر ملا، جو ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں تھا اور اس کا مشاہدہ ہر اس شخص نے کیا جو امۃ اللہ العزیز صاحبہ سے ملا اور ان کا کردار اور اخلاق دیکھا۔

امۃ العزیز صاحبہ سے مل کر ہر عزیز یہ سمجھتا تھا کہ شاید موصوفہ کی شفقت اس کے ساتھ سب سے زیادہ ہے، اور عزیز تو عزیز ملازماؤں پر بھی اس طرح شفقت کرتیں جس طرح کوئی دوسرا شخص عزیزوں اور تعلق والوں کے ساتھ کرتا ہے۔

دینی حیثیت سے امۃ العزیز صاحبہ نماز وتلاوت سے خصوصی شغف رکھتی تھیں، مختلف نمازوں کے علاوہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں کے پڑھنے کا بھی معمول تھا اور جب تک بصارت صحیح رہی تلاوت قرآن سے خاص اشتغال رہتا تھا، اپنی اولاد واحفاد کے ساتھ ان کی محبت اور ان کی راحت وصحت کی فکر بہت بڑھی ہوئی تھی، ان کی ذرا سی تکلیف وبیماری ان کے لیے بہت شاق اور تکلیف دہ ہوتی اور وہ ایسی فکر مند ہوجاتیں کی بیمار کو خجالت ہونے لگتی، اسی طرح وہ اپنی اولاد واحفاد کے لیے پوری توجہ قلبی کے ساتھ دعائیں مانگتیں، ان کی فکر زیادہ تر ان کی دینی ترقی وکامیابی صلاح ونیک شہرت کی رہتی، مال ودولت اور دنیاوی منافع کا زیادہ حصول ان کی نظر میں ترجیحی بات نہ تھی۔ ان کو اپنے ماں باپ کے گھر میں اسی طرح کی تربیت بھی ملی تھی، اپنی اولاد سے بہت زیادہ محبت کرنے کے باوجود ان کے کسی غلط کام میں پڑجانے پر بہت سخت انداز اختیار کرلیتیں، کسی کے ساتھ زیادتی

کرنے یا بڑوں کی اطاعت میں کوتاہی کرنے پر رحم ومحبت کا جذبہ ظاہر نہ ہوتا اور کوئی عزیز کسی غلطی پر ان کو تنبیہ کرتا تو اس پر ذرا ناپسندیدگی ظاہر نہ کرتیں، بعض مرتبہ ان کے کسی بیٹے کو اس کے معلم نے اس طرح مارا کہ زخم ہوگا لیکن انھوں نے ذرا بھی ناگواری ظاہر ہونے نہ دی بلکہ اس کو تربیت کی مصلحت میں سمجھا۔

انھوں نے اپنے بچوں کی تربیت اعلیٰ قدروں پر کرنے کی کوشش کی اور ان کے مستقبل کی کامیابی کے لیے اپنی زندگی کو بے راحت رکھا اور اپنے آرام کو نظر انداز کیا، وہ اس گھرانے سے جس میں علم دین اور دین کی فضا ہر طرف قائم تھی شادی کر کے اس گھر میں آئی تھیں، جہاں زمین داری تھی اور زمینداری کے اثر سے دنیاوی ترقی کی فکر نظر انداز نہیں کی جاتی تھی، جہاں ان کے لڑکوں کے لیے دنیاوی تعلیم کی راہیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کے ہم چشموں میں اسی کا رواج بھی تھا لیکن امۃ العزیز صاحبہ نے اپنے لڑکوں کو اس راہ پر چلنے نہیں دیا اور اس کے برخلاف اپنے عالم دین وفاضل بھائیوں کے سپرد کیا جہاں ان کو دینی تعلیم ہی کی لائن پر چلنا پڑا، یہ وہ دور تھا کہ دینی تعلیم کی طرف جانے والے کو دنیاوی لحاظ سے بالکل ناکام اور دنیاوی وسائل سے محروم ہو جانے والا سمجھا جاتا تھا، یہ دنیاوی لحاظ سے وہ قربانی تھی جو ایک شفیق ماں آسانی سے نہیں دے سکتی ...لیکن امۃ العزیز صاحبہ نے نہ صرف یہ کہ یہ قربانی دی بلکہ اس پر وہ تاحیات چلیں اور مسرور رہیں، ان کے لیے سہولت کی بات یہ بھی رہی کہ ان کے شوہر بچوں کے والد سید رشید احمد صاحب نے اس میں ان کا ساتھ دیا اور اپنے ہم چشموں اور عزیزوں کے بچوں کے برخلاف اپنے بچوں کو خالص دینی علم کی راہ پر جانے دیا۔ وہ دونوں ایک ہی نانا نانی کے نواسے تھے۔

امۃ العزیز صاحبہ کی زندگی کا آغاز مطالعہ وعلم دوستی سے ہوا تھا اور ان کی تحریری صلاحیت بھی تھی اور شوق علمی تھا، ان کی شادی کم عمری میں اور قدرے مختلف مزاج میں ہوئی یہ ان کے لیے اپنے علمی وادبی مذاق میں تبدیلی لانے والی بات بھی تھی لیکن انھوں نے اپنے والد والدہ کے انتخاب کو خوشی سے قبول کیا، اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس کے فرائض

وذمہ داریوں کو بحسن وخوبی پورا کیا، انھوں نے اس سلسلے میں ادائیگی حقوق میں اعلیٰ معیار قائم کیا اور بے نفسی کی مثال قائم کی۔

وہ کھانے پینے میں رہنے سہنے میں ذوق و پسند میں اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دینے والی تھیں اس میں ان کا ایثار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مرغوب غذا اور پسندیدہ لباس ان کے لیے فکر وخواہش کا مرکز نہ بن سکا بلکہ دوسرے کے مقابلہ میں کمتر اور دوسروں کی راحت و پسند ان کا مزاج بن گیا، اچھی چیز حاصل ہونے پر ان کی کوشش ہوتی کہ وہ اپنے عزیز وقریب کو دے دیں یا اس سے استعمال کرا کے پرانا کرالیں، غریبوں کے ساتھ حسن سلوک بہت بڑھا ہوا تھا۔ گھر کی خادمہ اور پڑوس کے غریبوں تک کے لیے بڑی فکر رکھتیں کہ ان کا دل نہ دکھے بلکہ آرام ملے۔ حسب استطاعت مدد کرتی رہتیں اور کھانے کے سلسلے میں خیال رکھتیں کہ ان کو ان کا حصہ فراخی سے ملے، وہ اولاً اپنا تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں دوسرے سے مدد نہیں لیتی تھیں حتیٰ کہ اپنی اولاد واحفاد سے بھی مدد نہیں لیتی تھیں بلکہ ان کے کام خود کر دیتی تھیں جب تک ان کی صحت وقوت رہی مہمانوں کی خاطر، گھر والوں کی راحت کے لیے خود آگے آجاتیں اور مطبخ کا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھیں، چنانچہ کھانے کے اچھے اقسام تیار کرنے کی ان کو مہارت ہوگئی تھی وہ ایسے کھانے تیار کرتیں، لیکن ان کے ایثار پسندی کا حال یہ تھا کہ لذیذ کھانے وہ خود نہیں کھاتی تھیں عموماً عام کھانے پر اکتفا کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ ہم کو یہی کھانا اچھا لگتا ہے۔

کوئی عزیز دور سے آتا تو بہت زیادہ پذیرائی کرتی تھیں دعوت یا تحفہ سے خاطر کرتیں، اور وہیں کا عزیز ہوتا تو تواضع چائے سے یا کسی لذیذ چیز سے کرتی تھیں، عزیز بچوں سے ایسے اخلاق کا معاملہ کرتیں جس میں ان کے اور خود ان کے لڑکوں کے ساتھ کئے جانے والے معاملہ سے فرق نہ ہوتا، یہ نہ معلوم ہوتا کہ بیٹا کون ہے اور بھانجہ بھتیجہ کون ہے، حالانکہ دونوں کا فرق دل کے اندر مخفی ہوتا، اور بیٹوں سے بہت زیادہ محبت دل کے اندر مخفی ہوتی جو علاحدگی میں ظاہر ہوتی اور ان کے سفر کی صورت اور غیر موجودگی کے دنوں میں

عیاں ہوجاتی اوران کی فکرمندی اوردل کے کبیدہ رہنے کی شکل میں ظاہر ہوتی، اپنے بچوں کے سفراوردوری کوان کی تعلیم اورخیرطلبی کی خاطر گوارہ کرتیں۔

ان کواپنی اولاد میں سے کئی کے انتقال کاغم سہنا پڑا، دوکا چھوٹی عمر میں اورایک جو سب سے بڑے بیٹے تھے اورانھوں نے ۲۱ رسال کی عمر میں عین جوانی کی حالت میں انتقال کیا تھا وہ ان کے لیے غم کا پہاڑ تھا لیکن یہ سمجھ کر کہ شریعت میں آواز نکالنا منع ہے اف نہیں کیا اگرچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں بعد برداشت سے باہر ہوجانے کی وجہ سے دورے پڑنے لگے جو دیکھنے پر جان لیوا قسم کے معلوم ہوتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اوردیگر بیٹوں کے بتدریج بڑے ہونے سے وہ دورے بتدریج کم ہوتے گئے اور بالآخر ختم ہوئے، ان کواپنی زندگی کے آغاز میں اپنے والد کے انتقال کاغم سہنا پڑا تھا اس وقت ان کی عمر آغازِ جوانی کی یعنی ۱۷ سال کی تھی، پھر بڑی عمر میں اپنے بڑے بھائی پھر والدہ اور پھر اپنی چھوٹی بہن پھر شوہر کا انتقال دیکھنا پڑا ان سب غموں کو انھوں نے پورے صبر ورضا بالقضاء کے ساتھ جھیلا، پھر اپنے ایک بھتیجے مولانا محمد الحسنی پھر اپنے بڑے بیٹے مولانا محمد ثانی حسنی کا انتقال دیکھا جو ۵۶ سال کی عمر میں ہوا وہ بڑے بیٹے ہونے کے ناطے اپنے والدین کے اصل معاون اور گھر کے منتظم تھے، یہ بڑا سخت صدمہ تھا۔ سب نے محسوس کیا لیکن انھوں نے اف نہیں کیا خاموشی سے اس غم کو جھیلا، تب سے وہ دعا مانگتی تھیں کہ وہ اپنے چھوٹوں کو زندہ چھوڑ کر جائیں اور کسی کا غم نہ دیکھیں، انھوں نے اپنے مذکورہ بالا دوسرے بیٹے کے انتقال کے ۱۴ سال بعد اس دنیا سے خود سفر آخرت اختیار کیا اور اپنے نہ رہنے کا غم دوسروں کے لیے چھوڑ گئیں۔

امۃ العزیز صاحبہ اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر مولانا سید عبدالعلی حسنی صاحب سے ۱۳ سال چھوٹی اور چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ۸ سال بڑی تھیں۔ عمر میں اس فرق کی وجہ سے ان کے چھوٹے بھائی کو اپنے بچپنے میں اپنی والدہ کی شفقت کے ساتھ اپنی

ان بڑی بہن کی شفقت بھی ملی جس کا سلسلہ بعد میں بڑی قربت کی شکل میں قائم رہا اور والدہ کے انتقال کے بعد ان کی شفقت ومحبت کو والدہ کی شفقت ومحبت ہی محسوس کی، اور مولانا مدظلہ کا اپنے دیگر مشفق بڑوں کے انتقال کر جانے کے بعد اپنی ان بزرگ بہن سے ربط مزید بڑھ گیا تھا، اور وہ اپنے سفروں سے جلد واپسی کا تقاضا ان کی وجہ سے محسوس کرتے تھے اور وہ بھی تقاضہ کرتی رہتی تھیں کہ سفر سے جلد واپس ہوں، عموماً سفر کے آغاز پر وہ کہتی تھیں کہ جلد واپس آنا اور انتظار کرتی تھیں اور ان کے وطن میں قیام سے خوش اور مانوس ہوتی تھیں اور وہ بھی ان کے پاس روزانہ تھوڑا وقت بیٹھتے تھے، ان کا یہ معمول دن میں دو بار کا تھا کہ وہ اپنے مشاغل میں سے اس کے لیے وقت فارغ کرتے اور اس معمول میں فرق نہ آنے دیتے، اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو پاتا تو دوسرے وقت اس کی تلافی کرتے، اسی لیے ان کے انتقال کو مولانا مدظلہ نے بہت محسوس کیا اور ان کو یہ خیال ہوا کہ ان کے مشفق بڑوں میں صرف ایک شخصیت رہ گئی تھی اور اب وہ بھی جاتی رہی۔ رحمها الله تعالى رحمة واسعة و غفرلهامغفرة تامة و اكرم منزلها عنده

والدہ مرحومہ محترمہ کے لیے یہ سعادت اور خوش قسمت کی بات رہی کہ انتقال کے وقت زبان پر بلند آواز سے ''اللہ اللہ'' کا لفظ جاری تھا اور یہ کہ ان کا انتقال رمضان کی ۲۳ ویں شب میں ہوا جس کے شب قدر ہونے کا پورا احتمال ہے، رات کے ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان کا وقت رہا ہوگا، اور یہ کہ انتقال کے وقت ان کے دل سے قریب رہنے والے افراد یعنی بیٹے، پوتے، پوتیاں اور عزیز بزرگ چھوٹے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قریب تھے اور ان کو ان کے قریب ہونے کا انس حاصل تھا، مولانا مدظلہ نے ان کی مقبولیت کے آثار محسوس کر کے اس خاص متعلقین کے سامنے اظہار بھی فرمایا، رمضان کا وقت گزارنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت قریب کی مسجد میں تھی جنھوں نے ان کو آخری کاندھا دیا اور نماز کے بعد آخری آرام گاہ تک دعاؤں کے ساتھ پہنچایا پھر بہت سے واقفین

نے رمضان کی تلاوتوں سے ایصال ثواب کیا، اللہ تعالیٰ ان کے لیے ان سب کا حصہ وافر منظور ومقرر فرمائے۔ (آمین)

نماز جنازہ ان کے بڑی محبت کرنے والے بھائی جن سے ان کو اپنی اولاد سے زیادہ محبت تھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے پڑھائی اور اپنے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کے پہلو حظیرہ حضرت شاہ علم اللہؒ میں سپرد خاک ہوئیں ہجری تقویم کے اعتبار سے ۹۳ سال کی عمر پائی۔

سیدہ فاطمہ بی مرحومہ

عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی کی والدہ سیدہ فاطمہ بنت ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی حسنیؒ ایک صالح خاتون تھیں، وہ اپنی نیک صفت واخلاق کی بنا پر اپنے خاندان میں سب کے حسن ظن اور تعریف کی مستحق رہیں۔ انھوں نے لکھنؤ میں ۷۱ رسال کی عمر میں ۱۱ رنومبر ۱۹۹۸ء کو اس دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت کی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

سیدہ فاطمہ نے ایک قابل تعریف زندگی گزاری اور ۷۱ رسال کی عمر پائی۔ جہاں تک میرا علم ہے کسی نے ان کی برائی نہیں کی اور نہ ان کے کسی طرز عمل پر تنقید کی، انھوں نے بے نفسی اور سب کی فکر اور خدمت اور مفید اور پسندیدہ کاموں سے دلچسپی رکھی۔ کسی کی برائی اور کسی کی مخالفت یا کسی کے ساتھ برا سلوک کرنا ان کے متعلق کبھی سننے میں نہیں آیا۔

ان کو اپنے ماں باپ کی خدمت کا طویل زمانہ ملا، اور انھوں نے اس خدمت کے ذریعہ اپنے والدین کی خوشنودی حاصل کی، ان کے والد مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ دو اہم خصوصیات کے مالک تھے، ایک تو دینداری اور دین کی دنیا پر ترجیح، اور دوسرے اصول وضابطہ کا پورا لحاظ کرنا اس کے ساتھ علمی لحاظ سے انھوں نے جدید وقدیم دونوں لائنوں میں تفوق حاصل کیا، زندگی کے طور وطریق میں اسلامی پابندی ان کی خاص صفت تھی، طب میں اچھی شہرت حاصل کی، دینی علم میں امتیاز اور عصری علم میں تفوق کو اچھے انداز میں جمع کیا تھا، طب کے دائرہ میں تینوں طریقوں یعنی ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی اور طب یونانی پر یکساں عبور رکھتے تھے، بہت عملی آدمی تھے، انھوں نے اپنے اسی مزاج کے مطابق اپنی اولاد کی تربیت کی جس کا اثر ان کی اولاد میں آیا۔ عملی طور پر ان کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ صاحبہ میں اس کا اثر ظاہر ہونے کا طویل موقع ملا، اور اس میں خود ان کے فطری مزاج سے اس تربیت کو مزید تقویت پہنچی، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ

علیہ کا طرز یہ تھا کہ جو کام آدمی خود کرسکتا ہے اس کو خود کرنا چاہئے، گھر کے کاموں میں ملازمین پر سارا بوجھ ڈال دینا ان کے نزدیک صحیح نہیں تھا۔ اپنی صاحبزادیوں پر گھر کے انتظام وانصرام کے ساتھ ضرورتوں کی انجام دہی کا بھی بوجھ ڈالتے تھے، اور یہ بات سیدہ فاطمہ کے حصہ میں اچھی خاصی آئی تھی، حتیٰ کہ وہ کام جو گھر سے باہر کرائے جاتے ہیں، ان میں بھی ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ یہ پسند کرتے تھے، کہ ان کا جو حصہ گھر میں انجام پاسکے وہ کچھ نہ کچھ گھر میں بھی انجام پائے، اور یہ کہ اس کی مشق نئی نسل کو ہونا چاہئے، حتیٰ کہ ایک بار بطور تجربہ ''شیروانی'' بھی اپنی ان صاحبزادی سے سلوائی۔ اور کہا کہ اگر کرتہ پائجامہ سیا جاسکتا ہے تو شیروانی بھی سی جاسکتی ہے، کسی سلی ہوئی شیروانی کو دیکھ کر اس کے نمونے پر تیار کی جاسکتی ہے، جو شیروانی انھوں نے ان سے سلوائی۔ ان میں بعض فنی خوبیاں کم تھیں، لیکن اچھی خاصی شیروانی انھوں نے تیار کردی، خود ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی طالب علمانہ زندگی میں اس طرح کے کام تجربۃً کبھی کبھی کر چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آدمی کو ہر چیز میں دوسروں کا دست نگر نہیں ہونا چاہئے، ایک طرف تو وہ اس قدر انتظامی اور عملی تھے، دوسری طرف اچھے کاموں کے بڑے قدرداں، اور ان کے سلسلے میں بڑے فیاض اور اہل حقوق کے حقوق فراخ دلی کے ساتھ ادا کرنے والے تھے، ان کے اعزہ بے تکلف لکھنؤ آمد پر ان کے یہاں آتے اور قیام کرتے، اور وہ نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ معاملہ کرتے اور اس کو دینی فریضہ سمجھتے، ان کی خاطر داری میں ان کی صاحبزادیاں اپنا فریضہ انجام دیتیں۔ سیدہ فاطمہ مرحومہ کو اس کا موقع نسبتاً دوسری صاحبزادیوں کے زیادہ ملا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادہ برادر عزیز مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کو علم دین کی اعلیٰ تعلیم دلائی بشمول سید فاطمہ صاحبہ کے تمام صاحبزادیوں کی بھی ضروری تعلیم دی، جس میں دینی پہلو غالب تھا، ان کو ان کی ابتدائی عمروں میں شہر کے ایک مولوی صاحب تعلیم دینے آتے تھے، جنھوں نے قرآن مجید کا ناظرہ اور اردو وغیرہ کی تعلیم دی۔ ذرا بڑی ہونے پر ان کے والد صاحب بزرگوار نے خود تعلیم دی، اور قرآن مجید کو بامعانی پڑھایا، چنانچہ قرآن مجید کے شروع کے پاروں کی عربی ان کو باقاعدہ پڑھائی اور

ان کا ترجمہ پڑھایا، اور دینی کتابوں کے مطالعہ پر ان کو ڈالا۔ چنانچہ ایک خاتون کے لیے جتنا علم مطلوب ہوتا ہے وہ ان کو حاصل ہوا، اور اس کی بنیاد پر ان صاحبزادیوں کو اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ دینے میں مدد ملی۔

مرحومہ نے اپنے بچوں کی تربیت محبت اور نرم خوئی کے ساتھ انجام دی۔ اس میں سختی کے تقاضے جب پیدا ہوئے تو ان کو عموماً اپنے خاوند پر چھوڑنا پڑے وہ خود اس کے نرم پہلو پر اکتفا کرتی تھیں، لیکن اس میں عزم ہوتا تھا، اور ضروری دائرے کے اندر رکھ کر معاملہ کرتی تھیں۔

مرحومہ نے اپنے خاوند کے حق کی ادائیگی بھی برابر اچھے انداز میں کی اور اس طرح کمالِ موانست و یکجہتی کے ساتھ زمانہ گذرا۔

ازدواجی زندگی شروع ہونے سے قبل کتابوں کا مطالعہ ان کا مرغوب مشغلہ تھا، لیکن بال بچوں کی زندگی شروع ہوجانے کے بعد زیادہ مطالعہ میں مشغولیت ان کے لیے قابل عمل نہ رہ سکی ،لیکن پھر بھی اس سے ربط قائم رکھا، اور حسب گنجائش وقت مطالعہ جاری رکھا۔

مرحومہ کی ازدواجی زندگی شروع ہونے میں کسی قدر دیر لگی، اس کی وجہ سے بھی ان کو والدین کی خدمت کا زیادہ موقع ملا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا نظریہ یہ تھا کہ ان کو ایسے داماد ملیں جو دین کی پابندی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے دینی و علمی نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہوں خواہ ان کی معاشی حالت زیادہ اچھی نہ ہو حالانکہ ڈاکٹر صاحب ایک کامیاب ایلوپیتھک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشحالی کے مناسب معیار پر تھے اور ایسے میں عام طور پر آدمی اسی معیار کو اپنے دامادوں کے لیے پسند کرتا ہے لیکن دین کے غلبہ کی وجہ سے ان کا عمل حدیث شریف کی ہدایت پر تھا، کہ رشتہ میں دین کو اہمیت دینی چاہئے، ڈاکٹر صاحب کی نظر انتخاب اپنی ان صاحبزادی کے لیے منصور پور ضلع مظفرنگر کے ایک شریف خانوادہ کے ایک عالم دین نوجوان مولانا سید محمد طاہر حسینی صاحب پر پڑی اور ان سے ان کا رشتہ قرار پایا۔ جو اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بھی بہت اچھا ثابت ہوا، کہ اس کے ذریعہ ان دونوں کا پورا گھر علم و دین اور خدمت علم و دین کا گھر بنا، مولانا سید محمد طاہر حسینی منصور پوری حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب علیہما الرحمۃ سے عقیدت و ارادت کا قریبی ربط رکھتے

تھے، بعد میں حضرت شیخ الحدیثؒ سے خلافت واجازت بھی پائی، ان کو فراغت تعلیم کے بعد علم دین کی خدمت کا تدریس وانتظام دونوں طریقہ سے طویل موقع ملا، اللہ تعالیٰ ان کو درازی عمر عطا فرمائے۔ وہ تاحال ندوۃ العلماء کے شعبۂ مالیات کے منتظم کی حیثیت سے دفتر نظامت کے ناظر عام کے عہدہ پر کام کررہے ہیں، اوران کے تینوں صاحبزادے الگ الگ دینی مدرسوں میں استاد کی حیثیت سے کام رہے ہیں، جن میں بڑے بیٹے عزیز القدر مولوی سلمان حسینی سلمہ نے دعوتی وتعلیمی صلاحیتوں میں شہرت عام بھی حاصل کی اور وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر وحدیث کے استاد بھی ہیں۔

سیدہ فاطمہ مرحومہ میری حقیقی ماموں زاد بہن تھیں اور مجھ سے عمر میں دو سال بڑی تھیں، اس لیے مجھے بچپن میں ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اور مجھے اسی وقت سے ان کی خوش اخلاقی اور سب کی خدمت اور سب کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ نظر آیا اور مجھے کوئی ایسی بات ان میں نہیں ملی کہ جس پر وہ ہدف ملامت بنتیں۔ خاموش طبیعت عملی زندگی اور سب سے انس وربط، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت ان کا طریقہ تھا، چنانچہ ان کی وفات کو خاندان کا ایک بڑا خسارہ محسوس کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات کو بلند فرمائے اوران کی نیکیوں کو قبول فرمائے، اور کوتاہیاں جو ہوئی ہوں جن سے کوئی انسان خالی نہیں ہوتا ان کو معاف فرمائے۔ اور خاندان کے چھوٹوں کو ان کی خوبیاں اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مرحومہ کی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں کثیر مجمع کو ان کے چچا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے پڑھائی اور تکیہ کلاں رائے بریلی میں جہاں انہیں سپرد خاک ہونا تھا، ان کی دوسری نماز جنازہ ان کے بڑے بیٹے مولوی سید سلمان حسینی نے پڑھائی اور وہ اپنی بہنوں کے پاس مدفون ہوئیں۔ رحمہا اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ واخلہا فی جنات النعیم

پسماندگان میں مولوی سید سلمان حسینی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے علاوہ دو دیگر بیٹے مولوی سید اسحاق حسینی اور سید صہیب حسینی جوندوے کے فاضل اور عربی مدرسوں میں استاذ ہیں، اور ایک صاحبزادی جو ڈاکٹر سید احمد حسنی ندوی کی اہلیہ ہیں چھوڑیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر کی ایک ممتاز اور غیر معمولی شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزار کر بیسویں صدی کے اختتام پر اس دنیا سے رخصت ہوئے، جمعہ کا مبارک دن اور ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کی تاریخ تھی، ۱۹۹۹ء کا آخری دن اس طرح ان کی وفات پر یہ صدی اختتام کے قریب پہنچی، اس صدی کو برصغیر کی تاریخ میں گزشتہ صدیوں پر یہ امتیاز حاصل رہا کہ اس میں یورپ کے جدید ترقی یافتہ تمدن سے برصغیر کو سابقہ پڑا جس نے اس کی تمدنی واخلاقی قدروں پر خاصا اثر ڈالا، دوسری طرف غیر ملکی اقتدار کی چیرہ دستیوں اور حق تلفیوں کے ردعمل کے طور پر جذبۂ حریت کو فروغ ہوا، جس سے یہاں انقلاب کی راہ ہموار ہوئی، اور اس کے نتیجے میں پورا برصغیر اپنے پرانے دور سے نکل کر نئے دور میں داخل ہوا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا نشو ونما اور ذہن کی تشکیل ان خاص حالات میں ہوئی، اور انھوں نے حالات کو دیکھا اور سمجھا پھر اسلامی نقطۂ نظر سے ان کو دیکھا، وہ ایسے حالات کو سمجھنے اور ان میں مثبت وتعمیری رویہ اختیار کرنے کے سلسلے میں اعلیٰ خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ اسلام کے مدوجزر کا اچھا مطالعہ کیا تھا، انھوں نے سادہ دل مشرق اور شاطر وہوشیار مغرب کی کشاکش کو دیکھا اور سمجھا، اور غیر ملکی اقتدار کے دور کے ختم کرنے کی کوششوں کا بھی مشاہدہ کیا، اور ان سے دلچسپی لی، پھر آزادی کا دور شروع ہونے پر انقلاب کے بعد کے مراحل کو بھی دیکھا اور اس کی پیچیدگیوں اور زندگی کی قدروں پر ان کے اثرات دیکھے، پھر ایک عالم دین اور ایک حساس دل رکھنے والے

دانشور، اور ایک داعی حق اور ملت اسلامیہ کے دردمند فرزند کی حیثیت سے وقت کے تقاضوں کو سمجھنے اور اعلیٰ قدروں کی حامل زندگی کو استوار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے عملی میدان میں داخل ہوئے، اور اپنے فکر وعمل سے ۶۵ سال سے زیادہ مدت تک ایک عظیم مفکر، معلم اور مصلح کی ذمہ داری انجام دی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ممتاز وسنجیدہ شخصیت کیسے بنی، اس کا جواب خود ان کی شخصیت کی تشکیل میں کارفرما عوامل واسباب میں ملتا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ اور علم وثقافت سے گہری واقفیت رکھنے والے عالم دین اور مصنف تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک بڑے دینی وعلمی ادارے (ندوۃ العلماء) کے سربراہ بھی تھے، ان کا جب انتقال ہوا تو ان کے ان صاحبزادے کی عمر صرف ۹ سال کی تھی، لہٰذا ان کو اپنے ان کم عمر صاحبزادے کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ موقع نہیں ملا، لیکن ان کے چھوڑے ہوئے اثرات سے اور ان کے سمجھ دار وذمہ دار پسماندگان سے اس کا مداوا ہوا، ان کے بڑے بیٹے مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو دینی تعلیم مکمل کر کے عصری تعلیم کے مراحل بھی پورے کر رہے تھے اور ان کی عالی ہمت اور دین دار اہلیہ یعنی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ، پھر وہ قیمتی سرمایۂ کتب جو اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے جو گھر کے اندر موجود تھا اور جس میں خود ان کی غیر معمولی خصوصیت کی حامل تصنیفات تھیں، ان کے ان صاحبزادے کی تربیت کا ایک اچھا ذریعہ بنیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد سے ملے ہوئے ذوق مطالعہ کے اثر سے اپنے گھر کے اندر موجود سرمایۂ علمی سے آغاز عمر ہی میں اور خاص طور پر اردو ادب اور اخلاق وسیرت کے دائرے میں خوب استفادہ کیا، پھر فکری ودعوتی مزاج کی تشکیل کے سلسلے میں ان کے بڑے بھائی نے پوری توجہ کی، وہ قدیم وجدید دونوں علمی راہوں سے گزرے تھے، وہ دینی وعلمی درس گاہ سے فضیلت کر کے جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور سائنس میں B.S.C. کی امتیازی کامیابی حاصل کر کے (M.B.B.S.) کے کورس کی تکمیل کی تھی، اور اس کے اور میڈیکل پریکٹس کے ذریعے سماجی

زندگی کے معاملات اور اسلامی تقاضوں سے بخوبی واقف ہوئے تھے۔ وہ اسلامی سربلندی کے داعی اور اسلامی قدروں پر پورا اعتماد رکھتے تھے، چنانچہ اپنے نوخیز بھائی کی بہتر تعلیم نیز اخلاقی و دینی تربیت پر انھوں نے اور والدہ صاحبہ نے پوری توجہ صرف کی، والدہ صاحبہ اپنے مؤقر شوہر کے جلد انتقال کر جانے کی وجہ سے اپنی اولاد کو سنوارنے اور بنانے پر ساری توجہ مرکوز رکھنا ضروری سمجھتی تھیں، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھریلو سرمایۂ علم وادب کے مطالعے اور اپنی والدہ اور بھائی کی رہنمائی وتربیت سے آگے بڑھے تو ان کو علم وادب کے دیگر پہلوؤں میں کمال پیدا کرنے کے لیے وقت کے مشہور اساتذہ ملے، خاص طور پر حدیث شریف تفسیر قرآن اور ادب عربی میں ان کو امتیازی شان پیدا کرنے کے ذرائع حاصل ہوئے، تاریخ کے موضوع میں نمایاں صلاحیت خود اپنے گھر کے سرمایۂ علمی کے ذریعے اور علمی رجحان اپنے خصوصی ماحول سے حاصل ہو چکا تھا، اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دینی ذوق کے اثر سے باطنی اصلاح وتزکیۂ نفس کی طرف میلان ہوا، جس کے حصول اور اس میں ترقی کے میں وقت کے مشہور ومستند بزرگوں کی صحبت واستفادے کے ذریعے آسانی ہوئی۔

ان تمام اسباب نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو متعدد ومتنوع کمالات وخصوصیات کا حامل انسان بنادیا، وہ ایک طرف ممتاز مفکر ومصلح، دوسری طرف کامیاب معلم ومربی، اور تیسری طرف بااثر صاحب قلم اور صاحب اسلوب ادیب ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال کے اسباب کو سمجھا، ہندوستان کے غلامانہ دور کی پریشانیوں وپسماندگی کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ نئی حاصل ہونے والی آزادی کے بعد کی پیچیدگیوں نیز فرقہ وارنہ وطبقاتی کشمکش کے دل سوز مناظر دیکھ کر ملک وقوم کو بربادی سے بچانے کے جذبہ کے حامل بنے۔ علوم دینیہ میں دستگاہ پیدا ہونے سے مسلمانوں کی فلاح وصلاح کی مفید صورتوں سے آگاہ ہوئے اور اس کے لیے قدیم وجدید وسائل کا مفید اور صالح طریقۂ کار اخذ کیا۔

تصنیف وذوق ادبی کے ذریعہ ذہنوں کو بیدار کرنے اور ترقی وکامرانی کی صحیح راہ

دکھانے کی صلاحیت سے کام لینے کی کوشش کی، اور اپنی زندگی کو مفید اور تربیتی کاموں میں وقف کر دیا۔

اس سلسلے میں مولاناؒ نے دو خاص صفتوں کو حرزِ جان بنایا: ایک تو قوم وملت کی خیر خواہی وخیر طلبی، اور دوسرے زہد وقناعت کے ساتھ حصول مقصد کے لیے لگن اور قربانی، اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی نرمی، کریمانہ اخلاق، والہانہ جذبۂ عمل، فہم وفراست اور مقصد کی بلندی جیسی ممتاز صفات مولاناؒ کی خصوصیات بنیں، اپنی انھی صلاحیتوں سے انھوں نے متعدد اہم ترین مسائل حل کئے اور قوم کے دانشوروں اور رہبروں کو متأثر کیا، اور اپنوں اور غیروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی، انھوں نے عالمانہ وقار اور داعیانہ کردار کے ساتھ مثالی زندگی گزاری۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں دو نمایاں صفتیں خاص طور پر قابل ذکر رہی ہیں: ایک تو ممکنہ حد تک وسعت قلبی۔ دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز، وسعت قلبی کا تو یہ حال تھا کہ دین وملت کی تعمیر میں حصہ لینے والے تمام لوگوں کے لیے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے، اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے، ان سے ملتے اور اظہار قدر کرتے تھے، بشرطیکہ وہ دین وملت کی بنیادی قدروں اور مسلمہ اصولوں کے خلاف کام نہ کر رہے ہوں، چنانچہ فقہی مسلک کا اختلاف، مکتب فکر کا فرق یا طریقۂ کار کا تنوع مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں دوری اور ٹکراؤ کا سبب نہ تھا، بشرطیکہ اس کا کام اصل دین، اور ملت کی تقویت کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو، اسی قاعدہ کے بموجب مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اور جامعہ سلفیہ بنارس، اسی طرح جمعیت علماء ہند، جماعت اسلامی وغیرہ سب کو ان کی تعمیری اور ملی کوششوں اور دین حق کی نصرت کے زاویہ سے دیکھا، اور ان کے لیے اظہار قدر کیا، ان کے ذمہ داروں سے اخوت وہمدردی کا معاملہ رکھا اور حسب ضرورت تعاون کیا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز رہی ہے،

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ صفت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص مولاناؒ کی تحقیر وتنقیص کرتا تو بھی مولاناؒ اس کا جواب نہ دیتے، اور اپنے معاونین ومحبین کو بھی ہدایت کرتے کہ وہ کوئی انتقامی رویہ اختیار نہ کریں، اور ان سے ایسا آدمی ملتا تو وہ اس سے اس بات کی شکایت بھی نہ کرتے، بلکہ شرافت نفس کے ساتھ معاملہ کرتے، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مولاناؒ کو تنقیص وتحقیر کے رویہ سے تکلیف نہیں ہوتی تھی، وہ حساس طبیعت تھے، ان کو ایسی بات سے تکلیف ضرور ہوتی تھی، لیکن انھوں نے اپنا وطیرہ برداشت اور رواداری کا رکھا، وہ یہ شعر پڑھتے تھے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است

با دوستاں تلطف، با دشمناں مدارا

دوسروں کا برا چاہنا یا انتقام لینا مولاناؒ کے یہاں بالکل نہ تھا بلکہ وہ دوسروں کی عیب جوئی سے بھی دور رہتے تھے، جن کو برا سمجھتے تھے بلا ضرورت ان کی برائی کا بھی تذکرہ نہیں کرتے تھے، حتی کہ ان کے خدام کو بعض وقت یہ دھوکا ہو جاتا تھا کہ مولانا اپنے فلاں مخالف کے بارے میں بالکل ناواقف ہیں اور اس سے اس ناواقفیت میں دھوکا کھا سکتے ہیں، لیکن کسی نے توجہ دلائی تو اندازہ ہوا کہ مولانا بے خبر نہیں ہیں لیکن ظاہر نہیں کرتے۔ مولاناؒ کے اس رویہ کے نتیجے میں ان سے متعدد دوری رکھنے والے ان کا محبت ہی کا رویہ دیکھ کر بالآخر ان سے قریب ہوئے۔

مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت دین وملت کی خدمت ودفاع کا جذبہ تھا، وہ کسی کو بھی دین وملت کو نقصان پہنچاتے دیکھتے یا دین کے مسلمہ حقائق یا دین کے بنیادی حقوق پر حملہ آور ہوتا دیکھتے تو اس کا سخت نوٹس لیتے تھے، اور اس میں کسی کی پروا نہیں کرتے تھے، اس کی مثالیں ان کے مختلف مضامین اور تصنیفات میں بآسانی دیکھی جا سکتی ہیں، انھوں نے عربوں کے ساتھ عقیدت ومحبت کے باوجود عرب قومیت کی مخالفت بلکہ سخت تردید کی، اور ترک قوم کے کارناموں کی وجہ سے ان کی قدر ومحبت رکھنے کے باوجود موجودہ ترک حکمرانوں کے الحادی رویہ کی سخت مذمت کی، اور اپنی اسی غیرت دینی کے تقاضے سے

حسب ضرورت اپنی زبان وقلم کو مؤثر ڈھنگ سے استعمال کیا۔انھوں نے ہندوستان میں اسلامی ثقافت کو غیر اسلامی ثقافت میں مدغم کرنے کی کوششوں کی کھل کر مخالفت کی، اور اس سلسلے میں تقریریں کیں اور مضامین لکھے، اور اس ملک میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کے بسے ہونے کے ناطے اس بات کی تحریک چلائی کہ تمام مذاہب کو اپنے اپنے طریقے سے کام کرنے کا موقع ملے، اور اکثریت اپنی اکثریت کی بنیاد پر اقلیت پر اپنے مذہب وتہذیب کو عائد نہ کرے، اور سب شریف پڑوسی کی طرح زندگی گزاریں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملت اسلامیہ کی سماجی تعلیمی اور سیاسی ضرورتوں اور تقاضوں پر ان کی اہمیت کے مطابق نظر رکھتے تھے، اور کام کرنے والوں کے مابین طریقۂ کار اور نقطہ ہائے نظر کا جو فرق ہوتا اس کو اختلاف اور کشمکش کا موضوع نہ بناتے ہوئے اپنا ضروری تعاون دیتے تھے، ان کا مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل سے تو ذمہ دارانہ بلکہ سرپرستانہ تعلق تھا، لیکن اس کے ساتھ وہ جمعیۃ علماء ہند، مسلم لیگ، و دیگر قومی کام کرنے والی جماعتوں کی مثبت اور لائق ستائش کوششوں کی بھی پوری قدر کرتے تھے، تعلیمی تحریکات میں، دینی تعلیم کی درس گاہوں کے علاوہ جن سے ان کا گہرا ربط تھا، ملت کی عصری درس گاہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ کی بھی اہمیت وضرورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی مشکلات کے حل کے لیے جو ادبی واخلاقی تعاون دے سکتے تھے وہ دیتے تھے، ان کی نظر میں ملت کی بقا وحفاظت وترقی کی ضروری فکر کرنا مشترک فریضہ تھا، اس کے لیے اپنے جماعتی ونظریاتی اختلافات سے بلند ہوکر کام کرنے کی ضرورت سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تھے، اور اس کے لیے ان کے اختیار میں جو تعاون ہوسکتا تھا وہ دیتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں ان پر متفق ہوجایا کرتی تھیں، اور اپنے آپس کے اختلاف وفرق کے باوجود ان کو اپنا مشترک ہمدرد اور مشیر سمجھتی تھیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مختلف النوع ومتعدد الفکر گروہوں کے ساتھ تعاون وتائید کا یہ مطلب نہیں ہوتا تھا کہ ان کی خود کوئی الگ رائے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ محض ملت کی بقا اور

ترقی کی مصلحت کی خاطر چھوٹی اور انفرادی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے بڑی مصلحت کے لیے ہمدردی وتعاون کرتے تھے ورنہ وہ ہر مسئلے میں اپنی متعین رائے رکھتے تھے، غلط اور منحرف رجحانات کے ساتھ کوئی لوچ نہیں رکھتے تھے، اور یہ بات ان کی تقریروں اور تصنیفات میں پوری طرح عیاں ہے، پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خدمت دین وملت کا دائرہ صرف ہندوستان اور برصغیر تک محدود نہیں تھا، بلکہ پورے عالم اسلام تک پھیل گیا تھا، وہ مشرق میں ملیشیا وانڈونیشیا تک اور مغرب میں افغانستان، ایران ترکی، مصر، الجزائر اور مراکش تک تھا، یورپ وامریکہ میں مقیم مسلمانوں کی سوسائٹیاں تک مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر وعمل کے دائرے میں تھیں، وہ جہاں جس تعاون کا تقاضہ سمجھتے اس کے کرنے کی کوشش کرتے، اور جہاں کمزوری اور انحراف محسوس کرتے وہاں اصلاح وتنقید کی اپنی آواز پہنچاتے، اور صحیح اسلام اور ملت کی صحیح مصلحت کی پاسداری کی طرف توجہ دلانے کا جرأت مندانہ کام انجام دیتے تھے، اس کے لیے عوام میں عمومی خطاب کا، اور حکومت کے ذمہ داروں کے لیے ملاقات وافہام وتفہیم کا طریقہ اختیار کرتے، مولاناؒ نے دینی وملی خدمت کے لیے اپنا جو مزاج بنایا تھا اس میں مخاطب کے لیے اس کے مقام وحیثیت کے لحاظ سے جو اسلوب کلام مناسب ہوتا اور اس کا جو اچھا کام ہوتا اس کے لحاظ اور اس کے اعتراف کے ساتھ بات کرتے، لیکن اس سے کہنے والی بات زوردار طریقہ سے کہہ دیتے، تنقید ہوتی لیکن انداز محبانہ ومشفقانہ ہوتا، چنانچہ ان کی تلخ بات بھی برداشت کر لی جاتی، اس سلسلے میں ان کو اپنے ملک کی چوٹی کے لیڈروں سے اور غیر ممالک کے سربراہانِ مملکت سے بات کرنے کے جو مواقع حاصل ہوئے انھوں نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا، اور استغنا کے ساتھ اور یہ محسوس کراتے ہوئے بات کی کہ ان کی کوئی مادی غرض نہیں ہے، اور یہ محض خیر خواہی میں ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل ان کی خودنوشت سوانح اور ان کے مضامین اور سفرناموں میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مولاناؒ کا یہ عمل غیر معمولی انداز کا ہوتا تھا، میں نے خود کئی ایسے موقعے دیکھے کہ جہاں رواداری اور تنقید کو جمع کرنا خاصا دشوار تھا لیکن مولاناؒ ان سے حکمت اور جرأت کے

ساتھ عہدہ برآ ہوئے۔

مولاناؒ عرب اور مسلم حاکموں اور بادشاہوں سے ملے، ان میں ہر ایک کو نصیحت کی اور ان کے ملک کی خرابیوں کی طرف متوجہ کیا، خاص طور پر وہ سعودی بادشاہوں سے ملے، اردن کے بادشاہ اور مراکش کے بادشاہ اور مختلف حاکموں سے ملے، سب کو اصلاح حال اور ملک کی خدمت کی اور اعلائے کلمۃ اللہ کی تلقین کی، ان ملاقاتوں اور بااثر لوگوں سے اپنی ملاقاتوں میں اپنے نجی معاملے میں پورے استغنا سے کام لیا، کبھی اپنی ذات یا خاندان کے کسی فرد کے لیے سفارش نہیں کی اور نہ ہدیہ قبول کیا، اور اگر کسی طرح ہدیہ یا انعام ملا تو اس کو ملی و دینی مقاصد کے اداروں کو دے دیا، اسی طرح فیصل ایوارڈ کے معاملے میں کیا اور ملی اداروں کو دے دیا، دبی سے ملنے والی ایک کروڑ ۱۲ لاکھ کی رقم سیکڑوں مدارس میں تقسیم کر دی، برونائی سے ملنے والی رقم بھی دوسروں میں تقسیم کر دی، اسی طرح جنرل ضیاء الحق شہید کے دور صدارت میں حکومت پاکستان نے ایک لاکھ کی ایک رقم کا علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی پر ان کے مقدمہ کے تعلق سے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں اعلان کیا تو اس رقم کو بھی انہوں نے خود وصول نہیں کیا اور دوسروں میں تقسیم کی ہدایت کر دی۔

ان کا یہ استغنا اس لیے نہیں تھا کہ ان کو رقم کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ان کو بعض وقت خاصی تنگی پیش آتی تھی تب بھی یہی کرتے تھے، کہتے تھے کہ ہم اگر کسی حاکم سے کچھ لیں گے تو ممنون ہوں گے، پھر جرأت کے ساتھ نصیحت یا تنقید نہ کر سکیں گے، چنانچہ ان کو جرأت سے بات کرنے میں ڈر نہیں لگتا تھا، لیکن حکمت و دعوت کے تقاضے سے خوش اخلاقی جتنی ضروری تھی وہ کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے سماجی و ملی کاموں میں طریقۂ نبوت پر عامل ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ مخاطب سے اس کی زبان اور فہم کے مطابق بات کی جائے، اور مخلصانہ و ہمدردانہ انداز میں اور اصل مرض کو سامنے رکھتے ہوئے معالجانہ جذبہ سے بات کی جائے۔

قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے پیغام حق پہنچانے کا جو تذکرہ آیا ہے اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں جو تفصیل ملتی ہے انھوں نے اس کو اپنے لیے مشعل راہ بنایا، نیز تاریخ میں اہل ایمان وعزیمت و مصلحین امت کے جو تذکرے ملتے ہیں ان سے اخذ فیض کیا، اور طریقۂ کار کے اس تنوع کو بھی سمجھا جو مختلف زمانوں اور مختلف ماحولوں اور مختلف حالات میں مصلحین امت نے اختیار کئے، اس میں مولاناؒ کے سامنے امام احمد بن حنبلؒ کا کلمۂ حق پر جمنا اور سخت آزمائش اور اذیت کے باوجود حق پر قائم رہنا، امام غزالیؒ کا علم میں کمال پیدا کرنے کے ساتھ اصلاح باطن اور روحانی ترقی کی فکر کرنا اور اس کی اہمیت کی تلقین کرنا، امام ابن تیمیہؒ کا دین کی بنیادی قدروں کی وضاحت کے ساتھ سماجی خرابیوں اور بددینی کا اپنی تصنیفات کے ذریعے مقابلہ کرنا، اور دین کی صحیح فکر کی ترجمانی کرنا، مولانا جلال الدین رومیؒ کا حکیمانہ و مصلحانہ انداز کا ناصحانہ و مربیانہ کلام، حضرت مجدد الف ثانیؒ کا توحید پر زور اور حاکمانِ وقت کی بالواسطہ ناصحانہ انداز میں اصلاح حال کی کوشش، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی روحانی و مصلحانہ زندگی اور حکیمانہ انداز تربیت و اصلاح، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سماجی و تہذیبی بگاڑ اور سیاسی بدحالی کے دور میں حکیمانہ طریقہ سے اصلاح حال کی کوشش اور تعلیم و تربیت کے نظام کی درستگی، اور رہنمائی کا کام، پھر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کی اصلاح عقیدہ و عمل کے ساتھ ہجرت و جہاد کے عمل کو قائم کرنے کی کوشش شامل ہے۔ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے طریقۂ دعوت و عمل سے بہت متاثر تھے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ناصحانہ و مشفقانہ طرز دعوت کو دیکھ کر بعض ناقدروں نے کمزوری اور جذبہ جہاد سے دوری کا شبہ کیا ہے حالانکہ یہ مولانا کی حکمت پسندی اور افادیت کے خیال سے ہوتا تھا، وہ جہاد کو اہم فریضہ سمجھتے تھے لیکن شریعت نے اس کے لیے موقع و محل کی رعایت اور حکمت عملی کا جو قاعدہ مقرر کیا ہے اس کا لحاظ ضروری سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا نے مذکورۃ الصدر سب اسلاف سے استفادہ کیا تھا اور موجودہ زندگی کے ان گوشوں میں جو مذکورہ بالا ائمۂ امت کے یہاں ملتے ہیں، اپنے طریقہ کار کے لیے رہنمائی

حاصل کی تھی اس سلسلے میں ان کی مثال شہد کی مکھی کی طرح رہی جو ہر طرح کے پھولوں سے اپنی ضرورت کا رس لیتی اور شہد بناتی ہے، جو دوسروں کے کام آتا ہے۔ اس کے جسم میں ڈنک بھی ہوتا ہے جو کہ وہ اس وقت استعمال کرتی ہے جب اس کو تنگ کیا جائے، اور رکاوٹ ڈالی جائے، لیکن اس بات میں مولاناؒ قدرے مختلف تھے، وہ حتی الوسع انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس کے بار بار مواقع آئے کہ مولاناؒ کو جواب دینا چاہئے تھا، لیکن مولاناؒ نے صبر اور خاموشی کو ترجیح دی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی فکر بلند، معاملہ فہمی اور حق شناسی سے اور اسی کے ساتھ انحراف وگمراہی کے خطرات کو جلد محسوس کرتے ہوئے اپنی علمی صلاحیت اور داعیانہ طریقۂ کار کو مؤثر زبان وقلم کے ذریعہ بروئے کار لاتے، وہ ان کے ذریعے اصلاح حال اور تلقین وتربیت کا کام لیتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے امت اسلامیہ کی مجموعی وبنیادی مصلحت اور امت اسلامیہ کی وحدت واتفاق کی اہمیت برابر رہتی تھی، خواہ وہ فکر صحیح کی ترویج ہو، انحراف وگمراہی کا مقابلہ ہو، امت کے اتحاد وسربلندی کا معاملہ ہو، یا دشمنانِ ملت کی گمراہ کن ریشہ دوانی کا مقابلہ ہو یا امت مسلمہ کو اس کے ماضی کے بلند مقام پر واپس لانے کا معاملہ ہو، مولانا رحمۃ اللہ علیہ ان سب کاموں کے لیے کوشاں رہتے تھے، اور ان میں اپنی عقلی وعملی توانائیاں صرف کرتے تھے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ملک وبیرونِ ملک کے متعدد اداروں کے صدر یا ناظم اعلیٰ تھے ان کو عموماً ان کی شخصیت کے وزن کی وجہ سے اور خدمت دین وملت میں گروہی اختلاف سے ان کے بلند ہونے کی بنا پر اعلیٰ منصب دیئے گئے، ان متعلقہ اداروں نے ان کے زیر سرکردگی متعدد اہم کامیابیاں حاصل کیں، اور بڑی ترقی کی، اس میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مخصوص حکمت عملی اور مخلصانہ فکرمندی کا خاصا دخل تھا، اداروں اور اجتماعی وحدتوں کی سربراہی کے فرائض انجام دینے میں مولاناؒ کا رویہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں اور خصوصی معاونین پر عموماً اعتماد واختیار کا ہوتا تھا، وہ اپنے جس معاون کی کارکردگی کو مقصد کے مطابق اور مخلصانہ محسوس کرتے، اس کو اس کی سمجھ اور معاملہ فہمی کے مطابق کام کرنے کا پورا موقع دیتے، اور اس کام کے کسی جز میں اس سے کوئی غلطی ہو جاتی تو اس کو برداشت کرتے، اور صرف متوجہ کر دینے پر

اکتفا کرتے، لیکن اپنے معاون کے کام کے سلسلے میں اس بات پر پوری نظر رکھتے تھے، کہ کام صحیح راستہ سے ہٹ نہ جائے، اور مقصد کے خلاف نہ ہو، اس سلسلے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خود اپنے خاصے تجربے سے یہ سمجھ لیا تھا، کہ ان کے متعدد ومتنوع کاموں میں کس کام میں کون بہتر اور کارگزار اور زیادہ قابل اعتماد معاون ہے، پھر اس کو نہ صرف یہ کہ اس کام کا ذمہ دار بلکہ اس کام میں اپنا ترجمان بنا لیتے تھے، چنانچہ مولاناؒ کے مختلف کاموں اور منصوبوں میں مختلف معاونین رہے، جن کو ان کے متعلقہ کاموں میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے خاصا اعتماد حاصل رہتا تھا، وہ بھی اپنے متعلقہ کام کے مزاج اور حکمت عملی کے سلسلے میں کوئی معاملہ ہوتا تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرتا، اور رہنمائی حاصل کرتا، لیکن جزوی اور عمومی معاملات میں اس کو اپنی صواب دید پر عمل کرنے کی آزادی ہوتی تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے فکر وعمل کے دائرے میں ندوۃ العلماء کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا کے دور نظامت میں اس ادارہ کو بہت نوازا، اور اس کی شہرت، اور اہمیت پورے عالم اسلام میں تسلیم کر لی گئی، اس کا دائرۂ کار بہت وسیع ہوا، اور اس کے شعبوں اور شاخوں کی تعداد خاصی بڑھی، ظاہری ترقی کے ساتھ باطنی ترقی بھی خوب ہوئی، اس سب میں ایک طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے معاونین کا بڑا حصہ ہے، اور دوسری طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس فکرمندی کو کہ ادارہ اپنی خصوصیت اور معنویت اور اپنے مقام ومنصب سے ہٹنے نہ پائے، بڑا دخل ہے، وہ وقتاً فوقتاً ذمہ داروں کو خطاب فرماتے، طلباء کو وقتاً فوقتاً نصیحت کرتے، اور صالح اور بلند کردار کی طرف متوجہ کرتے، اس سلسلے میں ان کی تقریریں بڑی مؤثر اور دل پر اثر کرنے والی ہوتیں، وہ اپنے ماتحت اہم ذمہ داروں سے وقتاً فوقتاً دریافت کرتے کہ کام کی مقدار اور رفتار کیا ہے، اہم اور فیصلہ طلب معاملات میں رہنمائی کرتے، لیکن یہ سب ایسے محبانہ رویہ کے ساتھ ہوتا، کہ کام کرنے والوں کا دل بڑھتا، اور ان کے جذبہ میں ترقی ہوتی، ندوۃ العلماء کے دائرے میں نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندوی ان کے سب سے بڑے معتمد رہے، اور ان کی فکر وتوجہ کا ندوۃ العلماء کی ان ترقیات

میں جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے دور نظامت میں ہوئیں بڑا دخل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی فکر مندیوں اور محنتوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے، اور درجات بلند فرمائے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا دینی جذبہ اور کام کا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زیر سرپرستی دیگر اداروں اور انجمنوں کے معاملہ میں بھی یہی طرز عمل تھا، ان کی طرف سے کم وبیش یہی مذکورہ اعتماد وہمت افزائی کا طریقہ تھا اور امت اسلامیہ کے مصالح کے لیے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی فکر ونظر ایک ہی سطح اور طاقت کی ہوتی تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت رہی، دین ودعوت کے کام میں یہ کوششیں تبلیغی تحریک سے وابستگی، اور دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے زیادہ انہماک سے وہیں ملی مسائل میں مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تعلق سے تحفظ شریعت وملت کی سلسلے میں رہیں، اس کے علاوہ انفرادی طور پر اصلاح وتربیت نفس کا کام بھی طالبین اصلاح ومعرفت کے لیے انجام دیتے رہے، اور متعدد حضرات ان کی جانب سے اجازت وخلافت سے بھی سرفراز ہوئے، تعلیم وتبلیغ، ارشاد وتربیت اور قیادت ورہنمائی کے ذریعے ملت کو فیض پہنچانے کا مولانا کا عمل تقریر وتحریر، مذاکرہ ومراسلت تمام طریقوں سے رہا، اس طرح مولانا نے اپنے پیچھے کتابوں اور رسائل کا جو بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے اس کے ساتھ خطوط کا بھی ذخیرہ چھوڑا جو اتنی بڑی تعداد میں ہیں جو کئی جلدوں میں سامنے آرہے ہیں۔

وہ آج اپنے ملک وقوم، اپنی ملت، اور اپنے قدردانوں سے جدا ہوگئے ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنے کاموں اور اپنی خصوصیات وصفات کے روشن نقوش چھوڑ گئے ہیں جن کو قائم رکھنا اور آگے بڑھانا ان کے قدردانوں کی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ہماری اجتماعی وانفرادی بھلائی مضمر ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تدفین آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں روضۂ شاہ علم اللہ میں ہوئی جہاں مولانا کے والدین اور بھائی بہن وغیرہ بھی مدفون ہیں رمضان

المبارک کی ۲۳ ویں شب تھی اور اس شب میں شب قدر کے آثار محسوس کیے گئے اہل تعلق کا جنازہ میں شرکت کا اس طرح ازدحام ہوا جس کا صحیح اندازہ لگایا نہیں جاسکتا حالانکہ موسم بہت سرد تھا اور کہرے کی وجہ سے چند قدم چلنا بھی آسان نہ تھا، اسلامی تقویم کے اعتبار سے مولانا نے ۸۸ رسال کی عمر پائی اور اس میں ان کو اپنی والدہ سے مناسبت رہی۔

اللہ تعالیٰ انھیں اپنا قرب خاص عطا فرمائے، اور ان کی حسنات وخدمات کو قبول فرما کر اضعافاً مضاعفہ اجر عطا کرے، اور ان کا حشر صدیقین، شہداء، صالحین کے زمرے میں انبیاء کے ساتھ کرے، آمین۔

قاری سید رشید الحسنؒ

قاری سید رشید الحسن صاحبؒ نے جو حیدر آباد اور لکھنؤ کے اہل علم اور دینی دعوت سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں ایک معروف فرد رہے ہیں اتوار کے روز ۲۸ رجنوری ۲۰۰۱ء کو کراچی میں اس دار فانی سے دار باقی کے طرف رحلت کی، قاری صاحب نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی ثم بھوپالی کے احفاد میں تھے اور اس طرح وہ والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم کے احفاد میں تھے، نواب سید صدیق حسن خاں صاحب بخاریٰ سے ہندوستان منتقل ہونے والے حسینی سادات میں تھے، جن کے ہندوستان میں مورث اعلیٰ مشہور بزرگ حضرت سید جلال الدین بخاری اُچی معروف بہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت تھے، نواب صاحب کی اولاد سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال سے نہیں تھی جو کہ ان کی زوجیت میں تھی نواب صاحب اپنے عہد کے بڑے ممتاز عالم دین اور علوم دینیہ پر بڑی دسترس رکھنے والے فرد تھے۔ ان کی تصنیف کردہ کتب تمام عالم میں مقبول ہیں۔ ان کا خاندان قنوج پھر بھوپال میں رہا، نیز لکھنؤ اور حیدر آباد میں اس خاندان کے افراد مقیم ہوئے انہی میں قاری سید رشید الحسن صاحب بھی تھے۔

قاری صاحب کا بچپنا اور زمانہ تعلیمی تبلیغ کے دعوتی کام میں لگا اور اس کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف مقامات پر ان کا جانا ہوا۔ اسی کام کے تعلق سے ان کا دینی صلاح و تدین کا معیار بڑھا اور وہ ایک صالح اور غیرت دینی کے حامل عالم دین کی حیثیت سے معروف ہوئے اور دعوتی کام ہی کے تعلق سے لکھنؤ آئے۔ یہاں ان کا طویل قیام ہوا۔ اور حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ان کے والد نواب سید نجم الدین صاحب سے اور حضرت مولانا کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کا قاری صاحب کے دادا سید

نورالحسن صاحب سے بہت قریبی ربط وتعلق رہا تھا۔ اور مولانا حکیم عبدالحی صاحب کی لکھنؤ میں اچانک وفات کے بعد ان گھرانہ نواب صاحب کی کوٹھی بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں کچھ عرصہ مقیم رہا تھا اور ان لوگوں کی طرف سے ایسا تعلق اور خیال دیکھا تھا جو گھر کے اپنے بزرگوں کی طرف سے ہوا کرتا ہے، اس لیے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو نواب صاحب کے گھرانے سے بڑا تعلق رہا، قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان روابط اور تعلقات کی بنا پر قیامِ لکھنؤ کے دوران مزید مانوس اور قریب ہوئے یہ تعلق مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اعزہ سے بھی بڑھا۔ اس دوران قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد نواب سید نجم الحسن صاحب بھی کئی بار تشریف لائے۔ اور قاری صاحب کے اس تعلق و ربط سے مسرت کا اظہار کیا اور بتدریج قاری صاحب کا ربط دارالعلوم ندوۃ العلماء سے بھی قائم ہوگیا۔ وہ یہاں اولاً تدریس وتجوید قرآن اور عربی رسالہ البعث الاسلامی کے ادارہ سے منسلک ہوئے۔ اس طرح لکھنؤ میں ایک مدت تک قیام رہا۔ پھر انھوں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ ان کے اعزہ اور والدین وہاں پہلے ہی منتقل ہو چکے تھے، چنانچہ وہ کراچی گئے اور وہاں مولانا محمد یوسف بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد میں خطیب کے عہدہ پر فائز ہوئے آخر تک اسی منصب پر فائز رہے، چند سال سے ان کو مختلف امراض سے سابقہ ہوا۔ کئی بار آپریشن بھی ہوا جس کی وجہ سے وہ کمزور ہوتے گئے۔ اور اسی میں ان کا وقت موعود آگیا اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون۔ لله ما اعطى وله ما أخذ وكل شى عنده لأ جل مسمىٰ۔ اللّٰهم اغفرله وارحمه وانزله منازل الابرار عنده۔

قاری صاحب کا ازدواجی تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی حقیقی خالہ زاد بہن کی صاحبزادی سے ہوا، جنھوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے گھر ہی میں رائے بریلی میں تعلیم وتربیت پائی تھی، اور ان کی ہمشیرہ سیدہ لمۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی ان پر بڑی عنایتیں رہی تھی، اس سے اس قدیم تعلق میں اور استحکام پیدا ہوا، قاری صاحب کا یہ ازدواجی تعلق قاری صاحب کے دورانِ قیام لکھنؤ ہی میں ہوا تھا۔ ان سے قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کے چار فرزند اور پانچ دختر ہوئیں، ان میں سے بڑی دختر کا ازدواجی تعلق مولانا سید محمد طاہر صاحب کے فرزند مولوی سید صہیب حسینی ندوی اور دوسری بیٹی کا عقد دوسرے ندوی فاضل مولوی ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی حیدرآبادی سے ہوا اور تیسری بیٹی عزیزی سید محمد یوسف ابن ابراہیم حسنی (کویت کو منسوب ہوئیں) دو اور بیٹیاں ہیں ان میں ایک حافظ قرآن بھی ہیں سے ہوا۔ اور ان کے چار فرزند عزیزان طیب، طاہر، عتیق، مزمل سلمہم ہیں اور یہ سب حافظ قرآن ہیں اور ان میں اکثر بنوری ٹاؤن کے مدرسے کے فارغ ہیں۔

قاری صاحب ہندوستان سے پاکستان منتقل ہونے پر کراچی کی بنوری ٹون کی جامع مسجد میں امام وخطیب ہوئے اور اسی کے احاطے میں ان کی رہائش گاہ بھی ہوئی جہاں علامہ سید محمد یوسف بنوی کی قائم کردہ عظیم دینی درسگاہ ہے اس طرح ان کو ایک اچھا ماحول بھی ملا قاری صاحب کے نائب کی حیثیت سے ان کے فرزند مولوی سید یوسف حسن طاہر سلمہ تھے وہ اب ان کی جگہ پر ہیں اور ان کے معاون ان کے چھوٹے بھائی مولوی قاری عتیق حسن سلمہ ہیں۔

قاری صاحب بڑے صاحب اخلاق صاحب غیرت دینی و دعوتی فکر وعمل کے مالک ہمدردانہ اور مخلصانہ مزاج رکھنے والے شریف ومعزز خاندان کی قدروں کے حامل تھے، ان سے جو ملتا مانوس ہوتا اور ان کا قدرداں بن جاتا۔ لکھنؤ کے قیام کے دوران ان کے قدردانوں کا ایک حلقہ بن گیا جو ان کو بڑے تعلق وقدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا وہ اپنے معزز خاندان کی روایات اور قدرون کے حامل تھے، ان کی زندگی کی وضعداری اور صاف ستھرے اور پسندیدہ معیار کی تھی جس کی قدر سب کے دلوں میں تھی، جیسا کہ ان کے سانحۂ ارتحال سے بہت سے لوگ ملول وغمزدہ ہوئے قاری صاحب علم دوست شخصیت تھے اور اس کے ساتھ ان کی دعوت وتبلیغ کے کام سے اچھی وابستگی بھی تھی اور باطنی استعداد کے بھی حامل تھے حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی سے وہ بیعت ہوئے تھے پھر ان کا اصلاحی تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے قائم ہوگیا تھا کراچی میں وہ شیخ وقت حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں اہتمام سے حاضر

ہوتے ان کے بعد ان کا یہ تعلق حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے خلیفہ حضرت شاہ سید نفیس الحسینی لاہوری سے قائم ہوا انہوں نے قاری صاحب کو اجازت وخلافت سے بھی سرفراز کیا۔

قاری صاحب کی عمر لگ بھگ ۶۷ رسال ہوئی اور کراچی میں جہاں وہ اب مقیم ہوگئے تھے تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی خوبیوں کا بہترین صلہ ان کو عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر و رضاء بالقضاء کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے صاحبزادگان کو ان کی خوبیوں سے مزین فرمائے۔ (آمین)۔

مولانا سید محمد طاہر حسینی منصور پوریؒ

برادر مکرم ورفیق محترم مولانا سید محمد طاہر حسینی (مظاہری ندوی) سابق مددگار ناظم ندوۃ العلماء اپنی طویل علالت کے بعد دوشنبہ ۸؍شوال ۱۴۲۲ھ (۲۴؍دسمبر ۲۰۰۱ء) کو فجر کے وقت اس دار فانی سے دار باقی کی طرف رحلت فرما گئے اور اپنے محبین اور اپنے قدر دانوں کو بہت ملول کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ان کی عمر شمسی تقویم کے مطابق ۷۲ سال تھی۔ لیکن سب کی دعا تھی کہ وہ مزید زندگی پائیں اور فائدہ پہنچائیں۔

مولانا ایک عالم دین صلاح وتقویٰ میں معروف اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ مولانا مرحوم ضلع مظفر نگر کے مشہور ومردم خیز قصبہ منصور پور کے بابرکت شخص محترم گھرانہ کے جس کا تعلق سادات بارہا سے ہے معزز فرد تھے۔ ہندوستان کے مسلم اقتدار کے ایک عہد میں یہ خاندان خصوصی اثر وشہرت کا مالک رہا ہے اس میں اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں موجودہ عہد میں بھی اس میں معروف افراد پیدا ہوئے اور ان کا اپنے وقت کے بزرگوں سے تعلق رہا اسی مناسبت سے مولانا طاہر صاحب کو بھی اپنے زمانے کی مشہور دینی شخصیتوں سے وابستہ ہونے کا موقع ملا ان کو خصوصیت سے شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی، مشہور بزرگ مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہم سے فیض حاصل ہوا، تعلیم بھی انھیں شیوخ کی رہنمائی میں حاصل کی، جس میں حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی توجہات کا ابتدا سے حصہ رہا۔ اور دینیات کی اعلیٰ تعلیم سے فراغت حضرت شیخ الحدیث صاحب کے درس سے حاصل کی۔ بعدہٗ ندوۃ العلماء میں مولانا سید ابوالحسن علی حسنی صاحب ندویؒ کی سرپرستی میں عربی کی صلاحیت بڑھانے اور استعداد کو ترقی دینے میں ایک سال کا وقت گزارا پھر انہی کے مشورے اور تجویز سے ایک دعوتی وتعلیمی

وفد میں جو حجاز مقدس ایک سال کے لیے اس وقت کے ناظم ندوۃ العلماء مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہما کی تجویز سے بھیجا گیا تھا شمولیت اختیار کی اس وفد میں مولانا موصوف کے علاوہ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی حال معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی سابق پروفیسر ریاض یونیورسٹی ریاض، اور یہ کاتب الحروف شامل تھے۔ اس طرح کے وفد کا آغاز ایک سال پہلے ہو چکا تھا جس میں دو فضلائے ندوہ مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا عبدالرشید ندوی اعظمی گئے ہوئے تھے، یہ دعوتی و تعلیمی وفد حجاز مقدس میں وہاں کی اہل علم شخصیتوں سے اور کتب خانوں سے استفادہ کے ساتھ ساتھ دینی و دعوتی کام میں حصہ لینے کا مقصد رکھتا تھا اس وقت بلاد عربیہ میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ یورپ کے علم و تمدن سے خاصا متاثر تھا اور مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب اور مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہما کی رائے یہ ہوئی کہ ندوہ میں عربی کی استعداد حاصل کرنے والوں کو بلاد عربیہ جا کر وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کام کرنا چاہیے پھر مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس کام کی سرپرستی فرمائی، وفد کی سربراہی کی اور وہاں اہل علم اور اہل ادب کی مخصوص نشستوں کا انعقاد کرواتے اور ان میں مؤثر انداز میں گفتگو فرماتے ان نشستوں میں ہم ارکان وفد شریک ہوتے اور کام کا انداز دیکھتے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر وفد کے ارکان نے حجاز مقدس اور اس کے اطراف کے ممالک میں ایک سال سے دو سال تک کا وقت گزارا، اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت تک حجاز مقدس میں بڑے مدارس صرف خال خال تھے۔ نیا تعلیمی نظام نہیں قائم ہوا تھا، اور تمدنی زندگی بھی بہت کمزور اور معمولی تھی، البتہ علمی و دینی شخصیتیں موجود تھیں جن سے ملاقات اور ان کے علمی و دینی فیض سے فائدہ اٹھانے کے اچھے مواقع تھے ان مواقع سے ارکان وفد نے فائدہ اٹھایا وہاں کی علمی و دینی شخصیتوں سے ملاقات اور ان سے نجی طریقے سے استفادہ کیا اس سلسلے میں اس وقت کے حرم مکی کے اول امام شیخ عبدالمہیمن مصری سے جو وہاں قائم مدرسہ سلفیہ کے مدیر بھی تھے اور نماز میں ان کی قرأت بہت اچھی تھی نجی طور پر وقت لے کر مولانا محمد طاہر

صاحب قرآن مجید سناتے اور تصحیح قرأت کا اہتمام کرتے اس طرح سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا اس میں مجھے بھی ان کی رفاقت کی سعادت ملی اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے حفظ قرآن کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو حجاز سے واپسی تک قائم رہا۔ اس طالب علمانہ وفد کے ارکان میں سے اکثر ۱۹۵۱ء کے آخر میں ہندوستان واپس آ گئے البتہ مولانا طاہر صاحب نے مزید ایک سال وہاں موجود رہ کر تبلیغی جماعت کی معیت میں گذارا۔ مولانا سعید احمد خاں صاحب وہاں کی جماعت کے سربراہ تھے، مولانا طاہر صاحب کو ان کی رہنمائی اور معیت حاصل رہی وہ ان کے مشورہ سے جماعت لے کر شام و عراق بھی گئے پھر ہندوستان واپس آئے۔

ہندوستان کی واپسی پر غالباً یہاں کی مشغولیتوں اور علالتوں کی بنا پر حفظ قرآن کا یہ سلسلہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا البتہ قرأت قرآنی کے اس استفادہ کے نتیجے میں ان کی قرأت قرآن عربی کے دلکش انداز سے ہوتی تھی۔

مولانا سید محمد طاہر صاحب دو سال کا وقت ۱۹۵۰ء کے آخر سے ۱۹۵۲ء کے آخر تک کا وقت گزار کر ہندوستان واپس آئے، اس مدت کا بیشتر وقت انھوں نے مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ مین گزارا اور تھوڑا وقت شام اردن وغیرہ میں دعوتی مقصد سے گزارا اور وہ فائدہ حاصل کیا جو اس سفر کا مقصد تھا۔ ہندوستان واپس آنے پر مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے مشورے سے ان کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ ناظم ندوۃ العلماء نے ان کا انتخاب اپنی ایک صاحب زادی سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر لینے کے لیے کیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح پڑھایا یہ جولائی ۱۹۵۳ء کی بات ہے مجھ کو بھی یہ بات اسی موقع پر حاصل ہوئی، اس طرح میرا ان کا تعلق اور قریب ہو گیا، اور اس رشتے سے ان کا تعلق مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مزید قوی ہو گیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سے اب تک انھوں نے معاشی انتظام نہیں کیا تھا چنانچہ اب مدارس میں تدریس کا سلسلہ اختیار کرنے کی فکر کی اور اولاً گجرات کے ایک مدرسہ میں پھر یوپی (اٹاوہ) کے ایک مدرسہ میں ان کو تدریس کا موقع ملا۔

اسی دوران وہ اپنی طویل علالت کے سبب اس مشغولیت کو قائم نہ رکھ سکے اور لکھنؤ آ گئے اور پھر صحت ہونے پر ان کا تعلق ندوۃ العلماء کے تعلیمی ادارے سے ہو گیا پھر اس کے مرکزی دفتر میں ان کو کام کرنے کا موقع ملا اور وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر مدد گار ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے اور اس کام کو انھوں نے اپنی صحت کی معذوری تک بڑی خوبی سے انجام دیا، صحت کی معذوری پر ریٹائر ہوئے اور اس کے بعد تقریباً دو ڈھائی سال اپنی شدید علالتوں میں رہ کر بالآخر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تدفین دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں اپنی اہلیہ دختر ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید محمد ظاہر حسینیؒ خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے پاس ہوئی۔

مولانا موصوف کا تعلق اپنے عہد کے بزرگوں سے بہت قریبی رہا، مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی شفقتوں سے ان کو آغاز عمر ہی سے حصہ ملا تھا، حضرت نظام الدین دہلی میں واقع مدرسہ کاشف العلوم کے زمانۂ تعلیم میں مولانا محمد یوسف کاندھلوی اور مولانا انعام الحسن کاندھلوی اور مولانا عبیداللہ بلیاوی رحمہم اللہ سے پڑھنے کا موقع ملا اور ان کی توجہات حاصل ہوئیں پھر مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے قریبی ربط قائم ہوا اور ان سے بیعت ہوئے، پھر بڑی دینی ترقی کی اور اجازت بیعت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

مولانا سید محمد طاہر صاحب ہر سال رمضان المبارک میں اپنے شیخ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے پاس جا کر وقت گزارتے تھے اور ان کے ساتھ اعتکاف کا بھی معمول رکھتے تھے اور اس طریقے سے ان کے فیض تربیت سے فائدہ اٹھاتے تھے اس فیض صحبت سے انھوں نے بڑی دینی ترقی کی اور صلاح ونیکی میں قابل قدر مقام حاصل کیا مقررہ عبادات کے ساتھ علوم دینیہ کی صلاحیت بڑھانے کی طرف بھی توجہ رکھی ان کو باقاعدہ درجات میں تعلیم دینے کا موقع تو نہیں حاصل ہو سکا لیکن انھوں نے علوم دینیہ کی کتابوں کا مطالعہ اور نجی طریقہ سے تدریس کی مشغولیت اپنے کام کے مقررہ اوقات کے علاوہ اوقات میں جاری رکھی

دفتر نظامت کے ذمہ دارانہ عہدے پر ہونے کی وجہ سے عہدہ کی ذمہ دارانہ مشغولیت کے سبب ان کو تدریس کے شعبہ میں منتقل نہ کیا جاسکا اس کسر کی تلافی انھوں نے اپنے خارج اوقات میں علمی مشغولیت سے پوری کی، اس طرح علوم دینیہ میں ان کی صلاحیت برقرار اور تازہ رہی دینی صلاح اور نیکی اور اس کے ساتھ علوم دینیہ سے واقفیت دونوں نے مل کر ان کی شخصیت میں ایک خوشنما جامعیت پیدا کردی تھی، اس طرح وہ دینی اور علمی دونوں حیثیتوں کے حامل رہے۔ اسی دوران وہ مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی کے بیس سال ناظم رہے۔

مولانا سید محمد طاہر صاحب کے والد سید محمد یوسف صاحب اگرچہ جدید تعلیم یافتہ اور حکومت کے دفتری نظام میں منسلک رہنے والے شخص تھے لیکن ان کا اپنے وقت کے ممتاز ترین بزرگوں سے عقیدت اور گہرا ربط تھا اسی کی بناء پر مولانا محمد طاہر صاحب کو شروع ہی سے ان بزرگوں کی شفقت حاصل رہی جس نے ان کو ایسی ممتاز شخصیت بننے میں مدد دی۔

مولانا سید محمد طاہر صاحب مظاہر علوم سے فارغ ہونے کے بعد ندوہ آنے پر ہی ہم لوگوں سے متعارف ہوئے تھے لیکن مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے ان کا ربط و تعلق ان کے مظاہر علوم میں قیام کے زمانے سے ہوگیا تھا، لکھنؤ آنے کے وقت پر اور خاص طور پر حجاز کے سفر سے میرا ذاتی ربط ان سے بڑھا جو وہاں سال بھر رفاقت کی صورت میں جاری رہا اور میں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور ان سے واسطہ رہا میں نے ان کو ایک محبانہ اور ہمدردانہ مزاج کا حامل پایا، مجھے یاد نہیں کہ پورے ایک سال کمرہ کی رفاقت میں مجھے ان سے شکایت ہوئی ہو، حالانکہ سفروں میں رفقاء کے درمیان دوری کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں لیکن مولانا محمد طاہر صاحب کے ساتھ رہنے میں میں نے ان کو ایک بڑا اچھا رفیق پایا اور چونکہ ہم لوگوں کی عمریں تقریباً یکساں ہی تھیں، اس لیے بے تکلفی بھی رہی جو اس کے بعد بھی برابر قائم رہی اور قرابت ہو جانے کے بعد تو قرب و تعلق کا یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا ان کی وفات سے نہ صرف یہ کہ ایک محترم دینی شخصیت سے ہم محروم ہوئے بلکہ ایک عزیز قریب اور دوست سے بھی محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو ان کی نیکیوں کا بہترین صلہ عطا

فرمائے اور عالم آخرت میں ان کو قبولیت کا اور بلند مقام عطا فرمائے۔

میری ماموں زاد بہن جوان کی رفیق حیات تھیں ان کا انتقال تین سال پہلے ہوا وہ بھی بہت نیک طبیعت اور ہمدردانہ مزاج کی حامل تھیں وہ محبت وخدمت کے معاملے میں خاندان میں شہرت رکھتی تھیں سبھی ان کے مداح تھے ان دونوں نے شاید اپنی نیکیوں کے سبب ہی اچھی اولاد پائی، ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں، تینوں بیٹے عالم اور معلم بنے جن میں دو حافظ قرآن ہیں، ان میں سے بڑے بیٹے عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی سلمہٗ استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء بڑی عالمانہ اور خطیبانہ خصوصیات کے مالک ہیں اور انجمن شباب اسلام کے بانی اور صدر ہیں، ان کی شہرت ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی ہے ان کے دیگر بھائی عزیزان مولوی سید محمد اسحاق حسینی ندوی اور مولوی سید محمد صہیب ندوی سلمہما بھی عالم دین اور معلم بلکہ تعلیمی ودینی اداروں میں دونوں ذمہ دارانہ مقام تک رکھتے ہیں اور ان تینوں کی بہن جو کہ عزیزی ڈاکٹر سید احمد الحسنی ندوی کو منسوب ہیں وہ بھی تعلیمی امور سے دلچسپی رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ قبولیت سے نوازے اور مولانا سید محمد طاہر صاحب کے امتیاز کا ورثہ ان کی اولاد کے ذریعہ جاری رہے۔

مولانا سید ابوبکر حسنی ندویؒ

دائرہ شاہ علم اللہ ضلع رائے بریلی کے حسنی خاندان کی معروف شخصیت مولانا سید ابوبکر حسنی نے ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۲ء (سنیچر) کو اپنے آبائی وطن دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں اس دارِفانی سے دار باقی کی طرف کوچ کیا اور خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور قرب خاص عطا کرے۔ (آمین)

وہ ایک جدید وقدیم دونوں نظامہائے تعلیم کے فیض یافتہ تھے، انھوں نے پہلے ندوۃ العلماء میں کئی سال تعلیم حاصل کی، پھر جدید نظام تعلیم سے استفادہ کر کے ایم، اے، کی ڈگری حاصل کی یہ وہ دور تھا، جب مسلمانوں میں تعلیم کی طرف توجہ کی کمی تھی اور ہائی اسکول تک کی تعلیم کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، لیکن مولانا جس خانوادہ کے فرد تھے، اس میں دینی تعلیم کی توجہ کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کی طرف بھی توجہ کی جاتی تھی، چنانچہ ان میں سے بعض نے اسی دور میں جو گزشتہ صدی کے نصف اول کا زمانہ تھا، برطانیہ اور بعض نے جرمنی اور بعض نے امریکہ بھی جا کر تعلیم حاصل کی، لیکن بعض نے دونوں نظامہائے تعلیم سے فائدہ اٹھایا، ان میں سرِفہرست مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحبؒ تھے، ان کے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب ٹونکی نے بھی دونوں نظام تعلیم کو جمع کیا اور ان ہی میں مولانا سید ابوبکر حسنی بھی تھے۔

مولانا ابوبکر حسنی صاحب رشتہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ لگ بھگ ایک ہی عمر کے تھے۔ اور دونوں نے اپنا بچپن اور اپنی تعلیمی زندگی ایک ہی گھر میں رہ کر گذاری، وہ گھر مولانا علی میاںؒ صاحب کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلیؒ صاحب کا تھا، ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تعلیمی زندگی اولاً علوم

دینیہ کی مکمل تحصیل میں لگانے کے بعد اپنی عصری تعلیم سائنس کے شعبہ کے تحت B.Sc. تک نمایاں کامیابی کے ساتھ حاصل کی تھی اور پھر M.B.B.S. کیا وہ شہر لکھنؤ کے ممتاز معالج تھے اور مولانا علی میاںؒ اور مولانا ابوبکر حسنیؒ سے تقریباً بیس سال بڑے ہونے کی بنا پر دونوں کے سرپرست کی حیثیت رکھتے تھے، اول الذکر کے وہ بڑے بھائی اور والد کی جلد وفات ہوجانے کے باعث اصل سرپرست تھے اور ثانی الذکر ان کے چچازاد بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی اہلیہ کے حقیقی بھانجہ تھے، چنانچہ دونوں حضرات یعنی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا ابوبکر حسنی صاحبؒ کا ابتدائی دور ایک ساتھ گزرا اگرچہ تکمیل کے بعد دونوں نے زندگی کا میدان عمل الگ الگ اختیار کیا، مولانا ابوبکر حسنی نے ایم۔اے۔عربی میں کیا اور کانپور کے حلیم کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے اور نو سال عربی زبان کی تعلیم میں گذارے اس سلسلے میں انھوں نے اپنی عصری تعلیم کے راستہ سے جو فنی اور تکنیکی طریقہ سے واقفیت حاصل کی تھی اس کو عربی کی تعلیم میں بھی اختیار کیا اور اس میں انھوں نے اپنا طرز علاحدہ سے بنایا وہ مواد تعلیم کو طالب علم کے لیے مرغوب بنا کر پیش کرتے تھے، اور اس کے لیے وہ محسوساتی مثالوں سے کام لیتے تھے، اس طرز پر بعد میں انھوں نے ایک کتاب بھی تیار کی تھی جس کو "اللغة العربية و دروسها سهلة" نام دیا تھا، جو دارعرفات رائے بریلی نے شائع کیا تھا، مولانا کو حلیم کالج میں نو سال گذرنے پر آل انڈیا ریڈیو دہلی کے شعبۂ عربی میں جگہ مل گئی وہاں وہ منتقل ہوکر عربی کے نشریاتی پروگراموں کی انجام دہی کرنے لگے پھر ان کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں عربی کے استاد کی جگہ مل گئی، وہ اس طرح پھر تعلیم کے شعبہ میں آگئے اور وہیں سے اپنی ساٹھ سال کی مدت گزرنے پر ریٹائر ہوئے۔

ریٹائر ہونے پر وہ رائے بریلی کے قصبہ تیندوا میں واقع عربی دینی درسگاہ فلاح المسلمین میں آگئے اور کئی سال وہاں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، عمر کے آخری دس بارہ سال انھوں نے ذاتی مصروفیات میں گزارے اور اس دور میں وہ زیادہ تر دہلی میں رہے، جہاں ان کی صاحبزادی اور حقیقی بھانجے مقیم تھے، مولانا کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، ان

کے بھانجے مولوی سید خالد حسنی ندوی جو ان کے داماد بھی تھے ان کے لیے اولاد کی طرح تھے، وہ اپنی اہلیہ یعنی مولانا کی صاحبزادی کے ساتھ دہلی میں رہ رہے ہیں اور سعودی سفارتخانہ میں ملازم ہیں، لہذا مولانا نے اپنی یکسوئی کی زندگی انہی کے ساتھ گذاری لیکن اس دور میں وہ زیادہ تر علیل رہے، کبھی صاحب فراش بھی ہوجاتے تھے، آخر میں علالت کا سلسلہ مستقلاً قائم رہنے لگا، بالآخر ۱۴ر دسمبر ۲۰۰۲ء (شوال المکرم ۱۴۲۳ھ) کو تقریباً نوے سال کی عمر میں وفات پائی ان کا سن پیدائش ۱۳۳۱ھ-۱۹۱۳ء ہے

مولانا ابوبکر صاحب حسنی اپنے والد مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کی تین بہنیں تھیں جن میں سے دو کا انتقال ان سے پہلے ہوگیا، تیسری بہن سیدہ رضیہ (۱) باحیات ہیں (بارك الله فی حیاتها) اگرچہ بہت کمزور صحت بلکہ مسلسل علالت کی حالت میں ہیں، ان کی لیے مولانا ابوبکر حسنی صاحب کی وفات کا سانحہ سخت سانحہ ہے، اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حقیقی پسماندگان میں ایک بہن، ایک صاحبزادیں سیدہ حفصہ (مولوی سید محمد حامد حسنی جو کہ ریاد میں ہیں (۲)، ایک بھانجہ چھوڑا، وہ ان کو اور اپنے دیگر عزیزوں کو رنج کی حالت میں چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مولانا ابوبکر حسنی صاحب بڑے مرنجانِ مرنج اور خوش مزاج اور دوست نواز شخصیت کے مالک تھے، وہ اپنے بڑوں سے ربط وتعلق کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹوں بلکہ خاندان کے بچوں اور خاندان سے باہر کے بچوں سے بھی انس ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے اور

---

(۱) برادر محترم ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ صاحب حسنی کی یہ اہلیہ ہیں، انھوں نے بھی کمزوری اور علالت کی ایک مدت گزار کر لکھنؤ میں تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی، قرآن مجید سکھانے کا ان کا صحت کی حالت میں مشغلہ رہا تھا، اور خدمت گزاری میں خاص میں انھیں امتیاز حاصل تھا، صبر ورضا اور قناعت کے اوصاف سے متصف ہیں، رحمها الله تعالیٰ رحمةً واسعةً۔

(۲) صاحبزادی نے بھی طویل علالت سے گزر کر لکھنؤ میں انتقال کیا اور رائے بریلی میں تدفین عمل میں آئی، ہمدردانہ وخیر خواہانہ مزاج اور اچھے اخلاق کی حامل خاتون تھیں، غفر الله لها، ورفع درجاتها۔

تعلیم کا ڈھنگ تو ایسا تھا کہ بچے بھی ان سے بہت مانوس ہوتے تھے اور ان کے اسباق میں بہت ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے۔ مولانا اپنی اس خوش اخلاقی کے ساتھ ساتھ زندگی کے تہذیبی واخلاقی طریقہ کو نافذ کرنے سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور تہذیبی واخلاقی طور وطریق کی کمی دیکھتے تو اس کو نظر انداز نہ کرتے، بلکہ فوراً ٹوکتے اور اس کے لیے تنبیہ کا طریقہ اختیار کرتے اگرچہ تنبیہ کا ان کا یہ طریقہ زبانی سے آگے نہ بڑھتا وہ الفاظ کی مار کو کافی سمجھتے، اس سے زیادہ کو اختیار نہ کرتے تھے اور جہاں تک ہمدردی اور تعاون کا معاملہ ہوتا تو اس میں بھی ایثار رکھتے تھے، کسی کے کام آسکیں، کسی کے مسئلہ کو حل کرسکیں، کسی کو فائدہ پہنچاسکیں، یہ ان کا خاص انداز تھا، چنانچہ اپنے کئی عزیزوں کو عملی زندگی میں آگے بڑھنے اور کامیابی کے راستے پر ڈالنے کا ذریعہ بنے۔

مولانا مرحوم خوش مذاق بھی تھے، زندگی کی جائز سہولتوں اور نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا ذوق رکھتے تھے۔ اپنی صحت اور قوت کے زمانہ میں کھیلوں میں بھی امتیاز پیدا کیا تھا۔ چنانچہ والی بال میں اپنے وطن کے اندر نام پیدا کیا، اور ہاکی میں آل یوپی ٹیم کے اہم فرد تھے اور یہ سلسلہ ان کا حلیم کالج کے استاد ہونے کے زمانہ تک جاری رہا اور عمر کے کمزوری کے مرحلہ میں داخل ہونے پر بند ہوا۔

مولانا مرحوم نے اپنے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستگی کے زمانہ میں ایک سال کے لیے قاہرہ جانے کے موقع سے بھی فائدہ اٹھایا اور قاہرہ میں ایک سال عربی کے عملی میدان میں بھی اپنی واقفیت کو بڑھایا اور اس سے اپنی عملی زندگی میں فائدہ اٹھایا، وہاں کے انھوں نے صحافتی اسلوب نگارش اور ترجمہ کو وہاں کے ماہرین سے سمجھنے کی فکر کی اور پھر ہندوستان آکر ایک کتاب کی صورت میں مرتب کیا، جس میں مختلف نمونے بطور مثال کے انھوں نے جمع کئے تھے اور یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اسلوب نگارش مختلف قسموں میں بٹا ہوا ہے۔ مقالہ کا اسلوب الگ ہوتا ہے اور صحافتی خبروں اور تبصروں کے اسلوب الگ

ہوتے ہیں، جس دائرہ کا کام ہو اس دائرہ کا اسلوب اختیار کرنا چاہئے، خود ان کے اسلوب نگارش میں اس کا اہتمام ملتا تھا ان کے اس مجموعہ سے ان کے قریب کے عربی کے شائقین نے فائدہ بھی اٹھایا، قاہرہ میں روزنامہ ''الاخبار'' کے مدیرین سے بھی انھوں نے اس سلسلے میں استفادہ کیا۔ ان کا یہ سفر حکومت ہند کی جانب سے ہوا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم تھے۔

مولانا ابوبکر حسنی صاحب کا ملت کے قائدین اور اپنے وقت کے بزرگوں سے تعلق رہا، وہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب سے بیعت بھی تھے اور ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور اس تعلق سے جمعیۃ العلماء ہند اور اس سے تعلق رکھنے والے متعدد مسلم سیاسی شخصیتوں سے بھی ان کا تعلق ہوتا رہا، وہ حضرات بھی ان کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے بڑا خیال کرتے تھے، شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے مولانا ابوبکر حسنی صاحب کے والد مولانا عزیز الرحمٰن صاحب بیعت بھی تھے، اس طرح تعلق دوہرا ہو گیا تھا۔

مولانا نے اپنی عصری تعلیم لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی یونیورسٹی جانے سے قبل امیر الدولہ اسلامیہ کالج اور شیعہ کالج لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی تھی، ان کا نام اگرچہ ابوبکر تھا لیکن اس سے ان کو شیعہ کالج میں دشواری نہیں پیش آئی، ان کی خوش مذاقی اور دوست نوازی کے سبب ان کے رفقاء تعلیم بھی ان سے بہت مانوس رہتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے، خاص طور پر یونیورسٹی کے زمانۂ تعلیم میں ان سے ان کے اساتذہ و رفقاء بہت مانوس ہوئے۔

مولانا اپنی صحت کے پورے دور میں مطالعہ سے بھی خصوصی دلچسپی رکھتے رہے، عربی کے اچھے انشاء پردازوں کی تحریروں کا ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے اور ان کی خصوصیت کو سمجھتے اور قدر کرتے تھے، اپنے قاہرہ کے دوران قیام سے انھوں نے عربی کے اچھے انشاء پردازوں کی تصنیفات کا اچھا مجموعہ اکٹھا کر لیا تھا جو وہ اپنے ساتھ ہندوستان

لائے تھے۔ انھیں کئی ادیبوں سے خصوصی دلچسپی تھی اور بعد میں استاذ علی طنطاوی کی ادبی تحریروں کو بہت قدر و پسندیدگی سے دیکھنے لگے تھے۔

مولانا کے اس ذوق ادبی کا اثر خود ان کی تحریروں پر پڑا تھا، ان کا خود عربی لکھنے کا اچھا اسلوب بن گیا تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کے عربی پرچوں ''البعث'' ''الرائد'' وغیرہ میں مختلف موضوعات پر اپنی آراء وتأثرات تحریر کئے جو قارئین نے بہت پسند کئے۔ وہ عربی کے جدید اسٹائل کو بھی سمجھتے تھے اور اپنے طلباء کو اس سے واقف کرانے کی کوشش کرتے تھے، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستگی کے زمانہ میں انھوں I.F.S. کے طلباء کو بھی عربی پڑھائی تھی۔ اس کے نتیجہ میں انڈین فارن سروس کے متعدد ملازمین کا ان سے شاگردی کا جو تعلق قائم ہوا تھا اس کو ان ملازمین نے آخر تک مانا، اس کے علاوہ بھی یونیورسٹی اور اس سے قبل کے حلیم کالج کے زمانہ کے ان کے طلباء ان کے ہمدردانہ تعلیمی رویہ کے قدرداں رہے اور جب ان سے ملتے تو اسی قدر و لحاظ سے ملتے تھے۔

عربی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ان کو اچھا ذوق حاصل تھا، انگریزی میں بھی ان کی تحریروں کو قدر و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور پڑھا جاتا تھا۔ فلاح المسلمین (امین نگر تیندوا، رائے بریلی) میں اپنے زمانہ تدریس میں انھوں نے طلباء کو انگریزی پڑھانے میں بھی طلباء پر اپنے اس ذوق و مہارت کے نقوش چھوڑے۔

مولانا مرحوم میں ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ دین داری بھی خاصی تھی، اور وہ زندگی میں پیش آنے والی تکالیف اور پریشانیوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے جوڑتے تھے اور امراض کے علاج میں نیک اعمال کو مفید قرار دیتے تھے بلکہ بعض وقت وہ بعض برائیوں کے بارے میں یہاں تک کہتے تھے کہ ان سے فلاں فلاں تکلیف یا مصیبت آسکتی ہے، نمازوں کی باجماعت پابندی کے علاوہ اوراد و وظائف اور تلاوت کے پورے پابند تھے، اور رمضان کے مہینے میں زیادہ انہماک سے اس کے معمولات پورے کرتے تھے۔

مولانا مرحوم اپنے والدین کے ساتھ حق سعادت مندی پوری طرح ادا کرتے رہے

تھے ان کی ہدایات اور پسند کا پورا لحاظ کرتے تھے اور ان کے آرام کی فکر اپنی پوری استطاعت کے ساتھ کرتے تھے، ان کا انتہائی ادب کرتے تھے اور ہمیشہ ان کو خوش رکھا، انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان دونوں کے تعلق والوں کے ساتھ بھی محبت و تعلق کا برتاؤ کرتے رہے۔ اپنی حقیقی بہنوں کے ساتھ بھائی ہونے کا حق نہایت بہتر طریقہ سے ادا کرتے رہے، ان کے علاوہ بھی خاندانی تعلق ہو یا رفاقت عمل کا یا ملنے جلنے کا تعلق ہو سب کو وہ خوش اخلاقی، ہمدردی اور موانست کے ساتھ نباہتے تھے، مجھ سے ان کا تعلق خاندانی لحاظ سے میرے والد کی طرف سے بھائی کا اور میری والدہ کی طرف سے ماموں کا تھا، لیکن اس طرح بے تکلفی اور محبت سے پیش آتے کے کہ ماموں کا تعلق دب گیا تھا اور بھائی کا تعلق ہی چھا گیا تھا یہ ان کی خوش اخلاقی، پھر ادب اور ذوق کی بنیاد پر مناسبت اور تعلق اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ بڑے ہونے کے باوجود دوستی والا رویہ اختیار کر لیتے تھے، جس کی وجہ سے الفت و موانست برابر ملتی رہی اور ان کی بڑائی تھی کہ وہ اپنے خوردوں کے ساتھ برابری کے ساتھ ملتے تھے، ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے شرمندگی بھی ہوتی تھی، وہ اچھے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے، اور ان کا وجود ہم لوگوں کے لیے تقویت کا باعث تھا، ندوۃ العلماء سے بھی ان کا تعلق بڑا پرانا اور بہت مخلصانہ تھا وہ اس کی مجلس انتظامیہ اور مجلس نظامت دونوں کے رکن تھے اور اس کے جلسوں میں اہتمام سے شریک ہوا کرتے تھے۔

اب جب کہ وہ ہم سے جدا ہو چکے ہیں ہمارے پاس صرف دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خوبیوں کا بدلہ اضعافاً مضاعفۃً عطا کرے اور کمزوریوں کو جن سے کوئی انسان خالی نہیں ہو سکتا سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے دامن عفو میں جگہ دے، اور نئی نسل کے لوگوں کو ان کی خوبیوں کے اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

سیدہ امامہ مرحومہ

عزیزہ سیدہ امامہ بنت برادر معظم مرحوم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ وزوجہ سید حسن حسنی ابن برادر محترم سید محمد مسلم حسنی نے ۵۸ سال کی عمر میں ایک وقتی مرض کے علاج کے خراب ہوجانے کے نتیجے میں ۱۴/ شعبان ۱۴۲۶ھ دوشنبہ کی شب کو اس دار فانی سے دار باقی کو کوچ کیا۔

عزیزہ مرحومہ اپنے خاندان میں اپنے بڑوں کی طرف سے اپنے حسن کردار کی بنا پر بہت لائق قدر تھیں، ان کا نشو ونما اپنے دادیہالی اور نانیہالی سرپرستوں کی خصوصی توجہ اور شفقت کے ساتھ ہوا تھا، ان کی دادی سیدہ امۃ العزیز صاحبہ جو میری اور میرے بھائیوں کی والدہ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی بہن تھیں، بڑے حسن اخلاق اور غریب پرور، صلہ رحمی، اور نئی نسل کی تربیت ایمان اور حسن اخلاق پر کرنے کی خصوصی صفات رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ان پوتی کے ساتھ جوان کے پوتے پوتیوں میں سب سے پہلے تھیں، خصوصی توجہ رکھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی ان دادی صاحبہ کی بہن مشہور مصنفہ اور عالمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ عرف عائشہ بی، دونوں کی والدہ جو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی بھی والدہ تھیں، سیدہ خیر النساء بہتر صاحبہ جو اپنے پورے خاندان میں نیکی اور دینی ودنیاوی سمجھ اور نئی نسل کی تربیت کے معاملے میں بڑا امتیاز اور شہرت رکھنے والی تھیں، ان سب کی توجہ وتربیت سے عزیزہ امامہ کو اپنے بہن بھائیوں میں بڑی ہونے کی وجہ سے خصوصی طور پر استفادے کا موقع ملا، جو عزیزہ کی زندگی میں نمایاں طور پر محسوس کیا گیا۔

ان میں طبیعت کی نرمی، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، بڑوں کا احترام، خود تکلیف اٹھانا اور دوسرے کو تکلیف سے بچانا، سب سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا، دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھنا، اصلاح ونصیحت کی حامل کتابوں کے مطالعہ، سیرت واخلاق کی خوبی

اور اسی کے مطابق اپنے چھوٹوں کو نصیحت، ان کی خصوصیات میں شامل تھا۔ وہ اپنے والد ماجد مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے اجرا کردہ رسالہ ''رضوان'' کے ادارۂ تحریر میں تھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ جس طرح ان کی دینی واخلاقی اور حسن عمل کی حامل شخصیت بنانے میں ان کے سرپرستوں کا ہاتھ رہا، اسی طرز کو انھوں نے اپنے بچوں اور بچیوں کے لیے اختیار کیا، اور ان کو اپنے خاندانی طریقے پر جو دنیاوی منافع پر دینی فلاح وصلاح کو ترجیح دینے کا اپنے بڑوں کا ورثہ ملا تھا، اس کو انھوں نے بخوبی اختیار کیا، اور اسی نہج پر اپنے بچوں کو تعلیم دی۔

ان کے تین بیٹے ہوئے، انھوں نے تینوں کے لیے علم دین کے حصول کو ترجیح دی، اور اپنی دونوں بیٹیوں کی بھی اسی نہج پر تربیت کی، اس کے نتیجے میں ان کے بیٹے اور بیٹیاں سب دین ودنیا کے معقول اور معتدل راہ، اور علمی لحاظ سے بھی اختیار کی راہ پر چلے، اور انھوں نے زندگی کے مناسب اور صحیح طور وطریق اختیار کیے۔ ان کے بڑے بیٹے سید محمود حسن حسنی ندوی استاد مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی، اور شریک ادارۂ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات''، اور دوسرے بیٹے سید مسعود حسن حسنی ندوی رکن دارالافتاء (واستاد) دارالعلوم ندوۃ العلماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تیسرے بیٹے سید منصور حسن حسنی بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کے مرحلے کو پورا کر کے عالم بنے۔ اسی کے ساتھ دونوں بیٹیوں (عائشہ وشامہ سلمہما) کو بھی عالم دین اور باصلاحیت شوہر ملے بڑی بیٹی مولوی عبدالباری ابن مولانا عبدالعلیم فاروقی لکھنؤ اور چھوٹی بیٹی مولوی سید محمد زبیر حسینی ہنسوی کو منسوب ہوئیں بیٹیوں میں ایک بیٹی حافظۂ قرآن بھی ہے۔

عزیزہ امامہ نے اپنی مذکورہ بالا صفات کے سلسلے میں اپنے والد مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ سے جو بڑے منصف اور معروف عالم دین وعامل دین ودعوت شخص تھے، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز بیعت بھی تھے، اور نیک نفسی، نرم مزاجی اور سب کے ساتھ خیر خواہی، چھوٹوں اور بڑوں کے حقوق کی ادائیگی، ان

کی سیرت میں داخل تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنے علم وعمل کی خوبی کے ذریعے اپنے وطن اور قرب وجوار میں معروف ومحبوب تھے، ان سے عزیزہ امامہ مرحومہ نے ان کی صفات کا اچھا ورثہ حاصل کیا تھا، جس کو سب تعلق والے محسوس کرتے تھے، چنانچہ اپنے بچوں بچیوں کی حسن تربیت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے شوہر عزیزی سید حسن حسنی کے ساتھ ایک بہت نرم خو، معاملہ فہم، ہمدرد اور مونس رفیقۂ حیات کی حیثیت سے وقت گزارا، اور ان کی قدردانی کی مستحق رہیں۔ سال گزشتہ ان کے ساتھ حج کے لیے بھی گئیں، اور اس کی سعادت سے مشرف ہوئیں۔

ان کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی پیدا فرمائی کہ وہ اپنے بڑوں کی فرماں بردار، چھوٹوں کے ساتھ شفیق، اعزہ اور اہل تعلق کے حقوق کا پورا خیال رکھنے والی اور غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ہمدردی کرنے والی، اور دینی رجحان اور پسند کو ترجیح دینے والی اور رائج الوقت برائیوں سے اور غیر سنجیدہ رجحانات سے پرہیز کرنے والی تھیں، اسی لیے ان کے اچانک غیر معمولی مرض میں مبتلا ہوجانے اور اسی میں انتقال کرجانے کے واقعے کو دور وقریب بہت محسوس کیا گیا، اور خاندان کے افراد اور جو بھی خاندان سے تعلق وواقفیت رکھنے والے حضرات ہیں، انھوں نے اس کو ایک خسارہ اور صدمے کی بات محسوس کی، جگہ جگہ ایصال ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا۔

خود انھوں نے ایک آسان آپریشن کے خراب ہوجانے سے جو درد وتکلیف محسوس کی، اور اس کا تسلسل دیکھا تو ان کو اپنے آخرت کے قریب آجانے کا احساس ہوگیا، اور انھوں نے مجھ سے اور اپنے تیمارداروں سے ایمان پر خاتمے کی دعا کی درخواست کی، اور تکلیف وعلالت کی حالت میں نمازوں کی وقت پر پابندی کا اہتمام کیا، اور اس میں اپنے تیمارداروں سے مدد لی۔ اللہ کا نام زبان پر جاری رہا، اس کے ساتھ دعا استغفار اور جب انہیں یقین ہوگیا کہ اب آخری لمحات میں تو خود ہی سورہ یٰسین شریف کی تلاوت بھی شروع کردی، اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے سب کو یہ امید قوی ہوئی کہ ایمان اور صلاح وتقویٰ کے

ساتھ انھوں نے آخرت کا سفر کیا، اور ان کے انتقال کے بعد ان کے بعض افراد وخاندان نے ایسے خواب بھی دیکھے جس میں کھلی بشارت تھی، اللہ تعالیٰ ان کی بھرپور مغفرت فرمائے اور اپنی رحمت خاصہ سے نوازے، آمین۔

عزیزہ مرحومہ نے اپنے نانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحبؒ کو بھی جو ایک ممتاز طبیب وعالم دین اور حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے بھائی اور مربی تھے، اچھی طرح دیکھا تھا، اور ان کی محبتیں پائی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ صاحبزادی بھی جو مرحومہ کی والدہ تھیں، بڑی خصوصیات والی اور نیک طینت خاتون تھیں، اور اپنی سنجیدگی اور دینی صلاح کے لحاظ سے خاندان میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ان کی خوبیوں کا پرتو بھی ان پر پڑا تھا۔

عزیزہ سیدہ امامہ اپنے والدین کی تنہا ایک بیٹی تھیں، اور ان کے بھائی بھی تنہا ہیں، جو ان سے عمر میں چھوٹے ہیں، مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی (مدیر ماہنامہ ''رضوان'' وناظر عام ندوۃ العلماء لکھنؤ)۔ الحمدللہ انھوں نے اور مرحومہ کے شوہر سید حسن حسنی اور صاحبزادگان نے صبر ورضا بالقضاء کے اسلامی طریقے کے مطابق اس حادثے کو برداشت کیا۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی نیکیوں کا وافر اجر عطا فرمائے، اور لغزشوں کو معاف کرے، اور پسماندگان کو اس سانحے پر صبر کا بہتر بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

مرحومہ میری بھتیجی تھیں، اور اپنے والد کے انتقال ہوجانے سے ان کا تعلق مجھ سے مزید بڑھ گیا تھا، جس کے سبب میرے لیے اور میرے بھائی مولوی سید محمد واضح سلمہ کے لئے بھی یہ سانحہ بہت رنجدہ رہا، لیکن ﴿للّٰہ ما أعطیٰ ولہ ما أخذ، وکل شیئ عندہ لأجل مسمی﴾ اللہ نے جو دیا وہ بھی اللہ کا ہے، اور جو واپس لیا وہ بھی اسی کا ہے، اور اس کے یہاں سے ہر شے کی مدت مقرر ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی نیکیوں کا اضعافاً مضاعفہ صلہ عطا فرمائے اور لغزشوں کو معاف کرے۔

مولوی سید محمد اسحاق حسینی ندویؒ

۱۱/محرم الحرام ۱۴۲۷ھ جمعہ کی شب کو خواہر زادۂ عزیز مولوی سید محمد اسحاق حسینی ندوی صاحبزادۂ عزیز مولانا سید محمد طاہر حسینی منصور پوریؒ نے ایک بہت مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں اپنے مکان پر اس جہانِ فانی سے جہانِ باقی کی طرف رحلت کی۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، للّٰہ ما أخذ ولہ وما أعطی، وکل شیٔ عندہ بأجل مسمی۔

یوں تو اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اس کو یہاں سے جانا ہے، اور علی العموم ستر (۷۰) سال سے نیچے یا اوپر اس کو اس دنیا سے رخصت ہونا پڑتا ہے، لیکن جب کوئی زندگی کی عام اور معروف مدت سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اپنے محبین اور متعلقین کو زیادہ غم زدہ بنا جاتا ہے، اور خاص طور پر جب وہ اس زندگی کے سبزہ زار کو زیادہ کارآمد بناتا رہا ہو، اور انسانیت کے دکھ درد کا مداوا کرنے کی فکر کرتا رہا ہو۔

عزیزی مولوی سید محمد اسحاق حسینی ندوی انھی افراد میں تھے جنھوں نے زندگی کی مختلف راہوں میں اپنی افادیت کے نمونے پیش کیے۔ وہ ایک طرف دینی تعلیم کے مشغلے سے جڑے ہوئے تھے، وہ مدرسہ عالیہ عرفانیہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ دوسری طرف وہ نئی نسل کی بنیادی دینی تعلیم کی تحریک سے بھی وابستہ تھے۔ تیسری طرف انسانوں میں پیام انسانیت کی تحریک کو بھی مدد پہنچا رہے تھے۔ اور چوتھی طرف وہ سماجی مسائل میں ایک ہمدرد اور مخلص رہبر کا کام بھی انجام دے رہے تھے۔

وہ ۷/ جون ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے، گھر کی اور محلّے کے مکتب کی ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی تھی، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت وفکرمندی سے اخذ فیض کیا تھا، اور ان کے پسندیدہ اصلاحی اور تعلیمی طریقۂ کار کے طرز کو اپنانے کی کوشش کی تھی، اور اس کام میں اپنے بڑوں

کے اچھے معاون رہے تھے۔ وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی بھتیجی کے بیٹے تھے (جو راقم کی ماموں زاد بہن تھیں) اور اپنے والد کے لیاقت مند صاحبزادے تھے۔ ان کے والد بھی بزرگ اور عالم دین تھے، اس طرح انھوں نے دونوں طرف سے استفادہ کیا۔

مزاج کے ٹھنڈے اور لوگوں کے دکھ درد میں شریک اور جس کام کی اہمیت کو سمجھتے اس میں دل وجان سے لگتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ایک محاذ سنبھال رکھا تھا، اور امت کی ضرورت کے لیے اپنے کو وہ خاصی حد تک مفید بنائے ہوئے تھے۔ ان سے بڑی توقعات تھیں، اور ان کی سمجھ اور سوجھ بوجھ سے بعض مشکل موقعوں پر بڑی مدد حاصل ہوتی تھی، ان کی کارکردگی اور سمجھ ہی کا نتیجہ تھا کہ تعلیم اور اصلاح اور سماجی ضرورت تینوں پہلوؤں میں ان پر اعتماد کیا جارہا تھا، اور ان کے سپرد کام کیے گئے تھے۔

کئی دینی مدرسوں کے وہ ناظم تھے، جن میں ایک شہر لکھنؤ میں واقع مدرسہ مظہر الاسلام بلوچپورہ بھی ہے۔ لکھنؤ کی دینی تعلیمی کونسل کے وہ صدر تھے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ پیام انسانیت تحریک کے مرکزی دفتر کے وہ انچارج تھے، جہاں سے مختلف زبانوں میں پیام انسانیت کے موضوع کی ضروری کتابوں کی اشاعت اور انسانی فلاح و بہبود کے عنوان کے تحت لوگوں سے ملاقاتیں، اور اس سلسلے میں جن کوششوں کی ضرورت ہوتی، ان کی فکر ان کو اپنی اس ذمہ داری کی دائرے میں کرنی ہوتی تھی۔

وہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلباء کی جمعیۃ الاصلاح کے ناظم بھی رہے تھے، اور اس سے متعلق ایک شاندار علمی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا جو ان کے دور نظامت کی خاص بات تھی۔

طبیعت بڑی مرنجاں مرنج تھی، ان کو کبھی غصہ کرتے اور جھنجلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اللہ کی مرضی پر راضی رہنے اور اس کی ذات پر بھروسا رکھنے اور اپنے بڑوں کے ساتھ ادب واحترام کے رویہ میں فرق نہیں پایا گیا۔ بعض پیچیدہ معاملات میں اپنی سمجھ سے پیچیدگی دور کرنے کی ان کی صلاحیت کو عام طور پر محسوس کیا گیا۔

ذاتی زندگی کے دینی پہلو کی طرف بھی توجہ تھی، تعلق مع اللہ کی فکر رکھتے اور اہل اللہ سے رابطہ رکھتے تھے۔ نماز وتلاوت وغیرہ کا اہتمام تھا۔ بالکل تازہ بہ تازہ سفر حج اپنی اہلیہ اور ہمشیرہ کے ساتھ کیا، اور دورانِ حج لوگوں سے ملنے اور محبین کے حق اخوت ودوستی کے ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ حج کے معاملات میں بہت دلجمعی کے ساتھ مشغولیت کا حق بھی اچھی طرح ادا کیا۔ یہ باتیں محض محبت یا تعریف میں نہیں کہی جارہی ہیں، بلکہ ان کے حج کے سلسلے میں کی جو تفصیلات سامنے آئیں ان سے یہ ماخوذ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے حسن صفات اور حسن عمل کی مقبولیت کا شاید یہ ثمرہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلانے سے متصل قبل اپنے گھر کی زیارت کے لیے بلایا اور مہمان بنایا، اور پھر مستقل طور اپنا مہمان بنالیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی وہاں کی مہمانی زیادہ سے زیادہ شاندار بنائے۔

اور جہاں تک ان کے پسماندگان کا تعلق ہے، جن میں بحیثیت ایک ماموں کے میرا نام بھی ہے، ان کے لیے اپنے پروردگار کی مرضی پر راضی رہنا اور اس کے فیصلے کو بہ صبر ورضا قبول کرلینا ہی سعادت مندی کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ سعادت مندی ہم سب کو عطا فرمائے۔ البتہ طبعی طور پر کسی ایسے کا جس سے طبیعت مانوس ہو اور اس سے فائدہ بھی ہو رہا ہو، رخصت ہونا صدمے کا باعث ہوتا ہے، اور خسارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی بدل عطا فرمائے جو ایسے جانے والوں سے ہوتی ہے۔

مسلمان کی فلاح اسی میں ہے کہ جتنی بھی زندگی اس کو ملی ہو اس کو کارآمد بنا کر پورا کرے، اور اس کا جانا خلا اور خسارہ سمجھا جائے۔ اس زندگی میں جو بھی آتا ہے وہ خود سے نہیں آتا، اس کو بھیجا جاتا ہے، اور جتنے کام کے لیے اور جتنی مدت کے لیے بھیجا جاتا ہے اس کی سعادت مندی ہوتی ہے کہ اتنی مدت میں اپنا مفوضہ کام انجام دے۔ کامیاب اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو زندگی کو مفید کاموں میں صرف کرکے اپنے اس قیام دنیا کو پورا کرتے ہیں، اور زندگی کے لمحات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، اور کچھ کرتے جاتے ہیں۔

عزیزی مولوی سید محمد اسحاق حسینی مرحوم نے بھی اپنی زندگی کو مفید طریقے سے

گزارا۔ ان کی بڑی خوبی یہ رہی کہ ملنساری اور خوش اخلاقی کے ساتھ اصلاحِ عمل اور افادیت کو اختیار کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی، اور اسی طرز کو اپنائے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، لیکن اس طرح کہ جیسے بھری محفل سے کوئی اٹھ کر چلا جائے۔ ان کے ساتھ ہوا بھی ایسا ہی کہ ایک دینی اجتماع کو خطاب کر کے گھر آئے ہی تھے کہ انتقال کر گئے۔ جس نے بھی ان کے انتقال کو سنا صرف اظہارِ رنج ہی نہیں کیا بلکہ ان کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا، اور اپنا تعلق بھی بتایا۔

ایک عربی شاعر کا شعر ہے جو اس نے اپنے ایک محبوب اور مفید شخصیت کے انتقال پر کہا تھا:

فاذهب كما ذهب غوادي مزنة أثنى عليه السهل والأوعار

(تو جا جیسے کہ (خشک زمین) پر سے صبح صبح بادل برس کر گیا ہو کہ جس کی تعریف زمین کے ہر خطے نے کی ہو، چاہے وہ نرم زمین ہو، چاہے سخت زمین ہو۔)

عزیزی مولوی سید محمد اسحاق مرحوم نے زندگی کی صرف ۴۶ بہاریں دیکھیں، امید تو یہ تھی کہ کم از کم پندرہ بیس سال اور اپنے متعلقہ کاموں کو جاری رکھ سکیں گے، لیکن قدرت کا جو فیصلہ ہے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے، اور شاید اسی میں نفع بھی ہے۔ ان کو اس میں اپنے عظیم ماموں سید محمد الحسنی مرحوم سے مناسبت رہی، جنھوں نے ایسی ہی مختصر سی چند گھنٹوں کی علالت کے بعد ۴۴ سال کی عمر میں انتقال کیا تھا۔

عزیز مرحوم کا سانحۂ وفات ایک اہم دینی جلسے میں شرکت کے بعد پیش آیا، وہ شہدائے اسلام کے ایک جلسے میں تقریر کے لیے احاطۂ شوکت علی گئے تھے، جہاں وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام و مرتبہ، ان کی عظمت اور ان کے اسوہ کی اہمیت پر تقریر کر کے آئے تھے، دورانِ تقریر ہی ان کو سینہ میں درد محسوس ہوا، جس کی وجہ سے وہ تقریر زیادہ دیر جاری نہ رکھ سکے، گھر آنے میں تکلیف میں اور شدت پیدا ہوئی، ڈاکٹروں سے رابطہ قائم کیا جاتا کہ تھوڑی دیر ہی میں ان کی روح پرواز کر گئی۔

ہم لوگ سہارنپور میں تھے، صبح سویرے رائے بریلی کے لیے روانہ ہوئے، جہاں ان کی تدفین ہونی تھی، عین وقت پر کہ زیادہ دیر انتظار بھی نہیں دیکھنا پڑا کہ ہم لوگ پہنچ گئے اور جنازے میں شرکت ہوگئی، ورنہ اس محرومی کا ملال رہتا۔ اپنے والد ماجد مولانا سید محمد طاہر صاحب کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ معلوم ہوا کہ ان کے جنازے میں لکھنؤ ورائے بریلی دونوں جگہ کے اہل تعلق کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی، یہ ان کی محبوبیت ومقبولیت کی ایک علامت تھی۔ اللہ ان کو بیش از بیش مغفرت ورحمت سے نوازے، اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور پسماندگان کو صبر ورضا بالقضا عطا کرے، آمین۔

سید حسین حسنی ندویؒ

حسنی خاندان کو جس کا تعلق تکیہ کلاں رائے بریلی سے ہے، گزشتہ دو تین سال کی مدت میں اپنے کئی اہم فرزندوں کی وفات سے سابقہ پڑا، خاص طور پر ایسے افراد کہ جو خاندان میں بڑی قدر و محبت سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی عمریں بھی کچھ زیادہ نہیں ہوئی تھیں، ان کے انتقال کو زیادہ محسوس کیا گیا۔ ان میں ابھی قریبی مدت میں عزیزی سید حسین حسنی کی شخصیت تھی، وہ علم دین کے ساتھ جدید تعلیم سے بھی آراستہ تھے، اور اپنی اسی صلاحیت کی بنا پر دہلی کے سعودی سفارت خانے میں ایک مدت تک ملازمت میں رہے تھے، وہ اپنے وطن ہی میں نہیں بلکہ دہلی میں بھی اپنے جاننے والوں اور ملنے جلنے والوں میں مقبولیت رکھتے تھے، اور دین کے کاموں سے بھی ربط رکھتے تھے، وہ بغیر کسی خاص بیماری کے اچانک اور وقتی علالت کے موقع پر نئی دہلی میں انتقال کر گئے، ان کے انتقال کی خبر کو ان کی علالت کی خبر کے ساتھ سنا گیا، اور بڑا صدمہ محسوس کیا گیا۔

انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت کی سطح تک تعلیم حاصل کی تھی، اور اس کے بعد جدید تعلیم میں ڈگری حاصل کی، ان کا تعلیمی زمانہ لکھنؤ میں گزرا تھا، اور ملازمت کا زمانہ دہلی میں گزرا۔ انھوں نے اوکھلا میں مکان بھی تعمیر کرالیا تھا، جو ان کے اعزہ اور تعلق والوں کی قیام گاہ بھی بنتا تھا، اور وہ بہت تعلق خاطر کے ساتھ سب کی خاطر کرتے تھے۔ میں ایک عرصے سے اپنے دہلی کے سفر میں انھی کا مہمان بنتا تھا، اور ملّی مقصد کے سلسلے میں کسی ادارے کی دعوت پر جاتا تو بھی وہ اس ادارے کا مہمان بننے نہ دیتے بلکہ اپنا ہی مہمان بناتے، اور مزید ملنے کے لیے آنے والوں کی بھی خاطر کرتے۔ وہ میرے قریبی بھتیجے تھے، میرے پھوپھی زاد بھائی کے بیٹے تھے، اس رشتے میں ان کے اخلاق نے تعلق کی خصوصیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

وہ ابھی ساٹھ سال کی عمر کو نہیں پہنچے تھے، توقع تھی کہ ابھی ان کو نیک مقاصد کے لیے کام کرنے کا مزید موقع ملے گا، اور ان سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا، لیکن مقدرات ضروری نہیں کہ عام توقع کے مطابق ہوں، انھوں نے اسی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور اپنے پیچھے اہلیہ اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں، جن میں دو رشتۂ زوجیت میں منسلک ہو چکی ہیں، اور ایک کو منسلک کرنے کی تیاری تھی کہ ان کا دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ دوشنبہ کا مبارک دن اور ماہ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ کی پندرہویں تاریخ تھی، اپنے آبائی قبرستان تکیہ کلاں رائے بریلی میں مدفون ہوئے، ۵۹ سال عمر تھی۔ رحمة الله تعالیٰ رحمة واسعة وغفر له مغفرة تامة۔

اللہ تعالیٰ ان کی بیوہ کو جو رشتے میں میری بھانجی بھی ہوتی ہیں، اور ان کی صاحبزادیوں کو اپنے فضل وکرم اور خیر وعافیت کے ساتھ رکھے۔ مرحوم کی والدہ جو میری ماموں زاد بہت تھیں، چودہ سال پہلے انتقال کر چکی تھیں، البتہ ان کے والد صاحب الحاج سید محمد مسلم حسنیؒ کو اپنے بڑھاپے میں اپنے ان عزیز فرزند جن سے وہ بڑے مانوس تھے، کی جدائی کے غم سے سابقہ پڑا، اور انھوں نے بڑے صبر ورضا بالقضاء کے جذبے کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت اور مزید درازی عمر سے نوازے اور ان کے اس عمل کو قبول فرمائے۔

مرحوم سید حسین حسنی رحمہ اللہ نے ۱۲ سال پہلے فریضۂ حج بھی ادا کیا تھا، اور اپنے ساتھ اپنے والد صاحب کو بھی حج کرایا تھا، اور وہاں کی برکتیں حاصل کی تھیں۔ اپنے والد ماجد کی اس موقع پر رفاقت اور خدمت کا حق ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ تقبله الله وغفر له ورفع درجاته، آمین۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور تین بیٹیاں ہیں بڑی بیٹی مولوی مسعود حسن حسنی ندوی سلمہ کو منسوب ہے اور دوسری الہ آباد میں سید محمد میاں (نواسۂ ڈاکٹر طفیل احمد مدنی مرحوم) اور تیسری بیٹی تکیہ رائے بریلی میں سید احمد مدنی پسر برادر عزیز سید مصباح النبی حسنی کو منسوب ہوئیں۔

مولوی سید محمد عامر ہنسوی ندویؒ

جون ۲۰۰۸ء کی ۱۹/ تاریخ کو فتحپور ہنسوہ میں مقیم حسینی سادات کی معروف شخصیت مولوی سید محمد عامر ہنسوی ندوی ابن سید احمد ندوی مرحوم کا قلبی دورہ کے نتیجے میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ ہمارے عزیز قریب اور ہماری اہلیہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ انھوں نے تعلیم کا زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں گزارا تھا، اس طرح ان سے ہمارا قریبی ربط بھی رہا تھا۔ ندوے سے جانے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہتی تھی، وہ خوش اخلاق، اہل تعلق سے بے تکلف اور مانوس صفت کے حامل شخص تھے۔ صحت بھی عموماً اچھی تھی، اور عمر بڑھنے پر بھی صحت کی کوئی قابل ذکر شکایت نہ تھی۔ ان کے انتقال کی اچانک خبر معلوم ہوئی، اس وقت میں جنوبی ہندوستان کے ایک طویل سفر سے بمبئی ہوتے ہوئے واپس ہو رہا تھا، وطن پہنچنے سے پہلے ہی ٹرین پر خبر ملی کہ وہ نہیں رہے، میں خبر سنتے ہی فتحپور ہنسوہ گیا، وہاں جنازے اور تدفین میں شرکت کی، اور پسماندگان سے تعزیت کی۔ خاندان کی دونوں شاخوں تکیہ رائے بریلی اور فتحپور ہنسوہ میں اس کا بڑا اثر لیا گیا اور رنج محسوس کیا گیا۔

مولوی سید محمد عامر حسینی ندویؒ نے ندوے کی تعلیم کے بعد زمانے میں نمایاں طور وطریق سے وقت گزارا تھا، اور اپنے رفقاء سے اچھا ربط رکھا تھا، اس کا احساس ان کے رفقاء کے دلوں میں بھی برابر قائم تھا۔ ہنسوہ فتحپور کے زمیندار خاندان کے فرد ہونے کی وجہ سے ان کو معاشی فکر کی کوئی زیادہ ضرورت نہیں تھی، لیکن ان کو ایک سرکاری ادارے میں ملازمت مل گئی تھی، جس کی بنا پر انھوں نے فتحپور کے شہری محلّے میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ قصبہ ہنسوہ وہاں سے ۱۰-۱۲ کلومیٹر فاصلے پر ہے، شہر کے محلّے میں انھوں نے اپنی رہائش گاہ بھی تعمیر کرالی، اپنے دفتر کے کاموں کے ساتھ ساتھ عالم دین ہونے کی بھی اپنی ذمہ داری کو انجام دیتے

رہے۔ دفتر اور گھر کی مسجدوں میں امامت بھی کرتے، اور دینی رہنمائی کے لحاظ سے تعاون کرتے۔ ان کا پڑھے لکھے لوگوں پر اچھا اثر تھا، اس طریقے سے وہ وہاں کی دینی ضرورت بھی تھے۔ طبیعت میں بڑی خوش اخلاقی اور خوش طبعی تھی، جس کی بنا پر ان کا ربط وضبط لوگوں سے اچھا تھا، اس لیے ان کے انتقال سے رنج فتحپور شہر میں بھی بہت محسوس کیا گیا۔

ان کی بستی ہنسوہ میں ان کے خاندان کے ایک بڑے بزرگ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب کے نام سے تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا گیا تھا، جس میں ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اور عمارت بھی بن چکی ہے، اور طلبہ کی ایک معقول تعداد زیر تعلیم ہے، اس مدرسے کی سرپرستی بھی انھی کے ذمہ کی گئی تھی۔

اس مدرسے کے قیام میں اصلاً عزیزی مولوی سید سلمان حسینی ندوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء کا حصہ رہا، جو ان کے رشتے کے بھانجے بھی ہوتے ہیں۔ اس مدرسے کو رائے بریلی میدان پور میں قائم ضیاء العلوم کا تعاون بھی حاصل تھا، جس کی بنا پر اس نئے قائم شدہ مدرسے کو خاصی تقویت حاصل ہوئی، لیکن مولوی محمد عامر ندوی کے وہیں مدرسے کے قریب رہنے کی وجہ سے ان کی قریبی سرپرستی حاصل تھی۔

مولوی عامر حسینی نے اپنے صاحبزادوں کو بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم دلائی، جنھوں نے ندوے سے فارغ ہوکر دوسری جگہوں پر بھی تعلیم کو آگے بڑھایا، چنانچہ بڑے بیٹے مولوی حافظ سید محمد عرفان ندوی نے ندوے سے تخصص فی الادب کرکے مراکش میں جاکر تین چار سال گزارے، اور اب وہ جدہ کے ایک ادارے سے وابستہ ہیں۔ دوسرے بیٹے مولوی حافظ محمد سہیل نے ندوے سے فارغ ہوکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔

تیسرے بیٹے عزیزی فضیل احمد نے عصری تعلیم حاصل کی اور دمام میں ملازمت ملی۔ اس طرح سے انھوں نے علم کے جس راستے پر ان کو ان کے والد نے چلایا تھا، اسی پر اپنی اولاد کو بھی چلایا، اور تعلیمی صلاحیت میں دینی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا، جو ان کے

دینی وعلمی دونوں حیثیتوں سے ان کے جامع تصور اور کھلے ذہن کی علامت تھی ان تین بیٹوں کے علاوہ دو صاحبزادیاں ہیں ایک عزیزی طارق فریدی کو اور دوسری سید فرید احمد (علی گڈھ) کو منسوب ہوئی۔

مولوی عامر ندوی نے چونکہ فراغت کے بعد تعلیمی لائن کے حلقوں میں ان کا وسیع تعارف نہیں ہوا، لیکن ندوہ اور اس سے متعلق مدارس کے حلقے میں اور خود ان کے رفقائے تعلیم میں ان کو اچھا تعارف حاصل تھا، اور ان کے جانے سے سب کو رنج ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بیش از بیش مغفرت فرمائے اور ان کی کمزوریوں کو معاف فرمائے۔

مولوی سید محمد سالم ہنسویؒ

مولوی سید محمد عامر ہنسوی کے سانحۂ وفات کو زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ ان کے چچازاد بھائی اور ہم زلف مولوی سید محمد سالمؒ نے بھی داغ مفارقت دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ للّٰہ ماأخذ ولہ ما اعطیٰ وکل شیئی عندہ باأجل مسمیٰ۔

دونوں عزیزوں کی شادی تکیہ رائے بریلی میں حضرت شاہ ضیاء النبی حسنی کے خاندان میں ان کے پوتے عم معظم سید سراج النبی حسنی مرحوم کی بیٹیوں سے ہوئی، دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھے۔ یہ دوسرا سانحۂ وفات رائے بریلی میں تکیہ پر ۱۲/ اگست ۲۰۰۸ء کو پیش آیا، ہم اس وقت بنگلور میں تھے، ان کی علالت کی خبر سن کر تشویش تھی، لیکن یہ نہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنی جلدی رخصت ہوجائیں گے۔ دینی وتعلیمی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے، ہنسوہ کے مدرسے کے قیام اور رائے بریلی کے مدرسے کے قیام میں بھی ان کی دلچسپی رہی۔ سنین ولادت ووفات اور علم الانساب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اپنے زمانے کے سبھی مشہور بزرگوں کی خدمت میں جانے کا شوق رہا، اور ان سے استفادہ کیا، اور کوشش رکھی کہ ان سے حاصل کردہ فیض کی روشنی میں دینی تعلیم واصلاح کے کام کو تقویت پہنچانے میں ان کے اختیار میں جو ہو اس کو انجام دیں، اس سلسلے میں دینی کام کرنے والوں سے ربط رکھتے اور دلچسپی لیتے۔ چنانچہ ندوۃ العلماء کے رسالوں البعث الاسلامی اور تعمیر حیات وغیرہ کے خریدار بنانے اور ندوہ کے کاموں کے تعارف کے لئے انہوں نے اطراف اور قریبی اضلاع کے سفر بھی کئے اس طرح اور بھی دوسرے نیک کاموں میں حصہ لینے کی کوشش کی

اور باجماعت نماز کے بڑے پابند تھے، اور مختلف دینی خوبیوں کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کو قبول فرمائے اور انہیں اجر جزیل عطا فرمائے اور عفو ودرگذر کا معاملہ فرمائے۔ آمین

انہوں نے اپنے سبھی لڑکوں کو دینی تعلیم کے حصول میں لگایا، چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں، جن میں سے تین نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی، ان میں مولوی حافظ ابوالقاسم اور مولوی محمد ظاہر جدہ (سعودیہ) رہ کر تعلیمی مشغلے میں مصروف ہیں، اور مولوی عبدالسلام حارث لکھنؤ میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی سوسائٹی کے ذمہ دار ہیں، اور سید محمد یاسر ہیں بیٹیوں میں بڑی بیٹی ان کی اہلیہ کے بھانجے سید محمد سعد حسنی کو اور چھوٹی بیٹی علی گڈھ میں مولوی سید اسامہ ریحان کو منسوب ہوئیں۔ اللہ مرحوم کے لیے ان سب کو صدقۂ جاریہ بنائے۔